قرآن اور انسان

فلسفۂ صلوٰۃ

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

نام و پتہ: - ابراہیم جان

۲۹۶/12 روور روڈ۔ جونا مارکیٹ۔

کراچی

قرآن اور انسان

فلسفۂ صلوٰۃ

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ

فیروز سنز لمیٹڈ (پرائیویٹ)

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

اِنتساب

صالحہ و طیّبہ بیٹی

ثمر رؤف

کے نام

فہرست

فصل اوّل

صلوٰۃ کی حقیقت، اہمیت اور غایت

فصلِ دوم

صلوٰۃ کی افادی اور جمالیاتی اقدار

فصل سوم

صلوٰۃ کے تقاضے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

دیباچہ

صلوٰۃ کی حقیقت کیا ہے؟ صلوٰۃِ پنجگانہ کی فرضیت میں حکمت کیا ہے؟ کیا صلوٰۃ بارِ گراں اور بیگار ہے یا اس سے قُرَّۃُ العین اور جالیاتی ثروت ملتی ہے؟ کیا صلوٰۃ واقعی احسان کے مدارجِ اعلیٰ مشہودیّت اور شاہدیّت پر فائز ہونے کا ذریعہ اور کلیدِ جنّت ہے؟ کیا اس سے قلب زندہ و فعّال اور حسین و منیر بنتا ہے؟ کیا صلوٰۃ سے نورِ باطنی یا حسّی قلبی نفسی نور کی تدریجی ترقّی و تکمیل ہوتی ہے، جسے جالیاتی اِرتقاء سے تعبیر کرسکتے ہیں؟ کیا جالیاتی اِرتقاء عبارت ہے ترفّعِ درجات سے؟ کیا صلوٰۃ واقعی انسان کے معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا صاحبِ اقتدارِ اعلیٰ) اور ربّ (= خالق و رازق، نشو و ارتقاء کرنے والے آقا و مالک) کے قُرب و رِضوان اور دید و حضوری کا احسن و اکمل ذریعہ ہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر صلوٰۃ اکثر مصلّین یا نمازیوں کے لیے ایسا ذریعہ کیوں نہیں بنتی؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ایسے نمازی صلوٰۃ کی حقیقت یعنی اس کے فوائد و ثمرات اور فیوض و برکات، نیز اس کے تقاضوں کا علم نہیں رکھتے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سچا نمازی بننے اور صلوٰۃ سے کما حقہٗ مستفید ہونے کے لیے اس کے حقائق و فرائض، نیز حقوق اور تقاضوں کا علم لازمی ہے؟ بالفاظِ دیگر، کیا علم صلوٰۃ کی بیّن شرط نہیں ہے؟

یہ سوالات ہی اصل میں یہ کتاب تصنیف کرنے کے محرّکات ہیں، جن کے اطمینان بخش جواب دینے کی مخلصانہ فکری و تحقیقی کاوشوں کا حاصل یہ تصنیف ہے۔ چونکہ فلسفے کا مطلب حق و صداقت کی طلب و جستجو ہے اور اس کتاب میں صلوٰۃ کی حقیقت کے ادراک کی کوشش کی گئی ہے، لہٰذا اسے فلسفۂ صلوٰۃ سے موسوم کیا گیا ہے۔

صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ انسان کا اپنے ربِّ عظیم و کبیر اور الٰہِ جمیل و جلیل کے حضور اپنی عبودیّت اور اس کے ذکر کا ایسا اظہارِ کامل ہے، جو اس کی نظر میں غایت درجہ حسین اور اسی قدر اُسے پسند ہے۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ عبادت کی احسن و اکمل شکل ہے۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حضور انسان کا تذلّل و تضرّع جتنا زیادہ ہو، اتنا ہی وہ اس کے ترفّعِ درجات کا ذریعہ بنتا ہے۔ عبودیّت، تذلّل و تضرّع کے ساتھ اپنی معراج پر ہو تو اسے معراجِ انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے تذلّل و تضرّع غیراللہ کے سامنے ہو تو انسان کو اسفلِ سافلین بنا دیتا ہے۔ انسان کو اسفلِ سافلین بننے سے بچانے اور اُسے انسانیت کے بلند ترین مقام احسان پر متمکن کرنے کا بہترین ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ربِّ رحمٰن نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں پر صلوٰۃِ پنجگانہ فرض کی ہے اور اس کے قیام کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

شخصیتِ انسانی کی تکمیل و تحسین صبغۃ اللہ یا رنگِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان کے حسّی، قلبی، نفسی نظام میں اس کی وسعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ زندہ و حرکی، مُحکم و توانا اور حسین و منیر بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا نور بتدریج ترقی کرنے لگتا ہے، جسے جالیاتی ارتقاء سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو رنگِ الٰہی سے مزیّن کرنے اور اپنا جالیاتی ارتقاء کرنے کا بہترین ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایک طرف انسان میں توحیدِ اُلوہیّت و ربوبیّت کا ایقان و اذعان اور دوسری طرف عرفانِ نفس پیدا کرتی ہے۔ انسان کو اپنے الٰہ و ربّ کی صفاتِ حسنہ اور اپنے نفس کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ اس کا بندہ بن جاتا ہے اور اس کے بندے کی پہچان یہ ہے کہ وہ مُومن و موحّد، متّقی و صالح اور شہید و صدّیق ہوتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کافر و مشرک، بت پرست و ظالم، مجرم و گناہگار ہو سکتا ہے نہ فرعون و ہامان اور قارون و آزر ہی بن سکتا ہے۔ وہ اپنے ہم نفسوں اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت تو بن سکتا ہے، لیکن معاشرتی سرطان نہیں بن سکتا۔ وہ صلوٰۃ کے فیوض و برکات سے

نفسِ مطمئنہ اور صاحبِ حسن و سرور تو بن سکتا ہے، لیکن سمندر سرشت و اہلِ نار نہیں بن سکتا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور دست بستہ کھڑا ہونے، اس کے سامنے جھکنے اور سربسجود ہونے کے بعد بندۂ رحمٰن نہ تو کسی فرعون، ہامان، قارون یا آزر کے سامنے سرنگوں ہو سکتا ہے نہ سربسجود۔ اگر اس کے پاس حکومت و اقتدار اور مال و دولت ہو تو وہ خود بھی معاشرتی سرطان نہیں بن سکتا۔ شعورِ عبدیت اُسے ایسا بننے سے مانع آتا ہے اور یہ شعور اقامتِ صلوٰۃ سے پیدا ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ صلوٰۃ میں بندہ اپنے اس عہد و میثاق کی تجدید و توثیق کرتا رہتا ہے کہ "یا اللہ! تُو میرا اِلٰہ ہے! میرا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود تُو اور صرف تُو ہے۔ میرا معروضِ حسن و عشق بھی تُو اور آخری تمنا بھی تُو ہے؛ نیز تُو اور صرف تُو میرا ربّ، یعنی میرا نشوو ارتقا کرنے والا، میرا ہادی و والی، حاکم و مالک، وکیل و نصیر اور حاجت روا و مستجیب الدّعوات ہے۔ بالفاظِ دیگر، تیرے سوا میرا کوئی اِلٰہ و ربّ نہیں"۔ اس طرح صلوٰۃ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ کرتی اور اس کی محبت کی شمع فروزاں رکھتی اور اس کی روشنی کو تیز کرتی رہتی ہے۔ نورِ محبت میں تب و تابِ جاودانی اور اس میں جالیاتی ثروت ہوتی ہے، جو بھلائے جنّت ہے۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں صلوٰۃ کو کلیدِ جنّت کہتے ہیں۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ صلوٰۃ دین کا ستون یا اساس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صلوٰۃ نہ رہے تو دین بے بنیاد ہو جاتا ہے؛ لہٰذا دین کی عمارت کو استوار رکھنے اور گرنے سے محفوظ رکھنے کی خاطر نظامِ صلوٰۃ کا قیام ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ ہر زمان و مکان میں ہر قوم پر فرض رہی ہے۔ دین چونکہ کُل زندگی کو محیط ہے، لہٰذا صلوٰۃ ہر شعبۂ زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے فیوض و برکات اور فوائد و حسنات دُنیا اور آخرت کے لحاظ سے بے قیاس ہیں، لیکن اس کے حقوق یا تقاضے بھی متعدد ہیں، جن کو پورا کیے بغیر صلوٰۃ بے اثر رہتی ہے۔

زندگی ہر حیثیت میں اپنے معروضِ حُسن و عشق کے وصال کی خاطر خوب سے خوب تر کی

طلب و جستجو میں رہتی ہے اور صلوٰۃ اس کے وصال یعنی قرب و رضوان اور دید و حضوری کا بہترین ذریعہ ہے۔ وصالِ "دوست" سے اہلِ آرزو کو حُسنِ حیاتِ جاوید، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور حُسن المآب ملتا ہے، اور وہ لذّتِ زندگی سے آشنا ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اہلِ ہوس حکومت و اقتدار، مال و دولت، قوّت و صولت، خدم و حشم، شہرت و نمود، عیش و عشرت، ناؤ نوش، لذّتِ جنس و بیخودیِ نشہ یا لہو و لعب وغیرہ وغیرہ سے لذّتِ زندگی سے کبھی آشنا ہوئے ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔

صلوٰۃ انفرادی۔ اجتماعی عبادت ہے اور عبادت کی احسن و اکمل صورت ہے۔ اس کا ہماری معاشرتی زندگی سے گہرا تعلّق ہے، اقامتِ صلوٰۃ مسلمان کی اور مسجد مُسلم معاشرے کی پہچان ہے، لیکن اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جس میں نظامِ صلوٰۃ قرآن و سُنّہ کے مطابق قائم ہوگا، مساجد کی بنیاد "تقویٰ" پر استوار ہوگی، فرقہ پرستی پر نہیں؛ نیز اہلِ ایمان سچے مُصلّین یا نمازی اور اقامتِ صلوٰۃ کے پابند، اس کے حقوق اور تقاضوں سے آگاہ اور ان کو پورا کرنے والے ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی معاشرے ہی میں صلوٰۃ اپنا اثر رکھتی ہے اور اُسے علم و حکمت، عرفانِ الٰہی و معرفتِ نفس، اخوّت و محبّت، آزادی و مساوات، طمانیت و حسنہ، حُسنِ زندگی و خوشحالی، قوّت و سطوت، عدل و احسان، ایثار و قربانی، مادّی و جمالیاتی ارتقاء اور امن و سلامتی کی جنّت بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

صلوٰۃ کے بنیادی تقاضوں میں ایک تو نظامِ زکوٰۃ کا قیام ہے اور دوسرا قرآنِ مجید کی ہر گوشۂ زندگی میں عملداری اور حاکمیتِ اعلیٰ کو عملاً تسلیم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر، اسلامی معاشرے میں کفالتِ اجتماعی کا نظام جاری و ساری ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رعایا کو کسی تفریق و امتیاز کے بغیر انسانی و شہری حقوق حاصل ہونگے، اس کے نتیجے میں حکومت ان کی تعلیم و تربیت، روزگار، نان نفقہ، علاج معالجے، صحت و صفائی اور مکان و پردہ داری (PRIVACY)، جان و مال اور عزّت و ناموس وغیرہ وغیرہ کی ضامن ہوگی۔ عدل کا نظام قرآنِ مجید کے احکام و آئین پر، اور نظامِ تعلیم

نصابِ قرآن پر استوار ہو گا۔ معاشی نظام کی اساس حُسنِ سعی و اکتساب اور عدل و احسان کے قرآنی اصولوں پر قائم ہو گی اور اس میں ربٰوا یا سود کا فقدان ہو گا؛ لہٰذا اس میں نہ تو جاگیرداری و زمینداری، سرمایہ داری و سرمایہ کاری، نیز سودی بینکاری کے نظام ہوں گے اور نہ اس میں کسی کو بٹائی، کرایہ، پگڑی اور تجارتی شہرت (GOOD WILL) لینے کی اجازت ہی ہو گی۔ اسلامی معاشرے کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا آئین لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں سرطانی یعنی فرعونی، ہامانی، قارونی یا آذری اداروں کا فقدان ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے، اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ اس کی مثبت خوبیوں میں توحید و تقوٰی، حیا و تکریم انسانی، عدل و احسان اور اجتہاد و جہاد، حُسنِ خُلق و حُسنِ کردار سرِ فہرست ہیں، جبکہ اس کی منفی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شرک و بُت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں)، ظلم و استحصال، فحشاء و منکر اور جہالت و ناخواندگی کا فقدان ہوتا ہے۔

الغرض، صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام دین کی چار بنیادیں ہیں اور ان نظاموں کو قائم کرنا اور احسن طریق سے چلانا، اسلامی حکومت کی بنیادی ذمّے داری ہے اور یہی اس کی پہچان بھی ہے۔

(ڈاکٹر) نصیر احمد ناصر

۱۴۔ جی، گلبرگ ۳، لاہور ۱۱۔

۱۲۔ رمضان المبارک ۱۴۰۶ ہجری / ۲۲۔ مئی ۱۹۸۶ء

فصل اوّل

صلوٰۃ کی حقیقت، اہمیّت اور غایت

علم صلوٰۃ کی پیش شرط

اہلِ علم و دانش کے سوا کم لوگ اس اصلِ عظیم کا علم رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا اور غایت الغایات کیا ہے؟ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ انہیں یہاں کیا کرنا اور کس طرح زندگی بسر کرنا ہے؟ زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ جب ہر متنفّس نے لذّتِ موت سے آشنا ہونا ہے تو پھر انسان فانی ہوا؟ اگر انسان فانی ہوا تو پھر حیات و کائنات عبث و بے معنی ہوئی۔ بعض طبائع یہ سوچتی ہیں کہ عبادت اور خاص کر صلوٰۃ کی حقیقت و اہمیّت کیا ہے؟ اور انسان عبادت کرنے کا کیوں شرعاً مکلّف ہے؟ کیا عبادت، خصوصاً صلوٰۃِ پنجگانہ انسان پر بارِ گراں نہیں؟ کیا اس کے لیے بیگار و مشقّت نہیں؟ اگر ہے تو پھر اس کی فرضیت کا جواز کیا ہے؟ کیا دین کی قیوّد انسان کی آزادی کے لیے سلب و نہبّ کا حکم نہیں رکھتیں؟ اگر رکھتی ہیں تو پھر دین حریفِ آزادی ہوا، لہٰذا ناقابلِ قبول ہوا۔ کیا انسان کو واقعی ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب کیونکر ہوا؟ اگر اُسے آزادی حاصل ہے تو پھر اس کی خواہشیں پوری کیوں نہیں ہوتیں؟ نیز اس

کے فکر و عمل پر قدغن کیوں لگائی جاتی ہے؟ مرنے کے بعد انسان کہاں چلا جاتا ہے؟ کیا وہ پھر دُنیا میں آتا ہے یا پھر وہیں رہ جاتا ہے؟ کیا اس کا حشر ہو گا؟ کیا اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا؟ حیات بعد الممات، جنّت اور جہنّم کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہاں انسان کی شکل و صورت اور پیکر ایسا ہو گا جیسا دُنیا میں ہے یا اس سے مختلف ہو گا؟

کچھ طبائع یہ سوچتی ہیں کہ انسان کا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اور کائنات سے رشتہ کیا ہے؟ ایمان و کفر، توحید و شرک، ہدایت و ضلالت، حسنہ و سیئہ یا خیر و شر، حُسن و قبح اور گناہ و ثواب میں کیا فرق ہے؟ اگر ہے تو اُسے کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے؟ معرفتِ نفس و اللہ کا مطلب کیا ہے؟ اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ صلوٰۃ میں اگر فوائد ہیں تو کیا ہیں اور ان کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کہتے ہیں صلوٰۃ معراجِ انسانی، قُرّۃ العین اور کلیدِ جنّت ہے۔ اگر ہے تو کیسے اور کیونکر ہے اور کن کے لیے ہے؟

متذکرہ بالا سوالات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ علم کے بغیر انسان نہ تو اپنی زندگی اور نہ کائنات کی تخلیق کی مقصدیت، نہ اپنے اور اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کے رشتے کی نوعیت اور نہ عبادت کی غایت ہی سمجھ سکتا ہے۔ صلوٰۃ عبادت کی اکمل و احسن شکل ہے، اس لیے اس کی غیر معمولی افادیت، اہمیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے علم ناگزیر پیش شرط ہے۔ علاوہ ازیں، ان تمام سوالوں کا جواب علم ہی کے ذریعے معلوم کیا یا دیا جا سکتا ہے۔ جب تک ہمیں اس حقیقت کا علم الیقین نہ ہو کہ ہمارا خالق، ربّ اور اِلٰہ صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے اور وہ الحُسن والحق، الحیّ و القیّوم، رحمٰن و رحیم، وہّاب و کریم اور مستجیب الدّعوات ہے، اور اُس نے ہمیں صرف اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا (الذّاریات ۵۱: ۵۶)، ہم اس کی عبادت نہیں کر سکتے جس طرح عبادت کرنے کا حق ہے، اور نہ اس کی قدر پہچان ہی سکتے ہیں جس طرح پہچاننے کا حق ہے (الانعام ۶: ۹۱)۔

دوسرے، علم الیقین کے بغیر ہم عبادت، خصوصاً صلوٰۃِ پنجگانہ کے فیوض و برکات اور مادّی و باطنی، نیز دُنیوی و اُخروی فوائد و حسنات حاصل نہیں کر سکتے، جن کے حصول کے لیے ربِّ رحمٰن نے

محض اپنے فضل و کرم سے جملہ بنی نوعِ انسان پر ہمیشہ سے صلوٰۃ فرض کر رکھی ہے۔ اس اصل کو سمجھنے کے لیے ذرّے یا ایٹم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب تک اس میں مضمر رشکِ آفتاب جوہری نور و توانائی کے خزینے کا علم نہ تھا، اسے حقیر و ناچیز سمجھا جاتا تھا، لیکن جن قوموں نے علم کے ذریعے ذرّے میں ودیعت قیامت خیز قوّتوں کا سراغ لگا لیا، انہوں نے زمان و مکان کو مسخّر کر لیا اور کر رہی ہیں، اور اعلیٰ ترین قوّتیں (SUPER POWERS) بن کر اقوامِ عالم کی قیادت کر رہی ہیں۔ یہ مثال صلوٰۃ پر بھی صادق آتی ہے، کیونکہ اس میں بھی نور و توانائی کا خزینہ پوشیدہ ہے، جسے علم و تجربے کے ذریعے دریافت کیا اور اس سے کما حقہٗ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ ایمان علم ہی کے ذریعے صلوٰۃ کے نور و توانائی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور سے وہ اس نور و توانائی کی بدولت اپنے اندر محبتِ الٰہی کی شمع روشن کر سکتے اور اپنے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نور کا اِتمام یا اپنا جالیاتی اِرتقاء کر کے اپنی شخصیت کو کامل و ناقابلِ تسخیر بنا سکتے ہیں۔ ایسا شخص مردِ کامل، مثالی انسان اور صاحبِ حُسن و سرور ہوتا ہے، جس کے لیے قرآنِ حکیم نے نفسِ مطمئنّہ، بندۂ رحمٰن، عبدہٗ، ولی اللہ، صالح، شہید، صدّیق، اہلِ جنّت ایسی متعدّد تعبیریں اختیار کی ہیں۔

علم و عبادت کے تعلّق کی نوعیت معلوم کرنے کی خاطر ہم پہلے علم اور پھر عبادت کی معنویت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: "علم کسی چیز کا اس کی حقیقت کے ساتھ ادراک ہے (اس کا مطلب کسی چیز اور اس کا اصل دونوں کو معلوم کرنا ہے)۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ کسی شے کی ذات یا اصل کو جاننا؛ دوسرے، کسی چیز پر اس چیز کے وجود (= صفت) کے ساتھ حکم لگانا جو فی الواقع اس میں موجود ہو، یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو فی الواقع اس سے منفی ہو۔۔۔۔ ایک حیثیت سے علم کی دو اقسام ہیں: نظری اور عملی۔ نظری علم وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے، جیسے وہ علم جس کا تعلق موجوداتِ عالم سے ہے؛ اور علمِ عملی وہ ہے جو عمل کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا، جیسے عبادات کا علم۔

ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں: (۱) عقلی، یعنی وہ علم جو صرف عقل سے حاصل ہو سکے۔ (۲) سمعی، یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو، بلکہ اُسے نقل و سماعت کے ذریعے حاصل کیا جائے (المفردات، بذیلِ مادّہ ع ل م)۔

اب ہم قرآنِ حکیم سے علم کی معنویت کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں: ارشاد ہوتا ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱): اور اللہ نے آدم کو کُل (اشیاء کے) اسماء یا نام سکھا دیے۔ عربی لُغت میں اِسم (جمع اسماء) کے معانی امام راغب اصفہانی رح نے یہ دیے ہیں: اَلْاِسْمُ مَا يُعْرَفُ بِهٖ ذَاتُ الشَّيْءِ؛ یعنی نام وہ ہے جس کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت (= ذات) پہچانی جائے۔ محولۂ بالا آیۂ قرآنی میں اسماء الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا میں "علم" کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ كُلِّ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ (المشکوٰۃ: ۱)۔ "اللہ تعالیٰ! ہمیں کُل اشیاء جیسی کہ وہ ہیں، ان کے حقائق دکھا؛ یعنی ان کا مشاہدہ و علم عطا کر"۔ زیرِ نظر آیۂ جلیلہ و حدیثِ طیبہ کی رُو سے علم کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں: "علم سے مُراد کُل اشیاء کے اصل حقائق کا مشاہدہ و ادراک ہے"۔ علم اشیائے کائنات کا مشاہدہ و ادراک ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کسی شے کے مثل نہیں، لہٰذا اس کی حقیقت یا ذات کا مشاہدہ و ادراک علم کی دسترس سے وراء الوراء ہے۔ اس سے یہ حکیمانہ نکتہ مستنبط ہوا کہ جو فلاسفۂ علم یعنی عقل و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کے ذریعے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ جو الحق ہے، اس کی ذاتِ بحت و بے نظیر کو معلوم کرنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ علم کی ماہیت، استعداد اور وظیفے سے آگہی نہیں رکھتے۔ اس بحث سے یہ اصل بھی معلوم ہوئی کہ علم حقیقت میں ایک "کُل" ہے؛ اگرچہ یہ "نامیاتی کُل" ORGANIC WHOLE ہے، لیکن یہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اسے "دینی" اور دُنیوی شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین خود ایک ناقابلِ تقسیم نامیاتی کُل ہے؛ نیز کُل زندگی کو محیط ہے اور کُل زندگی کا مطلب انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی اور دُنیوی و اُخروی زندگی ہے۔

کسی چیز کی ماہیّت وحقیقت معلوم ہو جائے تو اس کی تسخیر آسان و ممکن ہو جاتی ہے۔
اس اعتبار سے علم میں زمان و مکان (TIME AND SPACE) اور دیگر اشیائے کائنات کی ماہیّت وحقیقت کا مشاہدہ و ادراک کر کے انہیں مسخّر کرنے کی "نورانی قوّت" پائی جاتی ہے، جس کے لیے قرآنِ حکیم نے "سُلطان" کی فکر انگیز تعبیر اختیار کی ہے۔ علم کی اس نورانی قوّتِ تسخیر سے قرآنِ مجید نے چودہ صدیاں پہلے انسان کو آگاہ کر دیا تھا، جیسا کہ اس آیۂ جلیلہ سے ثابت ہے:
یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ...... اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ٥ (الرّحمٰن ۵۵: ۳۳): اے گروہِ جنّ و انس! اگر تم میں آسمانوں اور زمین کی حدود یا مداروں سے نکل جانے کی استطاعت ہے تو نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے، مگر علم کی قوّتِ تسخیر (= سُلطان) کے ساتھ۔
اس بحث سے علم کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں تحصیلِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ حضور اکرم صَلَّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَھْدِ اِلَی اللَّحْدِ؛ یعنی علم کو گہوارے یعنی ابتدائی عمر سے قبر یعنی دمِ واپسیں تک حاصل کرتے رہو۔" اس حدیثِ طیّبہ میں انسان کو عمر بھر طالبِ علم رہنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا سچا متّبعِ رسولؐ مؤمن وہ ہے جو عمر بھر علم کی طلب و جستجو میں رہتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور آپؐ کی سنّتِ حسنہ کے مطابق اس کے لبوں پہ ہمیشہ یہ دُعا رہتی ہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ٥ (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴): میرے ربّ! مجھے مزید علم عطا کر۔
اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے (المؤمنون ۲۳: ۱۴) اور اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ تزویجی ہے؛ لہٰذا اس نے اپنی ہر تخلیق کو حسین اور اس کا زوج یا جوڑا بنایا ہے (الذّاریات ۵۱: ۴۹)، اور علم اور اس کی زوج حکمت کو بھی حسین بنایا ہے۔ علم میں جمال و جلال، نُور و رنگ اور توازن و اِتقان ایسے جمالیاتی عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بدولت اس میں اشیائے کائنات یا زمان و مکان کے حقائق جاننے اور ان کو مسخّر کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے؛ نیز اسی بنا پر

انسان علم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا عرفان و ایقان حاصل کرسکتا اور ان کو اپنے اندر اپنے ظرف کے مطابق جذب کر کے اپنی شخصیت کو مزیّن کرسکتا ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اپنے اندر اللہ کے اخلاق یا صفات پیدا کرو) اور اپنے آپ کو رنگِ الٰہی (= صِبْغَۃُ اللّٰہِ) میں رنگنے کا یہی مفہوم ہے۔ صفاتِ الٰہیہ سے متّصف ہو کر ہی اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ سے اپنے رشتے کی نوعیت معلوم اور اس کی قدر کر سکتے ہیں، جیسا کہ قدر کرنے کا حق ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس تک پہنچنے کی طلب و جستجو میں جادۂ مستقیم پر گامزن رہنے اور اس کی رسّی کو پوری قوت سے دونوں ہاتھوں سے پکڑے رکھتے ہیں اور احوال و ظروف کتنے ہی صبر آزما یا شکیب رُبا کیوں نہ ہوں، اُسے چھوڑتے نہیں، بلکہ تھامے رکھتے ہیں۔ یہ ہے عبادت کی حقیقت یا فلسفۂ عبادت کا لبِّ لباب۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں علم کی اقسام سے متعلق مجملاً بحث کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

(ا) شہودی۔ وجدانی علم:

ربّ العالمین نے روزِ آفرینش سے لے کر قیامت تک جن افرادِ نسلِ انسانی کو کُرۂ ارضی میں پیدا کرنا تھا، انہیں روزِ الست و شہود اپنے حضور جمع کیا اور ان کو ان کے نفسوں کی آرزو کا اور اپنی صفتِ ربوبیّت کا مشاہدہ کرایا، نیز اس کا ان میں علم الیقین بالقوّۃ ودیعت کر دیا۔ پھر ان سے اس حقیقت کا اعتراف کرایا کہ ان کا ربّ صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے (الاعراف ۷: ۱۷۲)۔ یہ علمِ ربوبیّت ہر شخص بالقوّۃ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، جس کے لیے ہم نے "شہودی۔ وجدانی علم" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

(ب) لَدُنّی۔ وجدانی علم:

یہ علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خلیفہ مقرر کرتے وقت ودیعت کیا تھا، جیسا کہ اس آیۂ جلیلہ سے ثابت ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرۃ ۲: ۳۱)؛ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو کُل اشیاء کے نام یا حقائق کا علم عطا کر دیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو کُرۂ ارضی میں خلیفہ

بنانے کے فیصلے سے ملائکہ کو آگاہ کیا تو یہ سُن کر ان کو سخت حیرت و تشکیک ہوئی کہ جو مخلوق جذبات و احساسات، خواہشات و تمنیات اور قول و فعل کی آزادی رکھتی اور صاحبِ ارادہ و اختیار ہو؛ نیز وہ زن، زر، زمین اور حکومت و اقتدار وغیرہ وغیرہ کے حصول اور حسد و عداوت، غصہ و انتقام، جنگ و قتال اور خون ریزی و ہلاکت آفرینی کا داعیہ و اختیار بھی رکھتی ہو، خلافتِ ارضی کی سزاوار و مستحق کیسے ہو سکتی ہے؟ انھوں نے انسان کی آزادیِ فکر و عمل کے منفی نتائج کا قیاس اور اظہار تو کر دیا لیکن اس کے ساتھ علمِ انسانی کے مثبت و حسین اور حیرت انگیز و دُور رس نتائج و عواقب کا اندازہ نہ لگا سکے، اس لیے انہیں اس حقیقت کا علم نہ تھا۔ جہل ہی سے تشکیک و عداوت پیدا ہوتی، اور رائے و دلیل غلط ہوتی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے علم کے نقیض جہل ہی کے باعث وہ کفر و شرک، اکابر و بُت پرستی، ظلم و استحصال، جُرم و گناہ اور اپنے فرائض سے اغماض کرتا ہے۔ بہر حال، ملائکہ کو معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو علم کی نورانی قوت بھی دینے والا ہے، جس کے ذریعے وہ محیرّ العقول ایجادات و اختراعات کر کے حیرت انگیز ترقی کرے گا؛ زمان و مکان اور دیگر اشیائے کائنات کی تسخیر کرے گا اور دنیا کو رشکِ جنت بنا دے گا، نیز مادی ترقی کے ساتھ وہ جمالیاتی ارتقا کرتے کرتے معراجِ عبدیت کو پہنچ جائے گا، جہاں پہنچنا ان کے مقدور نہیں۔ آدم نے اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ علم الاسماء کا مظاہرہ کیا تو ملائکہ، جو نوری مخلوق ہیں، ششدر رہ گئے، انھیں اپنی کم علمی کا احساس ہوا تو انہیں سخت ندامت ہوئی اور وہ علم کی عظمت کو تسلیم کر کے آدم کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

ابلیس نے علم کی فضیلت تسلیم نہ کی اور اپنے "ناری" ہونے پر افتخار و استکبار کیا اور آدم کو خاکی مخلوق ہونے کی بنا پر حقیر جانا، اور اس جرم کی پاداش میں خود ہی ذلیل و خوار اور راندۂ درگاہ ہوا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود آدم کو علم الاسماء سکھایا تھا، لہٰذا اُسے ہم نے علمِ لدنّی۔ وجدانی سے تعبیر کیا ہے۔ دو قسم کا یہ علم انسان کے نظامِ باطنی میں بالقُوّۃ موجود ہے اور اسے حسّی۔ قلبی۔ نفسی قوتوں کے ذریعے قوت سے فعل میں لانا انسان کی ذمے داری ہے اور

اس سے عہدہ برا ہونے کا وہ شرعاً مکلّف ہے۔ کتبِ سماوی شاہد ہیں کہ رب العالمین نے ہر زمان و مکان میں بنی نوعِ انسان کو سمع و بصر اور عقل و فکر سے کام لینے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور اس کے مثبت نتائج کی انھیں نویدِ جانفزا دی اور جنّت کی حیاتِ جاودانی دینے کا تاکیدی وعدہ کیا ہے؛ نیز اس کے منفی نتائج و عواقب، خاص کر عذاب النّار سے انھیں ڈرایا دھمکایا ہے۔ جن لوگوں نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ فلاح پا گئے۔ بخلاف اس کے جنھوں نے حکم عدولی کی وہ ذلیل و خوار، محکوم و غلام یا ہلاک و برباد ہو گئے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے عروج و زوال کی داستان اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب تک مسلمان سمع و بصر اور عقل و فکر سے کام لیتے رہے، مادّی و جمالیاتی اِرتقاء کے ساتھ ساتھ اقوامِ عالم کی قیادت کرتے رہے، لیکن جب انھوں نے ان نعمتوں سے کام لینا چھوڑ دیا، قدرت نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور زوال پذیر ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں حریف قوّتوں نے انھیں اپنا محکوم و غلام بنا لیا۔ اس صورتِ حال کا مداوا یہ ہے کہ مسلم اقوام پھر سے ان حسّی۔ قلبی قوّتوں سے دُور اندیشی و منصوبہ بندی کے ساتھ مثبت و تخلیقی کام لینا شروع کر دیں۔ اس کے لیے انھیں اپنے تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی نظاموں میں حسنِ انقلاب لانا اور ان کی قرآنِ حکیم کے اُصولوں اور اُسوۂ حسنہ کے مطابق تشکیلِ نو کرنا ہو گی۔

(۳) علم بالوحی و تنزیل :

ربِّ رحمٰن نے بنی نوعِ انسان کو علم کی روشنی و توانائی سے نوازنے اور ان پر حسن و کامیابی اور جمالیاتی اِرتقاء کی راہیں وا کرنے کے لیے اپنے رسولوںؑ اور نبیوںؑ کو صحائف و کتب دے کر دُنیا میں بھیجا۔ یہ کتابیں علم و حکمت کا خزینہ ہیں۔ اس خزینے سے جن افراد و اقوام نے جس قدر استفادہ کیا، اسی قدر انھوں نے مادّی و جمالیاتی اِرتقاء کیا۔ بخلاف اس کے جن ظالم و جاہل قوموں نے ان کتبِ سماوی کی قدر کی نہ ان سے کما حقّہٗ استفادہ ہی کیا، وہ مسلسل گھاٹے میں رہیں اور دُنیوی و اُخروی اعتبار سے ناکام و نامراد رہ گئیں، اور زمانے کی راکب بننے کے بجائے مرکب بن گئیں۔

ربِّ کریم نے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے وحی و تنزیل کی اکمل و احسن اور ہر قسم کی تحریف سے محفوظ اور شک و شبہ سے ماوراء صورت اُمّتِ مُسلمہ کو عطا کی۔ یہ قرآنِ عظیم ہے جو زندہ و کامل اور ہادی و منیر اور علم و حکمت کا لازوال سرچشمہ ہے جب تک مسلمانوں نے باہم مل کر اللہ تعالیٰ کی اس ناقابلِ شکست رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھا، وہ مادّی و جمالیاتی ترقّی اور اقوامِ عالم کی امامت کرتے رہے، لیکن انھوں نے اسے چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں وہ گمراہ ہو گئے، اور اب تک پسماندہ و درماندہ، ذلیل و خوار اور داخلی و خارجی استحصالی قوّتوں کے محکوم غلام اور محتاج و دست نگر ہیں۔ قرآنِ مجید سے دُوری و مہجوری اگر ہماری دُنیوی و اُخروی حسنہ سے محرومی ہے تو اس محرومی کا درماں تمسّک بالقُرآن ہے۔ اس کا مطلب اجتہاد بالقرآن و جہاد بالقرآن، نیز زندگی کے ہر گوشے میں اس کی حاکمیتِ اعلیٰ کو عملاً تسلیم کرنا اور اس کے احکام و تعلیمات کے مطابق فکری و عملی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کرنا ہے۔

(۴) حسّی۔قلبی علم:

اس علم کی تحصیل کے لیے ربِّ علیم و حکیم نے انسان کو حسّی۔قلبی نظام ودیعت کیا ہے۔ حسّی نظام سے مراد حواسِ خمسہ ہیں، جن میں سے سامعہ و باصرہ ہی علم و حکمت (= سائنس و ٹیکنالوجی اور ہنر و فن) کے اکتساب میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔ جمالیاتی مشاہدے اور سائنسی تجربات میں بھی دیگر حواس کے مقابلے میں ان کی اہمیّت بہت زیادہ ہے۔ نظامِ قلب میں سے عقل و فکر اور حافظہ اس ضمن میں ازبس اہمیّت کے حامل ہیں۔ علاوہ بریں، تحصیل و اکتسابِ علم و حکمت وغیرہ میں قلم و کتاب اور کائنات و حیات کے ہنگامے، نیز احسن الخالقین کی جمالیاتی۔تزئینی تخلیقی فعلیّت کے نو بنو مظاہر ازبس اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سے علم الاسماء حاصل ہوتا ہے، جس کے نور و توانائی کو اصطلاحِ قرآن میں "سُلطان" کہتے ہیں۔ یہ سُلطان ہے، جس کے ذریعے انسان ایجاد و اختراع اور زمان و مکان کی تسخیر کر رہا ہے۔

(۵) ورائی مشاہدات :

ان کو لامکانی و لازمانی مشاہدات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں : ایک رویائی اور دوسرا مراقبی۔ "رویائی" مشاہدے کو رویائے صادقہ کہتے ہیں۔ اس سے ماضی و حال اور مستقبل کے ایسے حالات و واقعات کا مشاہدہ ہوتا ہے جو علم میں اضافہ اور صاحبِ مشاہدہ میں علم الیقین پیدا کرتا ہے۔

"مراقبی" مشاہدے میں نفسِ روحی کبھی نیم بیداری، کبھی خواب کے عالم میں عالمِ دہر کی سیر کرتا ہے۔ وہاں وہ الحیوان (= جنت و دوزخ وغیرہ)، عالمِ برزخ، عالمِ ملکوت اور عالمِ ورا الورا میں ایسے ایسے مشاہدے کرتا ہے، جو علم الیقین، عین الیقین بلکہ حق الیقین کا بھی درجہ رکھتے ہیں، نیز انسان کے علم و حکمت، معرفتِ نفس و عرفانِ الٰہی اور نور و ایمان میں اضافہ اور اس کے جمالیاتی ارتقاء میں محرکات کا کام کرتے ہیں۔ ان ورائی مشاہدات سے اہلِ آرزو کو جمالیاتی ثروت ملتی، ان کی آتشِ شوق تیز ہوتی اور ان میں خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو کو مہمیز بھی لگتی ہے۔

اس کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ علم ہی کی بدولت انسان کو دین یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ (= عبادت) کی غایت اور مقصودِ حیاتِ انسانی، نیز اُسے اللہ تعالیٰ اور کائنات سے اپنے تعلق کی نوعیت سے آگہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، علم ہی کے ذریعے وہ صلوٰۃ کے حقائق، حقوق اور تقاضوں سے آگاہ اور اس کے فیوض و فوائد اور دنیوی و اُخروی حسنات و برکات سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ علم عبادت کی پیش شرط ہے، خصوصاً صلوٰۃ کی۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ میں سورۂ فاتحہ اور دیگر آیاتِ قرآنی کا پڑھنا ناگزیر ہے، اور اس کو مؤثر بنانے کے لیے قرآنِ مجید کے معانی و مطالب کا سمجھنا لازمی ہے۔ علاوہ بریں، یہ حقیقت جانے بغیر کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے کیا رشتہ ہے؟ وہ انسان بن سکتا ہے نہ اس کا بندہ؛ وہ لذتِ زندگی سے آشنا ہو سکتا ہے نہ خوف و حزن کے کرب سے نجات ہی حاصل کر سکتا ہے؛ نیز وہ اپنی شخصیت کو صبغۃ اللہ یا رنگِ الٰہی سے مزین کر کے اپنی تکمیل کر سکتا، نہ اپنا جمالیاتی ارتقا ہی کر سکتا ہے۔ ترفعِ درجات، نورِ باطنی کا اتمام اور

جمالیاتی ارتقاء ایک ہی حقیقت کی تین تعبیریں ہیں۔ چنانچہ یہ علم ہے جو انسان کو اس اصلِ عظیم سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کا خالق، ربّ اور اِلٰہ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے، جو وحدہٗ لاشریک اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ہے اور وہ اس کا تخلیقی شہکار، پروردہ و بندہ اور فقیر و سائل اور مطیع و محکوم؛ نیز اس کا حامد و پرستار اور عابد و ساجد ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :

(۱) خالق :

اللہ تعالیٰ موت و حیات و کائنات کا خالق ہے۔ انسان کو اس حقیقت کا احساس و شعور ہونا چاہیے کہ زندگی اس کا استحقاق نہیں، بلکہ ربِّ کریم کی موہبت و نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ یہ ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے کہ انسان ابدالآباد تک اس کا شکریہ ادا کرتا رہے تو حق ادا نہیں کر سکتا؛ نیز حیات کی طرح انسانیت بھی موہبتِ الٰہی و نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور وہ اس کا بھی حقِ تشکر کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ انسان سوچے کہ اللہ تعالیٰ اگر اُسے بشر پیدا نہ کرتا تو وہ کیا کر سکتا تھا؟ اگر وہ وحوش، درندوں، چوپاؤں، فضائی یا دریائی مخلوقات یا حشرات الارض میں سے ہوتا اور انسانیت و حُسنِ زندگی سے محروم ہوتا، نتیجۃً موت اسے ہمیشہ کے لیے فنا و معدوم کر دیتی تو وہ اللہ تعالیٰ کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ اہلِ ایمان تو اپنے ایمان ایسی نعمتِ عظمیٰ اور کلیدِ جنّت کا لاکھ شکریہ ادا کریں تو کر نہیں سکتے۔ اگر وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس و ہنود ہوتے یا مشرکین و منکرانِ خدا تو ان کا انجام آتشِ جہنّم میں جلنے مرنے اور مر مر کر جینے کے سوا اور کیا ہوتا؟ علاوہ بریں، وہ جنّت اور اس کی بے مثال و بے قیاس، حیرت انگیز و مسحور کُن نعمتوں سے محروم رہ جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے معروضِ حسن و عشق کی دید و رضا اور قرب و حضوری کی سرور انگیز و وجد آفریں رحیقِ مختوم کی لذّت سے نا آشنا رہ جاتا۔

یہ علم ہے جو ہم میں اس حقیقت کا شعور و احساس پیدا کرتا ہے کہ زندگی، انسانیت اور ایمان ایسی عظیم نعمتوں کا تشکر کرنا، مؤمنین پر فرض ہے؛ نیز وہ ہمیں قدرت کے قانونِ آرزو و کفرانِ نعمت کی یاد دلاتا ہے کہ جو فرد یا قوم اپنی کسی نعمت یا نعمتوں کی قدر نہ کرے یا اُن کی

اُسے سچی آرزو نہ رہے تو وہ نعمت یا نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں یا انسان اُن سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اُمّتِ مُسلمہ کے عروج کی وجہِ حقیقی یہ تھی کہ اُسے ایمان و حیات اور انسانیت کی بے بہا نعمتوں کی قدر و آرزو تھی، اور جب اسے ان کی قدر رہی نہ آرزو تو وہ زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی، اور انحطاط و تنزّل کا یہ سلسلہ دیکھیے کہاں جا کر رُکتا ہے؟

(ب) ربّ :

قرآنِ حکیم کی رُو سے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ انسان کا خالق بھی ہے اور ربّ بھی۔ اگر وہ احسن الخالقین ہے تو ربِّ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ احسن الخالقین سے مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی یا تزویجی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے حسین اور جوڑا ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس کی ہر تخلیق حسین بھی ہوتی ہے اور اس کا زوج بھی ہوتا ہے۔

ربّ قرآنِ مجید کی وسیع المعانی بنیادی اصطلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں: درجہ بدرجہ نشوو ارتقا کرنے والا، آقا و مالک، حاکم و مُطاع، کارساز و مشکل کُشا، دستگیر و حاجت روا، حافظ و ناصر؛ نیز سمیع و بصیر، حیّ و قیّوم، سُبحان و صمد، عزیز و قدیر، علیم و حکیم اور توّابُ الرّحیم و مستجیب الدّعوات۔ توحیدِ ربوبیّت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، جس کے مطابق زندگی کرنے والا موحّد ہوتا ہے۔ موحّد کا نقیض مشرک ہے۔ شرک چونکہ توحید کی ضد و نقیض ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک ربّ ہونے کی تکذیب لازم ہوتی ہے، لہٰذا قرآنِ حکیم کی رُو سے شرک ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ہے (لُقمٰن ۳۱ : ۱۳؛ النسآء ۴ : ۱۱۶) اور اس کا انجام دُنیا میں خوف و حزن کی اذیّت اور طمانیتِ قلب سے محرومی ہے تو آخرت میں جنّت سے محرومی اور جہنّم کی نارالکبریٰ میں جلنا مرنا اور مر مر کے جینا اور موت کو ترستے رہنا ہے (الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳)۔ بخلاف اس کے، جو لوگ توحیدِ ربوبیّت کے عقیدے کو خون کی طرح اپنے اندر جذب کر کے ہمیشہ اس کے مطابق زندگی کرتے رہتے ہیں، خواہ احوال و ظروف کتنے صبر آزما یا شکیب رُبا کیوں نہ ہوں؛ نیز وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا رازق و پروردگار، حاجت روا و مشکل کُشا، شافی و ضامن،

حافظ و ناصر، کارساز و سمیع الدّعوات یا مستجیب الدّعوات نہیں سمجھتے اور نہ ان کو پکارتے اور نہ ان سے مدد ہی مانگتے ہیں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ○ (فصلت ۴۱: ۳۰-۳۱؛ نیز دیکھیے الاحقاف ۴۶: ۱۳): جن لوگوں نے کہا: "اللہ ہمارا رب ہے"، اور پھر وہ اس (قول و عقیدے) پر ثابت قدم رہے۔ یقیناً ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: "نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے اولیاء (= دوست و رفیق) ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو تمھارے نفس خواہش کریں گے اور وہاں جس چیز کی تم تمنّا کرو گے وہ تمھاری ہو گی۔ یہ سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے ہو گا جو غفور اور رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ اور انسان کے رشتے کی نوعیت ایک یہ ہے کہ وہ اس کا ربّ ہے تو انسان اس کا مرزوق (= روزی حاصل کرنے والا)، مربوب (= پروردہ اور نشو و نما پانے والا)، فقیر و سائل (= محتاج و گدا) اور عبد (= بندہ اور اطاعت گذار) ہے، لہٰذا انسان پر صرف اپنے ربّ کی حمد و بندگی کرنا فرض ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی حمد و بندگی کرنا شرک ہے۔ چنانچہ جو لوگ ماضی یا حال کے حقیقی یا غیر حقیقی اولیاء اللہ یا معاشرتی سرطانوں مثلاً فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کی حمد و بندگی کرتے ہیں یا ان کو رکوع و سجدہ کرتے، ان کو پکارتے، ان سے مدد اور مرادیں مانگتے اور ان سے اُمیدیں رکھتے ہیں، وہ حقیقت میں شرک کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اُسے "کافری" کہتے ہیں:

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

(ج) اِلٰہ:

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ انسان کا ربّ بھی ہے اور اِلٰہ بھی۔ اس لحاظ سے ان کے باہمی رشتے کی نوعیت دُہری ہے: یعنی ربوبیّت و اُلُوہیّت کی ہے۔ اِلٰہ قرآنِ حکیم کی بنیادی مُصطلحات میں سے ہے اور اس کا مطلب ہے: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود۔ جمالیاتی زبان میں اسے معروضِ حُسن و عشق بھی کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اِلٰہ کو خدا کے مفہوم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اُلُوہیّت دراصل محبّت و پرستش یا عشق و وفا کا رشتہ ہے۔ اس اعتبار سے انسان اللہ تعالیٰ کا عابد و پرستار اور طالب و عاشق ہوا۔ اربابِ عشق و وفا یا اہلِ آرزو جانتے ہیں کہ عشق و وفا کا یہ رشتہ انتہائی حسین و سرور انگیز اور مضبوط و ناقابلِ شکست ہے، لیکن بے حد لطیف و نازک بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رشتۂ اُلُوہیّت، رشتۂ ربوبیّت کی طرح بلا شرکتِ غیر ہو تو محبوب ترین، نور افزا، اٹوٹ اور دائمی ہوتا ہے، لیکن شرکتِ غیر سے یہ بے حد قبیح و نفرت انگیز ہو کر از خود ٹوٹ جاتا ہے۔ بہر حال، یہ رشتۂ عشق و وفا قائم رہے تو انسان اہلِ عشق و وفا، نفسِ مطمئنّہ، صاحبِ حُسن و سُرور اور وارثِ جنّت ہوتا ہے۔

ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیئے کہ ربوبیّت اور اُلُوہیّت کے رشتے کا علم الیقین و عین الیقین روزِ شہود و الست سے ہر فردِ بشر کی سرشت میں بالقُوّۃ موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ دُنیا میں آتا ہے، لیکن اسے قوّت سے فعل میں لانا، انسان کا اپنا کام ہے، بلکہ اس کا اہم ترین فریضۂ حیات، دین کا بنیادی تقاضا اور اس کے معروضِ حُسن و عشق کی مشیّت ہے۔ اسے غوّاصِ فکر کے ذریعے قوّت سے فعل میں لایا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان اپنے نفس کے دریائے خواہشات میں اپنی "آخری تمنّا" کا سراغ اپنے غوّاصِ فکر کے ذریعے لگا سکتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ علم کی روشنی و ہدایت اور توانائی و قوّتِ تسخیر (= سُلطان) ہے،

جس نے انسان کو خلافتِ ارضی کا سزاوار اور مسجودِ ملائکہ بنایا اور جس کی عظمت سے انکار نے ابلیس کو ملعون و راندۂ درگاہ اور مغضوب و مقہور بنا دیا۔ اسی علم کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے اور وہ زمان و مکان اور مخلوقات کو مسخر کیے جا رہا ہے۔ علاوہ بریں، یہ علم ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم دُنیا میں کس لیے اور کیوں آئے ہیں؟ ہمیں کس نے زندگی دی اور کون ہماری جسمانی و باطنی ربوبیت کرتا، ہمیں مادی و جمالیاتی ارتقاء کرنے کی توفیق و ہدایت دیتا؛ ہمیں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے ہمیں صراطِ مستقیم دکھاتا اور اس پر چلنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ علم ہی کے ذریعے ہمیں اس حقیقت سے آگہی ہوئی اور ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے رشتے کی نوعیت کیا ہے اور کائنات سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟ موت اگر شدنی ہے تو ہمیں مر کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانا ہے یا کسی اور جہان میں جانا ہے اور اس جہان کو "الحیوان" کیوں کہتے ہیں؟ ہماری منزلِ مقصود و آخر کون سی ہے؟ اگر جنت ہے تو اس میں انسان کیسے پہنچ سکتا ہے؟ بھلائے جنت کیا ہے؟ دوزخ میں کون اور کیوں جائیں گے؟

کیا دُنیا انسان کی امتحان گاہ اور زندگی رہینِ امتحان ہے؟ اگر ہے تو اس امتحان میں کامیابی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا عبادت فطرتِ انسانی کا خاصہ، دین کا تقاضا اور مشیتِ "دوست" ہے؟ کیا صلوٰۃ عبادت کی احسن و اکمل شکل ہے؟ اگر ہے تو کیوں ہے؟ اس کے حقوق، تقاضے اور فیوض و فوائد کیا ہیں؟ کیا صلوٰۃ دین کی اساس ہے؟ اگر ہے تو کیوں ہے؟ ظاہر ہے اس قسم کے سوالات اور ان کے صحیح جوابات سے آگہی علم ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بننے اور امتحانِ زندگی میں کامیابی حاصل کر کے اپنے معروضِ حسن و عشق کی جائے لقاء (جنت) میں پہنچنے کے لیے پہلے علم حاصل کرنا، عبادت کی ناگزیر حاجت ہے۔ اس اعتبار سے علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے۔

عبادت اصل میں علم کا خاصہ بھی ہے اور تقاضا بھی؛ اور حسنِ عمل یا اعمالِ صالحہ کا دوسرا نام عبادت ہے۔ یہ اعمالِ صالحہ ہیں جو علم کو معتبر بناتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ

کی حرکیاتی قوّت (DYNAMIC FORCE) سے علم کا نور ترقّی کر کے اپنا اِتمام کر لیتا ہے، جسے "ایمان" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایمان کا اعتبار بھی اعمالِ صالحہ ہیں اور دونوں کا نام عبادت ہے، اور علم پیش شرط ہے ایمان و اعمالِ صالحہ یا عبادت کی؛ اور عبادت کی افضل و اکمل شکل صلوٰۃ ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ صلوٰۃ کو، جو افضل العبادات ہے، علم مستلزم ہے؛ نیز قرآنِ حکیم کے احکام اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق صلوٰۃ قائم کرنے، اسے مؤثّر بنانے اور اس کے فیوض و فوائد اور برکات و حسنات سے مستفید ہونے؛ نیز اس کے ذریعے اپنے اندر اپنے الٰہ و ربّ کی شمعِ عشق فروزاں کرنے اور اس کے نور اور تب و تاب سے اپنے باطنی نور کا اِتمام یا جالیاتی ارتقاء کرنے کے لئے "علم" ناگزیر ہے۔ جالیاتی اِرتقاء اور ترفّعِ درجات ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

صلوٰۃ کی حقیقت

بعض طبائع سوچتی ہیں کہ صلوٰۃ کیا ہے اور ہم پر کیوں فرض کی گئی ہے؟ کیا صلوٰۃِ پنجگانہ انسان کے لیے بیگار، اس پر بارِ گراں اور اس کی آزادی پر قدغن نہیں؟ کیا یہ تضیعِ اوقات اور وقت و دولت کا زیاں ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات اِس اصلِ عظیم پر دلالت کرتے ہیں کہ ان شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ علم کا فقدان و جہل ہے۔ علم کی رُو سے ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ انسان حقیقت میں عبد ہے اور عبدیّت کا خاصّہ و تقاضا عبادتِ معبود ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ہ (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۶)؛ میں نے جنّ اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کا مفہوم اور حقیقت کیا ہے ؟ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں عبادت کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بنی نوعِ انسان سمیت جملہ مخلوقات ربُّ العالمین کے تخلیقی رنگ و بو کے حسین شہکار، اس کے پروردہ و فقیر اور سائل و بندے ہیں، اور سب مل جُل کر رہتے ہیں اور سب کی مشترکہ سعی و عمل سے زندگی کا کاروبار چل رہا ہے۔ ربّ العالمین نے آسمانوں اور زمین میں اپنی نعمتیں سب کے تمتّع کیلئے پیدا کی ہیں۔ انسان کو محنت و مشقّت کے لیے پیدا کیا ہے (البلد ۹۰:۴)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محنت و مشقّت کرنا اس کا مُقدّر ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حاصل کرنا اس پر لازم ہے؛ لہٰذا جتنی اور جیسی وہ سعی و جہد کرے گا اتنا ہی وہ پھل پائے گا: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم ۵۳ : ۳۹)۔ ان دو آیاتِ جلیلہ سے ہم ان نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کے لیے اس کے باطن یعنی حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں اور ظاہر یعنی دنیا میں بالقُوّہ ودیعت کی ہیں، ان کو محنت و مشقت اور سعی و جُہد سے فعل میں لانا اور مستفید ہونا، اس پر واجب ہے۔ دوسرے ان نعمتوں کو عدل و احسان اور سعی و محنت کی کیفیت و کمیّت کے مطابق آپس میں تقسیم کرنا اور ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کرنا اور فالتو مال و دولت کو جمع کرنے کے بجائے دوسروں کی ضروریات و حاجات کو پورا کرنے کے لیے حکومت کے حوالے کر دینا، لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ان حسین و بے قیاس نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا، انسان پر فرض ہے، اس لیے کہ وہ ہمارے تشکّر و امتنان کا مستحق ہے۔ اسے حقوق اللہ کہتے ہیں؛ اور اس کی نعمتوں سے اس کے بندوں کو حسبِ ضرورت و توفیق مستفید ہونے دینا اور ان کے کام آنا، ان سے عدل و احسان اور ہمدردی و محبّت کرنا، ان کے لیے ایثار و قربانی کرنا، الغرض ان کے لیے رحمت بن جانا، حقوق العباد میں شامل ہے۔ الغرض حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بطیبِ خاطر اپنے اِلٰہ و ربّ کے قرب و حضوری، رحمت و مغفرت اور جنّت و رضا کے لیے احکامِ الٰہیہ اور اُسوۂ حسنہ کے مطابق حسبِ استطاعت پورا کرنے کی مسلسل پیہم

تادمِ واپسیں سعی و جہد کرتے رہنا، عبادت ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایمان بالحق لائے اور اس طرح لائے جس طرح لانے کا حق ہے اور اس کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو اپنے اندر خون کی طرح جذب کرکے ان کے مطابق زندگی یا اعمالِ صالحہ کرنے کا نام عبادت ہے۔

عبادت ایک تو انسان کی فطرت کا خاصہ و تقاضا ہے اور دوسرے، مشیتِ الٰہی بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عبدیت معبود کو چاہتی ہے، اس کی بندگی کرنے کے لیے۔ دوسرے انسان اس حقیقت کا ایقان و عرفان لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا اِلٰہ و ربّ ہے، جو جمیل و جلیل اور رحمٰن و رحیم ہے (دیکھیے الاعراف ۷: ۱۷۲)۔ اس ایقان و عرفان میں محبتِ الٰہی بالقوّۃ ودیعت ہوتی ہے، جس طرح مثال کے طور پر کسی ثمرور پودے کے بیج میں اپنے برگ و بار لانے کی استعداد مضمر ہوتی ہے ـــــ علاوہ بریں، ایک تو اللہ تعالیٰ الحُسن ہے، اسی لیے تو قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷: ۱۸۰، نیز دیکھیے طٰہٰ ۲۰: ۸ و الحشر ۵۹: ۲۴): اور اللہ ہی کے لیے حسین نام یا صفات ہیں، اُسے حسین ناموں ہی سے پکارو۔ دوسرے اس نے انسان کو جمالیاتی حِسّ AESTHETIC SENSE یا ذوقِ حُسن TASTE FOR BEAUTY ودیعت کیا ہے، اس لیے حُسن کو چاہنا اور محبّت کرنا، اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ علاوہ بریں، اللہ تعالیٰ چونکہ اپنی جملہ جمالیاتی تخلیقات سے اتنا زیادہ حسین ہے کہ کوئی متنفس اس کا قیاس تک نہیں کرسکتا، اس لیے ہم نے اس کے لیے "الحُسن" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ انسان کا معروضِ حُسن و عشق اور معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (= اِلٰہ) ہے، نیز کیوں اس سے اس کی جملہ مخلوقات سے شدید ترین محبّت کرنا، جمالیاتی حِسّ کا خاصہ، فطرتِ انسانی کا تقاضا اور مشیّتِ الٰہی ہے۔ مندرجہ ذیل آیۂ جمیلہ اسی حقیقتِ عُظمیٰ کی آئینہ دار ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ... (البقرہ ۲: ۱۶۵): کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا

دوسروں کو اس کا ہمسر و مدِ مقابل بناتے ہیں اور ان سے اس قدر محبت کرتے ہیں جس قدر اللہ سے کرنی چاہیے۔ لیکن جو ایمان رکھنے والے ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

انسان احسن الخالقین کی جمالیاتی۔ تزویجی تخلیقی عمل کا شہکار ہے اور اپنی بے پایاں رحمت کی وجہ سے جو ہر چیز کو محیط ہے، اس سے بے نہایت محبت رکھتا ہے اور انسان کو بار بار اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ فصلت میں ارشاد ہوتا ہے: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (۴۱ : ۳۱) : ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے دوست و سرپرست ہیں اور آخرت میں بھی۔

آخرت سے یہاں مراد جنت کی اخروی زندگی ہے؛ جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لیے ہے؛ اور وہاں اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا: وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ٥ (۴۱ : ۳۱) : اور اس میں تمھارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمھارے نفس خواہش کریں گے اور جو چیز تم مانگو گے تمھاری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی عبادت کر کے اس کی جنت میں رہنے کے قابل بن جائیں۔ اہلِ جنت کی اس دنیا میں یہ پہچان ہے کہ ان کے نفس مطمئن اور وہ اہلِ حسن و سرور ہوتے ہیں۔ طمانیتِ قلب، قلب کا حسن و سرور اور قرۃ العین، جن کے لیے ہم نے "جمالیاتی ثروت" کی تعبیر اختیار کی ہے، عبادت کا ثمرہ ہے اور عبادت کی اکمل و احسن شکل اسلام کی صلوٰۃ یا نماز ہے۔ فلسفۂ عبادت و حیات کو قرآنِ حکیم نے اپنے اعجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے:

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ٥ (الرعد ۱۳ : ۲۷ تا ۲۹) : اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف

رجوع کرتا ہے (یعنی جو شخص اس کی طرف رجوع کرتا ہے، اسی کو وہ اپنی طرف آنے کا راستہ، جسے وہ "صراط" بھی کہتا ہے، دکھاتا ہے)۔ ایسے ہی لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کے قلوب (دل و دماغ اور نفس) اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے (یعنی جمالیاتی ثروت ملتی ہے) جو لوگ (سچے دل سے) ایمان لائے اور انھوں نے صالح عمل کیے، ان کے لیے مسرتِ محض (= طوبیٰ) اور حسین گھر یا جنّت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید اہلِ ایمان کو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۴۱): اے مسلمانو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ اللہ تعالیٰ اہلِ عشق و وفا کو جن کا وہ معروضِ حسن و عشق (= الٰہ) ہوتا ہے، یہ مژدۂ جانفزا سناتا ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ (البقرۃ ۲: ۱۵۲): تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔

انسان اگر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، عزّت و قدرت، جمال و جلال، جبّاری و قہاری، احسان و کریمی اور رحمت و موہبتِ بے پایاں کا تصوّر کرے تو اسے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کے اپنے بندے کو یاد کرنے کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر انسان کی سعادت و خوش نصیبی، عُلوِ مرتبت و عظمت، حسنہ و مسرّت، الغرض جمالیاتی ثروت کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے ہی اہلِ حسن و سرور کا حُسنُ المآب جنّتِ قُرّۃُ العین ہے، جو ان کے معروضِ حسن و عشق کی جلوہ گاہ و جلائے لقاء ہے۔ الحیوان کے اس موت ناآشنا خلدِ بریں میں جس کے جمال و جلال، دلکشی و جاذبیت، نظر افروزی و سرور انگیزی اور قُرّۃُ العین و جمالیاتی ثروت کا کوئی متنفس خیال تک نہیں کر سکتا، الحُسن اپنے ان اہلِ آرزو بندوں پر ہمیشہ اپنا نو بنو صُوری جلوہ پیدا کرتا رہے گا۔ ان کے ذوقِ دید کی تسکین کرتا اور آتشِ شوق کو بھڑکاتا رہے گا۔ اس کے

حُسنِ صورت یا صورتِ حُسن کا نظارہ اس قدر سُرور انگیز و کیف پرور اور وجد آفریں و مسحور کُن ہوگا کہ اُنھیں اس وقت تک زمان و مکان کا ہوش نہ رہے گا جب تک اُن کا معروضِ آرزو جلوہ افروز رہے گا وہ وہاں اپنے الٰہِ جمیل و ربِّ کریم کے مہمان ہوں گے اور وہ انھیں اپنی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و رضوان کی رحیقِ مختوم کی لذّتِ مسحور کُن سے سدا سرشار رکھے گا وہ ہر آن اپنے حُسن کے رفعت پذیر و نو بنو مظاہر میں جلوہ افروز ہوتا رہے گا (الرحمٰن ۵۵:۲۹):
اور ان تک اپنی فطرکی رسائی کے لیے اہلِ آرزو ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہیں گے: رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (التحریم ۶۶:۸):
ہمیں نشو و نما دینے والے ہمارے آقا! ہمارے (حسّی، قلبی، نفسی نظام کے) نور کی تکمیل کردے اور ہماری حفاظت فرما۔ تو بلاشبہ ہر شے پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے۔

ربِّ رحمٰن و کریم اپنے اہلِ آرزو بندوں کو سدا اپنے پاس اپنی جنّتِ بے مثال و قرۃ العین میں رحیقِ مختوم کی سرخوشیِ جانفزا میں سرشار رکھنے کی خاطر انھیں عباد الرحمٰن بن کر رہنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ حُسنِ عبادت سے اپنی زندگی کو حسین بنائیں اور جہانِ حُسن و حیاتِ جاوداں میں رہنے کے قابل بن سکیں۔ یہ ہے فلسفۂ عبادت کا لُبِّ لُباب، جس کی اکمل و احسن شکل اسلام کی نماز ہے، جسے قرآنِ مجید صلوٰۃ سے تعبیر کرتا ہے۔ فلسفۂ عبادت کی رُو سے صلوٰۃ، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی ایسی نعمتِ حُسنیٰ ہے، جس کی عظمت و فضیلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے اہلِ آرزو کو اس کا معروضِ حُسن و عشق ملتا ہے۔ "وہ" مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے جو اس نے اپنے صاحبِ ارادہ و اختیار جمالیاتی، تخلیقی شہکار البشر کے لیے اس دُنیا اور الحیوان میں پیدا کیا ہے؛ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے اس کے قرب و رضوان اور دید و حضوری کی غیر مترقبہ نعمتِ عُظمیٰ ملتی ہے۔ ایسی نعمتِ بے مثال و بے بہا کو بیگار و تضیعِ اوقات اور آزادیِ انسان کے منافی سمجھنا ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ صلوٰۃِ پنجگانہ کو ایسا سمجھنا تکذیبِ دین بھی ہے اور تکفیرِ نعمتِ عظمیٰ بھی۔

حقیقتِ صلوٰۃ کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے اعجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ ۲۰: ۱۴):

میں اور میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود و خدا نہیں، لہٰذا میری عبادت کر اور میرے لیے صلوٰۃ قائم کر۔

اس آیۂ جلیلہ کے مضمرات میں سے اس اصلِ عظیم کا سراغ ملتا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ تعالیٰ ہی انسان کا حقیقی معروضِ حسن و عشق ہے اور صلوٰۃ کی حقیقت عشقِ الٰہی ہے اور عشق اور یادِ محبوب لازم و ملزوم ہیں؛ نیز صلوٰۃ یادِ الٰہی کا احسن و اکمل ذریعہ ہے۔ بالفاظِ دیگر، صلوٰۃ کی حقیقت محبتِ الٰہی اور اس کی غایتِ حقیقی یادِ الٰہی ہے۔ یادِ الٰہی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وجۂ طمانیتِ قلب و جاں ہے اور طمانیت بہلائے جنّت بھی ہے اور اہلِ جنّت کی باطنی شناخت بھی۔ اِسی بنا پر صلوٰۃ کو کلیدِ جنّت بھی کہتے ہیں۔

صلوٰۃ کی روح قرآنِ حکیم ہے اور قرآنِ مجید کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے "الذکر" (آل عمران ۳: ۵۸؛ الحجر ۱۵: ۶ وبمواضع کثیرہ) اور صلوٰۃ کو بھی "ذکر اللہ" سے تعبیر کیا ہے (الجمعۃ ۶۲: ۹)۔ قرآنِ مجید بلاشبہ آئینۂ حُسن و حق بھی ہے اور اہلِ نظر و آرزو کے لیے آئینۂ الحُسن والحق بھی۔ چنانچہ صبحدم جب آفاقی اور انفسی فضائیں حسین و مُطہر ہوتی اور اہلِ عشق کے قلوب درد و سوزِ آرزومندی سے معمور اور تب و تابِ محبت سے منور رہوتے ہیں اور وہ اپنے معروضِ حُسن و عشق کے حضور اس کی معبودیت اور اپنی عبودیت کے اعتراف اور اس کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کی آرزو کا اظہار کرنے کی خاطر حاضر ہوتے ہیں تو قرآنِ مجید اپنے حُسنِ معنویت اور الحُسن کے انوار و تجلیات کے ساتھ اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو خود اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ...... اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ﴿ (الاسراء ۱۷: ۷۸):

صلوٰۃ قائم کرو آفتاب کے زوال سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو۔ بلاشبہ قرآنِ فجر (اپنے حُسنِ معنویت کے ساتھ) مشہود ہوتا ہے۔

نیند موت کا زوج ہے۔ صبح کو اِنسان نیند سے بیدار ہوتا ہے تو گویا وہ دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جمالیاتی حسّ، عقلِ سلیم، ضمیر، نفسِ لوّامہ کے ساتھ اس کے قلب میں الحسن و الحق کی معرفت و آرزو بھی زندہ و بیدار ہو جاتی ہے۔ ایسے حسین و مُطہّر داخلی و خارجی احوال و ظروف میں زندہ و بیدار انسان آرزوئے "دوست" کے ساتھ اس کے حضور دست بستہ کھڑا ہو کر اس کے "حُسنِ کلام" کو پڑھتا اور سنتا ہے تو رُوحِ قرآنِ مجید اُس کے حسین و منیر حِسّی قلبی نفسی نظام پر مستحضر ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا نور ترقی کرتا اور حرکی (DYNAMIC) بنتا ہے؛ یا بالفاظِ دیگر، اہلِ آرزو کا جمالیاتی اِرتقا ہوتا ہے، اور صلوٰۃ ان کے لیے قُرَّۃُ العین بنتی ہے۔ اپنے اس تجربے کو رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ: یعنی صلوٰۃ میں میرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (حدیثِ طیبہ)۔ اصل یہ ہے کہ نماز قُرّۃ العین بنے تو صلوٰۃ ہوتی ہے، کیونکہ یہ صلوٰۃ کی تاثیر ہے۔ اس کے معانی و مفہوم کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اسے اپنی جنّتِ حُسن و سُرور کے لیے استعمال کیا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (السجدہ ۳۲:۱۷)؛ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی چیز جو قُرّۃ العین یا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، ان کے اعمال کی جزا میں ان سے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔

اس سے یہ مستنبط ہوا کہ صلوٰۃ و جنّت میں قدرِ مشترک "قُرَّۃُ العین" ہے۔ چونکہ یہ قرآنِ حکیم کی اصطلاح ہے، لہٰذا اُصولاً اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے جنّت کی جن حسین و بے مثال نعمتوں کی طرف فکر انگیز و بلیغ اشارے کیے ہیں ان میں سے حسن و افضل نعمت اہلِ آرزو کے لیے ان کے معروضِ حُسن و عشق کی لِقاء و حضوری، قرب و رضوان اور ہم نظری و ہمکلامی ہے۔ اس نعمتِ عظمیٰ سے انھیں ایسی بے مثال و ناقابلِ بیان جمالیاتی

لذت و سرخوشی، طمانیت و مسرت اور حیرت و مستی ملے گی کہ ان کے پیکرِ شباب جاوداں کا ایک ایک انگ، ایک ایک حاسّہ اور قلب و نفس کا ایک ایک جزو جانفزا و شیریں، وجد آفریں و سرور انگیز جمالیاتی ٹھنڈک سے متکیّف و مسحور ہو جائے گا اور انھیں اس عالمِ قرۃ العین میں زمان و مکان کا احساس رہے گا نہ ہوش۔ الحیوان کے اس جہانِ حسن و سرور کی حقیقی و بے مثال "جمالیاتی ٹھنڈک"، ہمارے اس عالمِ مرگ و حیات کی نسبت سے اپنے رنگِ مجاز میں اُن اہلِ آرزو کو حسنِ صلوٰۃ میں ملتی ہے، جو "احسان" کے مقامِ شاہدیت پر متمکن ہوتے ہیں۔ احسان کو شاہدِ اعظم و رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے "حدیثِ جبریل" میں ایجاز و بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ح ۱)؛ اس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: احسان سے متعلق مجھے بتلائیے؟ آپؐ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ جیسے تو اُسے دیکھ رہا ہے (یعنی شاہد بن کر عبادت کرے)۔ اگر ایسا نہ ہو کہ تو اُسے دیکھ سکے تو تمھیں احساس و یقین ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (یعنی تو اس کا مشہود ہو)۔

شاہدیت کا حسنُ المقام اہلِ آرزو کو اپنے حسی، قلبی، نفسی نظام کے نورِ حسن کے ارتقاء و اتمام یا جمالیاتی ارتقاء سے حاصل ہوتا ہے۔ جمالیاتی ارتقاء کا بہترین ذریعہ حسنِ صلوٰۃ ہے، خاص کر اہلِ آرزو کا وہ مقامِ عبودیت ہے جو ربِّ ذو الجلال والاکرام کے حضور خشوع و خضوع، عجز و انکساری، الحاح و زاری اور ناصیہ فرسائی کا پست ترین مقام ہے، لیکن اس کی قلب آشنا نظرِ کرم میں وہ اتنا ہی افضل و ارفع مقامِ قربِ "دوست" ہے۔ حسنِ عبادت و صلوٰۃ اور جمالیاتی ارتقاء و احسان کے فلسفے کی آفاقیت کو قرآنِ حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے صرف دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق ۹۶ : ۱۹) :

اور سجدہ کرو اور (اپنے معروضِ حسن و عشق کا) قرب حاصل کرو۔

سجدے اور قربِ الٰہی کے فلسفے پر مندرجۂ ذیل آیاتِ جمیلہ میں بلیغ و بصیرت افروز اشارے ملتے ہیں :

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍۙ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ

(القمر ۵۴ : ۵۴-۵۵) :

متّقی یا اہلِ آرزو بہشتوں اور نہروں میں ہوں گے، مقامِ صدق میں بڑے ہی ذی اقتدار بادشاہ کے پاس۔

اہلِ آرزو چونکہ اہلِ حسن و عشق ہوتے ہیں اور انہیں الحسن کی، جو ان کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے، طلب و جستجو ہوتی ہے، لہٰذا اُن کی جمالیاتی حِس زندہ و فعّال اور وہ اہلِ ذوق ہوتے ہیں۔ چنانچہ ربّ ذوالجلال والاکرام ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کی خاطر انھیں باغات و آبِ رواں میں رکھے گا۔ اس سے یہ جمالیاتی حقیقت معلوم ہوئی کہ باغات جو عبارت ہیں، سبزہ و گل، اشجار و اثمار اور رنگا رنگ طیورِ نغمہ سنج سے، نیز آبِ رواں جمالیاتی ذوق کی تسکین کے سامان ہیں۔ علاوہ بریں، اہلِ آرزو مقامِ صدّیقیت پر متمکن ہوتے ہیں، اس کے صلے میں وہ جنّت میں بھی مقامِ صدق پر فائز ہوں گے، جو عزیز و مقتدر بادشاہ کے پاس ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تقویٰ یا آرزوئے "دوست" جنّت و آبِ رواں اور مقامِ صدق و قربِ الٰہی ایک ہی سلسلے کی لاینفک کڑیاں ہیں، نیز یہ عظیم نعمتیں اہلِ آرزو کو سجدے میں ملتی ہیں۔

سجدہ اگر تذلّل و تضرّع، خشوع و خضوع اور بندگی کے اظہار و اعتراف پر دلالت کرتا ہے تو انکارِ سجدہ تکبّر پر، اور تکبّر میں دعوائے کبریائی و خدائی مضمر ہوتا ہے۔ چونکہ سجدہ جنّت و مقامِ صدق اور تقرّبِ الٰہی کا ذریعہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مقرّب بندے اس کی عبادت سے ہرگز تکبّر نہیں کرتے، بلکہ اس کی تسبیح کرتے اور اس کے آگے سربسجود رہتے ہیں (الاعراف ۷ : ۲۰۶)۔

بخلاف اس کے، عزازیلِ ناری نے اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے اس بناء پر سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے آدمِ خاکی سے بڑا ہے۔ اس تکبّر کی پاداش میں وہ ذلیل وخوار اور ملعون وگمراہ ہوا؛ نیز وہ ربِّ رحمٰن کی رحمت سے نااُمید ہو کر شر سرشت بن گیا اور اپنی اِن قبیح خصلتوں کے باعث ابلیس وشیطان کہلایا (البقرۃ ۲:۳۴؛ الاسراء ۱۷:۶۱)۔

چونکہ سجدہ وقُربِ الٰہی لازم وملزوم ہیں، اس لیے سجدہ کرنا شیوۂ عباد الرّحمٰن ہے۔ یہ سنّتِ پیغمبری ؑ ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک امتیازی صفت وشناخت یہ بتائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور رکوع وسجود کرنا سب کا شعارِ زندگی تھا اور آثارِ سجود ان کی پیشانیوں پر مُرتسم ونمایاں تھے۔ یہ صفت وشناخت اس حقیقت کی علامت ہے کہ آپؐ اور صحابۂ کرامؓ سب اللہ تعالیٰ کے مقرّبین، نفوسِ مطمئنّہ، اہلِ صدق وصفا اور اصحاب الجنّۃ تھے (الفتح ۴۸:۲۸)۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سجدہ انسان کی فطرت یا عبدیّت کا خاصّہ بھی ہے اور تقاضا بھی؛ اور اس کی تاثیر یہ ہے کہ اس سے وہ اپنے ربِّ رحمٰن کا بندہ ومقرّب، نیز صِدّیق ووارثِ جنّت بنتا ہے۔

الغرض عبادت اگر فطرتِ انسانی یا عبدیّت کا خاصّہ وتقاضا ہے تو صلوٰۃ اس کی احسن واکمل صورت ہے، اور سجدہ جوہرِ صلوٰۃ ہے، جس کا ثمرہ جنّت، مقامِ صدق اور تقرّبِ ربِّ جلیل وقدیر ہے۔

صلوٰۃ انفرادی۔ اجتماعی ہے:

دین کی طرح صلوٰۃ سے متعلق عموماً یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ وہ انفرادی ہے یا اجتماعی؟ ایک مکتبِ فکر کے نزدیک دین کی طرح صلوٰۃ انفرادی ہے۔ وہ اپنے موقف کے ثبوت

میں جو دلائل دیتا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دین تو اللہ اور اس کے بندے کے باہمی رشتے اور معاملے سے عبارت ہے، اس لیے نجی یا انفرادی ہے۔ جہاں تک میرے مشاہدہ و مطالعہ کا تعلق ہے، فلسفے اور تصوّف سے شغف رکھنے والے عموماً دین و صلوٰۃ کی انفرادی حیثیت کے قائل ہیں۔ فلسفے سے شغف رکھنے والے عموماً تصوریّت پسند (IDEALIST) ہوتے ہیں اور نظری زندگی کو عملی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ صوفی یا تصوّف میں دلچسپی رکھنے والے "تزکیۂ نفس" پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تزکیہ کا ذریعہ ذکر و مراقبہ اور ریاضت و مجاہدہ ہے۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ متقی و پاکباز اور عابد و زاہد بن کر اطمینانِ قلب اور تقربِ الٰہی حاصل کریں، اور اس کے نتیجے میں اولیاء اللہ اور اصحاب الجنّہ میں شامل ہو جائیں۔ ان کی رائے میں یہ دُنیا شرک و بت پرستی، فحشاء و منکر، ظلم و استحصال اور جرم و گناہ کی خاردار جھاڑیوں سے بھری پڑی ہے اور اس سے دامن بچا کر گزرنا اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا اگر محال نہیں تو از بس دشوار اور شکیب رُبا ضرور ہے، لہٰذا وہ ترکِ دُنیا کو کاروبارِ دنیا میں حصّہ لینے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ مُتصوّفانہ عقائد، مثلاً ترکِ دُنیا و نفس کُشی، رہبانیّت و خانقاہیّت اور زہد و فقر دین کو انفرادی ماننے والوں کے نظریات ہیں۔

تزکیۂ نفس کی غیر معمولی اہمیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر انسان عالم و حکیم، عارف و صالح اور شہید و صدّیق نہیں بن سکتا، لیکن تزکیۂ نفس کے لیے خانقاہیّت و رہبانیّت یا ترکِ دُنیا کو اختیار کرنا، انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے انتہائی مضرت رساں، بلکہ مہلک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ترکِ دنیا سے حقوق العباد سے تغافل و تجاہل لازم آتا ہے۔ ظاہر ہے انسان تارک الدُّنیا ہو جائے گا تو وہ ملک و ملّت کی سیاسی و اقتصادی، تعلیمی و تربیتی، ادبی و فنّی اور ثقافتی و عسکری زندگی میں دلچسپی اور عملاً حصّہ نہیں لے سکے گا۔ اس کے نتیجے وہ ملک کی ترقی و استحکام اور سالمیت و دفاع اور معاشرتی امن و سلامتی کے لیے اپنی ذمّے داریوں کو پورا نہیں کر سکے گا؛ نیز وہ اپنے ملک میں بالخصوص اور دوسرے ممالک میں بالعموم شرک و بت پرستی، فحشاء و منکر،

ظلم و استحصال، ناخواندگی و جہل، عدوان و ناانصافی، محکومی و غلامی، ناداری و مفلوک الحالی، محرومی و گدائی، تذلیل و تحقیرِ انسانی، ہر قسم کی عصبیت و فساد، نیز جنگ و جدال کے استیصال کے اہم ترین دینی فریضے کو ادا نہیں کرے گا، اور یہ قرآنِ مجید کی رُو سے تکذیبِ دین ہے۔ جو شخص گوشہ نشین ہو کر چاہے کتنی عبادت کرے، اگر وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کی خوشنودی اور اس کے بندوں کی فلاح و بہبود اور دُنیوی و اُخروی حسنہ کی خاطر سرطانی اداروں کے خاتمے کے لیے ان کے خلاف جہاد نہیں کرتا وہ اس کے بندوں کے لیے رحمت کیسے بن سکتا ہے؟ جو شخص دوسروں کے لیے رحمت نہیں بنتا، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتا ہے اور یہ ایسی محرومی ہے جو انسان کو اہلِ نار بناتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اپنا اور ربّ العالمین کے بندوں کے لیے رحمت بننا ہی اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی غایتِ حقیقی ہے۔

بخلاف اس دبستانِ فکر کے، دوسرا مکتبِ فکر دین و صلوٰۃ کی صرف اجتماعی حیثیت کو تسلیم اور اس کی انفرادی حیثیت سے انکار کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ دین کُل زندگی کو محیط ہے۔ دوسرے، انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے، لہٰذا وہ تمدنی یا عمرانی زندگی بسر کرنے پر عادۃً و حاجۃً مجبور ہے۔ علاوہ بریں، اس کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اسے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام ودیعت کیا گیا ہے اور وہ علم و حکمت اور ہنر و فن بھی رکھتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ اس کا نفسِ امّارہ خواہشات پیدا کرتا اور انسان کو دھوکا دینے کی خاطر ابلیسی شیطان سے مل کر وسوسہ اندازی و جالیاتی فریب کاری سے انہیں خوبصورت و دلکش بنا کر دکھانے اور شدید سے شدید تر کرنے میں شب و روز لگا رہتا ہے۔ انسان ایک تو حُسن و جنس اور دولت و حکومت پر مرتاہے، دوسرے، اسے اپنی خواہشات کو حسین ۔ جائز یا قبیح و ناجائز طریقے سے پورا کرنے کی آزادی بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی زندگی میں فساد برپا ہونے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ چنانچہ دین کا وظیفہ اِس فساد کا سدِّباب کرنا، معاشرے کی اصلاح کرنا اور ان سرطانی اداروں کا استیصال کرنا ہے، جو سرمایہ، قوت و اقتدار اور جاگیرداری و عملداری وغیرہ وغیرہ کے بل بوتے پر لوگوں کا استحصال کرنے، ان کے حقوق غصب کرنے، ان پر اپنا حکم

چلانے، ان کو اپنا محتاج و دست نگر اور محکوم و غلام بنانے، ان کی راہ مارنے، نیز ان کو اللہ کی راہ سے روکنے، گمراہ کرنے، مشرک و بت پرست اور جاہل و اہلِ نار بنانے کی خاطر زمین میں فساد برپا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ لوگوں میں اپنے بنیادی حقوق، عدل و احسان اور توحید و حق کا شعور زندہ و بیدار کرنا بھی دین کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دین کی نوعیت انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔

غور کریں تو یہ دونوں مکاتبِ فکر جزوی طور سے سچّے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دین حقیقت ہے اور حقیقت نہ کلیتاً موضوعی ہے نہ معروضی، بلکہ موضوعی۔معروضی (SUBJECTIVE — OBJECTIVE) ہے؛ اسی طرح دین نہ کلّیتاً انفرادی ہے نہ اجتماعی، بلکہ انفرادی۔اجتماعی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موقع و محل کی رعایت سے کہیں دین کی انفرادی اور کہیں اجتماعی حیثیت پر زور دیا ہے۔

(۱) دین کی انفرادی حیثیت : مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ دین، عبادت اور صلوٰۃ کی انفرادی حیثیت کی آئینہ دار ہیں :

۱) إِنَّنِىٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدْنِى وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكْرِىٓ ۝ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۴) :

میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی اِلٰہ (= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کر اور میرے ذکر (= یاد) کے لیے صلوٰۃ قائم کر۔

یہ آیۂ جمیلہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے رشتے کی انفرادی حیثیت پر دلالت کرتی ہے اور ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فردِ بشر کے ساتھ براہِ راست تعلّق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر انسان اس کا بندہ و پرستار بھی ہے اور پروردہ و فقیر بھی؛ اور اللہ تعالیٰ ہر بندے کا معبود و معروضِ حسن و عشق بھی ہے اور پروردگار و مالک بھی۔ توحید و اُلوہیّت انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ باہمی رشتۂ محبت پر دلالت کرتی ہے۔ زیرِ نظر آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ فردِ واحد سے

خطاب کرتا ہے کہ میری عبادت کر اور مجھے یاد کرنے کے لیے صلوٰۃ یا نماز قائم کر؛ اس لیے کہ میں ہی اللہ ہوں، جو جملہ صفاتِ حسنہ کا مالک ہے؛ اور میں ہی فقط تیرا معبود اور معروضِ حسن و عشق ہوں۔ اگر تو مجھ سے محبت کرے گا تو میں بھی تجھ سے محبت کروں گا اور اگر تو مجھے یاد رکھے گا تو میں بھی تجھے یاد رکھوں گا: دیکھیے کس محبت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے بندے سے خطاب کرتا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ٥ (البقرہ ۲: ۱۵۲): مجھے یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔

ظاہر ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ، جو اکبر و اعظم، عالی و متعال، رحمٰن و رحیم، وہّاب و غنی، کریم و صمد اور ربّ ذوالجلال والاکرام ہے، اور جس کی عظمت و کبریائی اور عزّت و قدرت کا اندازہ نہ لگایا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی بے قیاس نعمتوں کا شکر ہی ادا ہو سکتا ہے، اپنے جس بندے کو یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب و کامیاب، صاحب حسن و سرور اور عظیم انسان کون ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کا صلہ دُنیوی و اُخروی حسنہ اور جنت ہے تو اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد رکھنا اس سے کہیں بڑھ کر سعادت و کامیابی اور نعمتِ عظمیٰ ہے: وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (العنکبوت ۲۹: ۴۵): اور اللہ کا ذکر یا اس کا (کسی کو یاد رکھنا) بہت بڑی بات ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندے سے بے اندازہ پیار ہے اور اس پیار کی شدّت دیکھیے کہ اُسے اپنا مقرّب بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے حضور اس کی نظر میں رہے۔ اپنی اس مشیّت کا وہ اس سے انتہائی بلیغ و بصیرت افروز انداز میں اظہار بھی کرتا اور اس کا طریقہ بھی بتاتا ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ٥ (العلق ۹۶: ۱۹): اور سجدہ کر اور (اپنے معبود و مقصود اور معروضِ حسن و عشق کا) قرب حاصل کر۔

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ اُس نے مقصودِ حیات، معراجِ عبدیّت، غایتِ سجدہ اور تقربِ الٰہی کے فلسفے کو فقط دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اس نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ اس کی زندگی کی غایت و معراج یہ ہے کہ وہ الحسن کا، جو اس کا معبود و مقصود اور معروضِ حسن و عشق

ہے، مقرب بن کر اس کے حضور اس کی نظر میں رہے؛ نیز تقربِ الٰہی کا ذریعہ سجدہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ صلوٰۃ کی غایتِ حقیقی، جس کا ایک از بس حسین و ناگزیر رُکن سجدہ ہے، تقربِ الٰہی ہے؛ یعنی انسان کا اپنے اِلٰہ و ربّ کے قرب و حضور میں حسین زندگی کرنا ہے۔ دوسرے، اس فلسفۂ قرآن سے معلوم ہوا کہ عبدیت کا خاصّہ سجدہ ہے، جو انسان کے اِنتہائی تذلّل و انکسار اور خشوع و خضوع کا عملی مظاہرہ ہے اور عبودیّت کی اتھاہ پستیوں میں اُترنے سے عبارت ہے، اس کے اِلٰہِ جمیل اور ربّ ذوالجلال والاکرام کی نظر میں اتنا حسین و عزیز اور گرانقدر ہے کہ اس کے صلے میں وہ اسے رفعت بخشتا اور اپنے قریب کر لیتا ہے۔ ربِّ عرش کے قُرب کی عظمت و عُلُوِّ مرتبت کا اندازہ لگانا عقل و فکر اور متخیلہ و واہمہ کی رسائی سے وراء ہے۔ اصل یہ ہے کہ قربِ اِلٰہی ہی انسان کی معراج ہے اور اس کا ذریعہ سچّا سجدہ ہے، جو صلوٰۃ کا قلب ہے۔ اس سچّے سجدے کی تاثیر سے انسان میں لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کا حق الیقین پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سچّا مؤمن و موحّد بن جاتا ہے۔ سچّے مؤمن و موحّد کی صفت اور پہچان یہ ہے کہ اس کا سر ایک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر اللہ کے سامنے نہیں جھکتا، چاہے وہ کتنی برگزیدہ ہستی کیوں نہ ہو، قبر، آستانہ، مقام، آگ، پانی، شجر، حجر، ناگ، لنگور جیسی مخلوقات ہوں یا دیوی دیوتا وغیرہ وغیرہ؛ نیز فرعون، ہامان، قارون اور آزر ہوں یا اپنی نفسانی خواہشات۔ فلسفۂ سجدہ کا ماحصل یہ ہے کہ ایک سچّا سجدہ انسان کو ہزاروں جھوٹے سجدوں کے دُور رس منفی و مہلک اور رسواکُن و انسانیت سوز اثرات سے محفوظ و مصئون رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا مندرجۂ ذیل شعر اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۳) دین، عبادت یا صلوٰۃ کی انفرادی حیثیت میں مندرجۂ ذیل آیات سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا...... اَشَدُّ وَاَبْقٰى ٥

(طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴ تا ۱۲۷): اور جو کوئی میرے ذکر (= یاد، دھیان، نصیحت، قرآنِ مجید، صلوٰۃ) سے منہ موڑے گا تو اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا، اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔ (اپنے آپ کو اندھا پاکر) وہ عرض کرے گا: یا ربّ! دنیا میں تو میں بینا یا آنکھوں والا تھا، یہاں کیوں مجھے اندھا اُٹھایا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: (اس کا سبب یہ ہے کہ) اسی طرح تُو نے ہماری آیات کو جب تیری پاس آئی تھیں، بُھلا دیا تھا، اور آج تُو بھی اسی طرح بُھلایا جا رہا ہے؛ نیز اسی طرح ہم اُسے بدلہ دیتے ہیں جو حد سے گزر جاتا اور اپنے ربّ کی آیات کو دل سے تسلیم نہیں کرتا؛ اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

دین بلاشبہ کُل زندگی کو محیط ہے اور کُل زندگی کا مطلب انسان کی انفرادی۔اجتماعی اور دُنیوی۔اُخروی زندگی ہے۔یہی بصیرت افروز نکتہ محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ میں مضمر ہے۔ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور رکھنا انفرادی فعل ہے، اور اس سے اگر نفس کو اطمینان ملتا ہے (الرّعد ۱۳: ۲۸) تو اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کا صلہ دُنیا میں خوف و حزن، تنگیِ حیات کا کرب اور قلب کے اندھے پن کی صورت میں ملتا ہے اور آخرت میں بے بصری اور عذابِ شدید و مقیم کی شکل میں ملے گا۔

ب) دین کی اِجتماعی حیثیت:

انسان کا ایک رشتہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہے، جو اس کا خالق و رازق اور پروردگار و مالک (= ربّ) بھی ہے اور معروضِ حُسن و عشق اور معبود و مقصود (= اِلٰہ) بھی؛ اور دوسرا رشتہ اس کے بندوں کے حوالے سے ہے۔یہی مطلب حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ہے۔دین حقوق اللہ اور حقوق العباد سے عبارت ہے۔اسلام' اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے (المائدۃ ۵: ۳) وجہ یہ ہے کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے صحیح و جامع مفہوم اور ان کو عدل و احسان کے اصول کے مطابق احسن و اکمل طریقے سے ادا کرنے سے عبارت ہے۔مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ دین کی اجتماعی حیثیت کی آئینہ دار ہیں:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ...... وَکَانَ اللّٰہُ بِہِمْ عَلِیْمًا ۝ (النسآء ۴: ۳۶-۳۹) اور تم سب اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی شے کو

شریک نہ بناؤ۔ ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو، نیز رشتے دار اور بیکس و بے سہارا (= یتیموں) اور ناداروں اور محتاجوں (= مسکینوں) کے ساتھ، نیز قرب و جوار کے ہمسایوں اور دور کے ہمسایوں مسافروں اور ان سب کے ساتھ بھی جو تمھارے ملازم و محکوم ہوں، حسنِ سلوک کرو۔ بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا، جو مغرور رہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے! نیز ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بُخل کی تلقین کرتے ہیں (یعنی جو مال و دولت کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور لوگوں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کی وعظ و نصیحت کرتے ہیں)، اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ (تاکہ ایتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کی حکومت اور معاشرے کو خبر نہ ہو جائے)، اور ایسے کافروں یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کے لیے ہم نے رسوا کُن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ علاوہ بریں، وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنا مال و دولت لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں؛ وہ دراصل نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان (= یقینِ محکم) رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ (ایسا دراصل وہ شیطان کے جالیاتی فریب و رفاقت کی وجہ سے کرتے ہیں) اور جس شخص کا رفیق و ہم نشین شیطان ہوا، اُسے بہت بُری رفاقت میسر آئی (حُسنِ رفاقت تو دراصل نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین کی ہے، دیکھیے النساء ۴: ۶۹)۔ آخر ان پر کون سی قیامت گزر جاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے اُنھیں دیا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے؛ اور اللہ اس کا خوب علم رکھنے والا ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کُل اہلِ ایمان سے خطاب فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ..... لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳: ۱۰۲ تا ۱۰۳): اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مُسلم یا فرمانبردار ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو (یعنی فرقوں میں نہ بٹ جاؤ)۔ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم

پر ارزانی کی۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے قلب جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تمہیں (اس میں گرنے سے) بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تم پر عیاں کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (البقرہ ۲: ۲۰۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ) اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اسلام میں داخل ہونا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر، ان پر حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی قرآنِ حکیم کے اُصولِ عدل و انصاف کے مطابق احسن طریق سے ادا کرنا فرض ہے۔

ماحصلِ گفتگو یہ نکلا کہ دین انفرادی۔ اجتماعی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان پر انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرنا، اس سے اور اس کے بندوں اور دیگر مخلوقات سے محبّت کرنا، نیز سارے جہانوں کے لیے رحمت بن جانا لازم ہے۔ یہ دین کا تقاضا، فطرتِ انسانی کا خاصہ اور اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی غایتِ حقیقی ہے۔ چونکہ صلوٰۃ دین کی اساس اور عبادت کی احسن و اکمل صورت ہے۔ لہٰذا وہ انفرادی — اجتماعی ہے؛ اور اس کے تقاضوں کی نوعیت بھی انفرادی۔ اجتماعی ہے۔

تزکیہ

قُرآنِ مجید نے لذّتِ زندگی سے آشنا اور عذاب النّار سے محفوظ رہنے کا ایک آسان طریقہ بتایا ہے اور وہ یہ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۵) ؛ وہ شخص فلاح پا گیا، جس نے اپنا تزکیہ کر لیا اور اپنے ربّ کے نام کا ذکر کرتا اور صلوٰۃ ادا کرتا رہا، یعنی نماز باقاعدہ ادا کرتا اور اس کے تقاضے پورے کرتا رہا۔

تزکیہ اور فلاح بڑی اہم اور فکر انگیز اصطلاحاتِ قرآنی ہیں؛ ان کی صراحت کردی جاتی ہے۔ تزکّی یا تزکیہ کا مادّہ ز ک و ہے، جس کے اصل معنی افزونی یا نشوونما کے ہیں، مثلاً کھیتی، پودے، شجر وغیرہ کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا یا نشوونما پانا۔ تزکیۂ نفس کو قرآنِ مجید نے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب حسّی، قلبی، نفسی نظام کی تطہیر و تحسین کرنا؛ اس نظام میں نور و توانائی کا خزینہ جو قدرت کی طرف سے اس میں بالقوّۃ ودیعت کیا گیا ہے، یعنی جو جواہرِ قابل یا استعدادیں اُسے ودیعت کی گئی ہیں ان کو قوّت سے فعل میں لانا اور ان کی نشوونما کرنا ہے تاکہ وہ نظام حرکی بنے، اپنے نقطۂ کمال تک پہنچے اور اپنے فطری وظائف احسن طریقے سے سرانجام دینے لگے۔ تزکیہ سے قلب کی تحسین و تنویر ہوتی اور اس کا نور درجہ بدرجہ ترقّی کرتا رہتا ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔

محوّلۂ بالا آیۂ جمیلہ میں تزکیہ اور فلاح کی اصطلاحات کو جس ایجاز و بلاغت سے استعمال کیا گیا ہے، وہ اعجازاتِ قرآنی میں سے ہے۔ "فلاح" کا مادّہ ف ل ح ہے، جس کے معنی پھاڑنا ہیں۔ اس سے فلاحت (= کھیتی باڑی) اور فلّاح (= کسان) کے الفاظ نکلے ہیں۔ چونکہ کھیتی باڑی کرنے سے کسان کو پیداوار حاصل ہوتی ہے، اس لیے قرآنِ حکیم نے فلاح کو اصطلاحاً خیر و حسنہ اور کامیابی و نجات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تزکیہ سے ایک تو انسان اپنے جواہرِ مضمرہ (POTENTIALS) کو قوّت سے فعل میں لا کر ان سے استفادہ کرتا اور جمالیاتی ارتقاء کرتا ہے، جس سے اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے؛ دوسرے وہ کفرانِ نعمت کے زیانِ مسلسل اور تاریخی عمل کے منفی نتائج و عواقب سے محفوظ رہتا ہے۔ علاوہ بریں، تزکیہ سے تقویٰ پیدا ہوتا اور محبتِ الٰہی کی شمع فروزاں ہوجاتی ہے، جس سے جمالیاتی ثروت یا جمالیاتی سوز و ساز ملتا ہے جو غایتِ زندگانی ہے؛ نیز انسان کے دل میں الحسن والحق، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حسنُ المآب، مادّی و جمالیاتی ارتقاء اور لذّتِ زندگی و حسنِ انقلاب کی آرزو زندہ و فعّال ہوجاتی ہے۔ یہ ہے فلاح کی معنویّت۔

اس میں شک نہیں کہ تزکیہ تو فلاح کی پیش شرط (PRE-REQUISITE) ہے، لیکن تزکیہ کے حاصل سے استفادہ کرنا بھی تو مُزکّیٰ کے لیے ناگزیر ہے، ورنہ تزکیہ کا عمل لایعنی ثابت ہوگا۔ چنانچہ "ذکر اسمِ ربّہٖ" اور "صلوٰۃ"، جو محبتِ الٰہی کے بہترین مظاہر ہیں، فلاح کے دو احسن و اکمل ذرائع ہیں۔ چونکہ صلوٰۃ یادِ الٰہی کی احسن و اکمل صورت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم بلکہ اپنی ہر مخلوق پر اسے فرض قرار دیا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں انسان کے علاوہ دیگر جملہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز پڑھتی ہیں، لیکن یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ بہت کم محض اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے صلوٰۃ قائم کرتے اور سچے مُصلّین یا نمازی بنتے ہیں؛ یعنی جو صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے اور اس کے تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرتے اور اس کے فیوض و برکات سے مستفید ہو کر صالحین، شہدآء اور صدیقین بنتے ہیں۔

تزکیہ کے مفہوم کو ایک مثال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسان کو جب تک ایٹم یا ذرّے کی ماہیت کا علم نہ تھا، اُسے ذرّۂ ناچیز اور جزوِ لایتجزّٰی کہتے اور سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس نے غور و فکر اور تحقیق و تجربے سے اس کی ماہیت معلوم کر لی اور سائنس و ٹیکنالوجی یا علم و ہنر کے ذریعے اس کا تجزیہ کیا اور اس میں نور و توانائی کا خزینہ مضمر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ چنانچہ جن قوموں نے اپنے علم و ہنر اور سعی و جہد سے اس سے برق آسا روشنی اور قیامت خیز توانائی حاصل کر لی، وہ دوسری اقوام پر عسکری قوت و صولت، معاشیات و سیاست اور علم و ہنر میں سبقت لے گئیں اور ان کی قیادت اب ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس اعتبار سے نفسِ انسانی کی مثال بھی ذرّے کی سی ہے اور اس میں بھی نور و توانائی کا لامتناہی خزینہ بالقوہ مضمر ہے۔ اس خزینے کو قوت سے فعل میں لانا انسان کا کام ہے، جس کو ربّ کریم نے علم و حکمت اور ہنر و فن سکھایا ہے اور حسّی۔ قلبی۔ نفسی قوتیں عطا کی ہیں؛ لہٰذا اس خزینۂ نور و توانائی سے انسان اپنے تقوٰی و آرزو اور ایمان و عملِ صالح کے ذریعے اپنے حسّی۔ قلبی۔ نفسی یا باطنی نظام کو حسین و منوّر اور محکم و حرکی بنا سکتا اور اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکتا ہے۔ ایمان و عملِ صالح سے مراد ایمان بالحق،

تمیز بالحق، دید بالحق اور تفکّر بالحق کے علاوہ ذکرِ الٰہی، صلوٰۃ و زکوٰۃ، صوم و حج، انفاق بالعفو، عدل و احسان، تقویٰ و آرزو، عشقِ الٰہی، اتّباعِ رسولؐ، محبّت و تکریمِ انسانی وغیرہ ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تزکیہ سے حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام منیر و حرکی بنتا ہے تو اس کے نتیجے میں مزکّیٰ انسان کی سامعہ حسین و حرکی بن جاتی ہے اور اس میں حق بات سننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا ہو جاتی اور جھوٹ سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان میں حسن و حق کی باتوں کو گوشِ حق نیوش سے سننے کی پہلے طلب و جستجو اور پھر ریاض و مزاولت سے داعیہ و ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، جو اُسے صدّیق و شہید اور صالح یا صاحبِ حسن و سرور بنانے میں مؤثّر کردار ادا کرتا ہے۔ بخلاف اس کے، جو قوم سننا نہیں جانتی؛ نیز حسن و حق کی باتیں سننے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا دماغ و آرزو نہیں رکھتی، وہ بہری اور گونگی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی قوم نہ تو ان اقوام جیسی ہو سکتی ہے اور نہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کا مقابلہ ہی کر سکتی ہے، جن میں حق سننے اور قبولیتِ حق کی آرزو و استعداد پائی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بہری اور گونگی قوم پس ماندہ و کمزور رہ کر ترقّی یافتہ اقوام کی محتاج و دست نگر اور معاشی و عسکری، سائنس و ٹیکنالوجی اور سیاسی و ثقافتی لحاظ سے ان کی محکوم و غلام بن جاتی ہے، اور اس کا انجام ذلّت و مسکنت کے علاوہ ہلاکت و بربادی بھی ہوا کرتا ہے (الانفال ۸: ۲۱ و مواضع کثیرہ)۔

کسی فرد یا قوم کے بہرہ اور گونگا ہونے کا سبب باطنی نظام کے تزکیہ کا فقدان ہے۔ حِسّی نظام میں سے چونکہ سامعہ و باصرہ ہی حیاتِ انسانی میں نسبتاً زیادہ مؤثّر و اہم کردار ادا کرتی ہیں، لہٰذا جو قوم اپنے حِسّی نظام خصوصاً سامعہ اور باصرہ کا تزکیہ نہیں کرتی، اس میں حسن و حق کی باتیں سننے کی صلاحیت رہتی ہے نہ دماغ و آرزو، لہٰذا وہ سنے تو کیسے؟ وہ تو قرآنِ مجید کی اصطلاح میں شرّ الدّواب بن جاتی ہے (الانفال ۸: ۲۲)۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بہری، گونگی قوم عقل سے کام نہیں لیتی۔ قدرت کے قانونِ کفرانِ نعمت کی رُو سے جس نعمت سے کام نہ لیا جائے، وہ سلب کر لی جاتی ہے یا وہ بیکار و مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عقل جو حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام

کو کنٹرول کرتی ہے، مضمحل و کمزور ہو کر فعّال نہیں رہتی تو موضوعی۔ معروضی شیطان، جو اس موقع کی تلاش وتاک میں ہوتا ہے، فوراً ہی اس کا ناصح و دوست بن کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ شیطان کا پہلا کام عقلِ سلیم کو اس کے حسن و نور سے محروم کر کے طاغوتی بنانا ہوتا ہے۔ یہ طاغوتی عقل ہے جو سامعہ کو حُسن و حق کی باتیں سننے اور ان پر غور و فکر کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی اور انجام کار اسے حق نیوش رہنے نہیں دیتی اور غافل و ناکارہ بنا دیتی ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ انسان سماعت سے محروم ہو کر بہرا ہو جاتا ہے اور اگر پیدائشی بہرا ہو تو گونگا بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ قدرت کا طبیعی قانون ہے۔ طبیعی قانون کا زوج بھی ہوتا ہے، جسے مابعد الطبیعی قانون سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کا اطلاق ہمارے باطنی نظام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو قوم سننے کے فن اور ذوق سے بے بہرہ ہوتی ہے وہ معنوی طور سے بہری اور گونگی ہو جاتی ہیں۔ اسے قرآنِ حکیم شرّ الدوّاب سے تعبیر کرتا ہے، مثلاً سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ..... اَلَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝

(الانفال ۸: ۲۰ تا ۲۲): یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو (یا اے مسلمانو!) اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس سے سرتابی نہ کرو، حالانکہ تم (احکام و تعلیمات) سنتے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جنھوں نے کہا: ہم نے سُنا اور (حقیقت میں وہ دل لگا کر) سنتے نہیں (یعنی بہرے ہیں)۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین جاندار مخلوق وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

ظاہر ہے سننے، دیکھنے اور عقل سے کام لینے والے انسان ہرگز بہرے گونگے اور بے عقل بشر نما حیوانوں جیسے نہیں ہو سکتے۔ غور کریں تو سامعہ ربِّ کریم کی نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اس کی بدولت ہی اربابِ ذوقِ سمع، آواز و صدا، الفاظ و معانی اور شعر و نغمہ کے جمال و جلال اور حلاوت و دلکشی سے جمالیاتی لذّت و طرب، سوز و ساز، طمانیت و مسرّت، کیف و سُرور اور سرخوشی و مستی سے بہرہ مند ہوتے اور علم و حکمت اور ہنر و فن کا اکتساب اور ان میں کمال حاصل

کرتے ہیں؛ نیز وہ جمالیاتی صوتی مشاہدات، کلام الٰہی کی تلاوت اور حسن زندگی کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے بہرے، گونگے اور بے عقل بشر نما حیوان ان عظیم نعمتوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے، اور اس کے نتیجے میں جمالیاتی ثروت سے محروم رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ قرآنِ حکیم ہے جس نے تزکیہ اور سمع کی غیر معمولی اہمیت سے انسان کو آگاہ کیا، لیکن عبرت کا مقام یہ ہے کہ مسلم اقوام کو، جو قرآنِ حکیم پہ ایمان رکھنے کی مدعی ہیں، تزکیۂ نفس یا حسّی۔قلبی۔نفسی نظام کے تصفیہ و تطہیر اور نشوونما کی غیر معمولی اہمیت کا احساس و شعور تک نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری درسگاہوں میں تزکیۂ نفس کا کوئی انتظام نہیں۔ ہمارے ظلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ تزکیہ جو نصابِ قرآن کا جزوِ اعظم ہے، مسلم اقوام کے تعلیمی نصاب میں شامل تک نہیں۔ اس صورتِ حال کے ذمے دار سرطانی ادارے ہیں، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ان کے اِلٰہ و ربّ اور آخری کلامِ الٰہی قرآنِ مجید سے دور اور اس کے فیوض و برکات سے محروم رکھا ہوا ہے؛ نیز انہوں نے ہی اپنی جمالیاتی فریب کاری سے قرآنِ حکیم کے نصاب کو مسلم اقوام کے نظامِ تعلیم سے خارج کر کے ان کو اس ناقابلِ تلافی زیانِ مسلسل سے غافل بنا رکھا ہے۔

سامعہ کے بعد باصرہ ہماری زندگی میں ازبس اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس ارشادِ ربّانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۷۲) یعنی جو شخص اس دنیا میں اندھا بن گیا، وہ آخرت میں بھی اندھا اُٹھے گا اور راہ گم کردہ ہوگا۔ ہمیں یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ "اندھے" سے مراد دُنیا میں نورِ بصیرت سے محروم یا قلب کا اندھا ہے اور آخرت میں نورِ بصارت و بصیرت دونوں سے محروم شخص ہے۔ جیسا کہ الحج کی اس آیۂ جلیلہ سے ثابت ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝ (الحج ۲۲: ۴۶):

یعنی حقیقت میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ قلب اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔"

قلب کے اندھا ہونے کے متعدد اسباب ہیں، لیکن اس کا بنیادی سبب ذکرِ الٰہی سے تغافل و صرفِ نظر ہے، جیسا کہ اِس ارشادِ الٰہی سے ثابت ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ... اَلْيَوْمَ تُنْسٰى ۝

(طٰہٰ ۲۰ : ۱۲۴-۱۲۶) : جو شخص میرے "ذکر" سے منہ موڑے گا، اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے تو وہ کہے گا : پروردگار! مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے جبکہ دُنیا میں تو میں آنکھوں والا یا بینا تھا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : جس طرح ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تُو انہیں بھلا دیتا تھا، اسی طرح آج تجھے فراموش کیا جا رہا ہے"۔

آیاتِ الٰہیہ خصوصاً قرآنِ حکیم کو جھٹلانے کا انجام اس قدر بھیانک، عبرتناک و کربناک اور دیرپا ہو اور پھر خاص کر مسلمان نہ صرف اس سے صرفِ نظر کریں بلکہ اس کو زینتِ طاقِ نسیاں بنا دیں، یہ ان کا ظلم و جہل ہے، جس کے ذمّے دار وہ خود بھی ہیں اور سرطانی ادارے بھی۔

اصل یہ ہے کہ جو فرد اور قوم اللہ تعالیٰ کو بھلا دے، اُسے اللہ تعالیٰ بھی بھلا دیتا، اس سے صرفِ نظر کرتا اور اسے راندۂ درگاہ بنا دیتا ہے، اس لیے کہ یہ اس کا قانونِ احترامِ آرزو ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بھلا دے، اس سے زیادہ حرماں نصیب و نامراد، ناکام و محروم اور مغضوب و گمراہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، چاہے وہ بے حساب مال و دولت، قوت و سطوت، حکومت و اقتدار، عالمگیر شہرت و صولت اور شان و شوکت کا مالک کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص اہلِ نار میں سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ نفسِ مطمئنہ اور صاحبِ حزن و سرور نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہم قرآنِ مجید سے معلوم کر چکے ہیں کہ صرف نفسِ مطمئنہ ہی جنّت میں جائے گا۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہے کہ جس شخص کا نفس مطمئن نہیں، وہ ہرگز جنّت میں نہیں جائے گا، بلکہ جو شخص دنیا میں قلب کا اندھا اور رہینِ خوف و حزن ہو گا، اس کی منزلِ آخر جہنّم ہے جو شر المآب ہے۔

یہ کتنی تلخ و عبرتناک واقعیت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ میں بھاری اکثریت ان نام نہاد مسلمانوں کی ہے، جو قرآنِ حکیم سے دُور و مہجور اور غافل و بے نیاز، نیز اس کے معانی و مطالب، اور اوامر و نواہی اور اصول و تعلیمات اور قوانین و حدود سے نابلد یا کم آگاہ ہیں۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کی بھاری اکثریت قرآنِ مجید کی عملاً منکر اور قلب کی اندھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بھلا رکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ مغضوب و گمراہ ہے؛ اور مسلم اقوام میں اتحاد و اتفاق اور باہمی اخوت و

مساوات کا فقدان ہے، نیز ان پر سرطانی ادارے مسلط ہیں، جن کی ریشہ دوانیوں کے باعث ان میں تشتت وافتراق، فتنہ وفساد اور منافرت ومخاصمت کا بازار گرم ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کی پس ماندگی و ضعیفی، ذلّت ومسکنت، محتاجی و دست نگری، مظلومی ومقہوری اور ضلالت وسرطان زدگی کی بنیادی وجہ اس کی خُدا فراموشی، اُس سے دوری اور قُرآنِ حکیم سے مہجوری ہے۔ چنانچہ ہم جیسی مغضوب وگمراہ اقوام ہی کو ربِّ جبّار وقہّار باندازِ تنبیہہ ارشاد فرماتا ہے: وَكَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ اَسْرَفَ ...... اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۲۷)؛ یعنی اسی طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والے اور اپنے ربّ کی آیات پر ایمان نہ لانے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب شدید تر اور زیادہ دیرپا ہے۔

یہاں یہ سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی "قلبی بے بصری" کا کچھ علاج ہے کہ نہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ہر بیماری کی طرح اس کا بھی علاج ہے اور وہ ہے تزکیہ۔ اصل یہ ہے کہ قلب کی جملہ بیماریوں کا یہی مؤثّر علاج ہے، لیکن تزکیہ کے متعدّد طریقے ہیں جن میں سے ایک سیاحت بالحق بھی ہے۔ اس کا مطلب بامقصد سیر و سیاحت ہے، یعنی سیر و سیاحت سبق آموزی اور عبرت حاصل کرنے کے لیے ہونی چاہیے؛ اور اس کا بہترین طریقہ تاریخی المیہ کا مشاہدہ ہے، اور یہ دیدۂ عبرت نگاہ اور قلبِ بینا سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ قُرآنِ حکیم نے یہ تاریخی۔نفسیاتی حقیقت اپنے منفرد انداز میں اس طرح بیان کی ہے: وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ ...... تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ (الحج ۲۲ : ۴۲ تا ۴۶)؛ یعنی (اے میرے نبیؐ) اگر یہ (کفّار ومشرکین) تمھیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوحؑ، عاد اور ثمود کی قومیں، نیز قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ اور اہلِ مدین بھی تو اپنے رسولوں کو) جھٹلا چکے ہیں؛ پھر موسیٰؑ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ پہلے میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر ان کی گرفت کی۔ اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی (ہلاکت آفریں) تھی؟ کتنی بستیوں کو ہم نے تباہ کیا جو ظالم تھیں، اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنویں بیکار پڑے ہیں اور کتنے ہی محل کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے

نہیں (یعنی کیا انہوں نے سیاحت بالحق نہیں کی) کہ اس (مشاہدہ بالحق) سے ان کے قلوب (= دلُ دماغ) عقل سے کام لینے والے یا ان کے کان سننے والے ہو جاتے؟ اصل میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ قلوب یا دل و دماغ جو سینوں کے اندر ہیں، وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

سیاحت سے متعلق عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کا مقصد محض سیر و تفریح اور جمالیاتی حظ حاصل کرنا یا زیادہ سے زیادہ ثقافتی معلومات حاصل کرنا ہے، لیکن ان آیاتِ قُرآنی سے معلوم ہوا کہ سیاحت کی غایتِ حقیقی عبرت پذیری ہے، جس سے حتّٰی۔ قلبی۔ نفسی نظام کا تزکیہ ہوتا ہے؛ اگرچہ صحتِ بدنی و قلبی؛ نیز جمالیاتی لذّت و مسرّت اور علم و حکمت حاصل کرنے کی خاطر احسن الخالقین کی حسین دنیا کی سیر و سیاحت کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سننے کی طرح دیکھنا بھی ایک از بس اہم فن ہے۔ یہ فن خُلق و کردار اور عادت کی تہذیبُ تحسین، علم و حکمت کی تحصیل کے لیے، نیز جمالیاتی حِس کو فعّال کرنے اور جمالیاتی مشاہدہ سے جمالیاتی ثروت (= جمالیاتی حظ و مسرت، جمالیاتی ٹھنڈک، اور جمالیاتی سوز و غم) حاصل کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تاریخی عمل جو اقوامِ عالم کے عروج و زوال کا عامل و محرّک ہے، اس کے مطالعہ سے اس تاریخی واقعیّت سے آگہی ہوتی ہے کہ مسلم اقوام کے انحطاط و تنزّل کا ایک سبب، یہ بھی ہے کہ اُسے فنِ سمع و بصر کی غیر معمولی اہمیت کا شعور نہیں رہا اور اس کا ثبوت ان کا نظامِ تعلیم ہے، جس میں نصابِ قُرآن رائج نہیں اور تزکیہ اس نصاب کا جزوِ اعظم ہے؛ نیز ان کی درسگاہوں میں، خواہ سیکولر ہوں یا "دینی"، فنِ سمع و بصر سکھانے کا معقول اور سائنٹفک بندوبست نہیں۔ یہ تعلیمی زبوں حالی، جو نتیجہ ہے قُرآنِ حکیم سے مہجوری و دُوری کا، اس کے ذمّے دار سرطانی ادارے ہیں، جن کی ہر مُسلم قوم میں علمبرداری ہے اور زمامِ اقتدار و اختیار ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اس عبرتناک تعلیمی صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ ایک تو مسلمان من حیث الامّۃ حُسنِ خُلق و کردار کے حامل نہیں رہے؛ دوسرے ان میں اتحاد و اتّفاق کے بجائے تشتّت و افتراق ہے۔ تیسرے، مسلم معاشرے اسلامی نہیں بلکہ سرطانی ہیں۔ چوتھے، ان میں شرحِ خواندگی غیر مسلم ترقی یافتہ اقوام کی بہ نسبت غایت درجہ کم ہے۔ پانچویں،

اُمّتِ مُسلمہ میں اکثریت پس ماندہ و مفلوک الحال اور ذوق و ہنر سے محروم لوگوں کی ہے۔ چھٹے، مُسلم اقوام بھی دیگر اقوامِ عالم کی طرح جمالیاتی اِرتقاء کے مفہوم و اہمیّت سے کم آشنا اور غافل ہیں۔

سمعی و بصری مشاہدے کی غیر معمولی اہمیّت اس قدر رہو اور قرآنِ مجید اس پر شاہد ہو اور پھر مُسلم اقوام اس سے غافل ہوں، یہ بڑی عبرتناک واقعیّت بلکہ المیہ ہے۔ ظاہر ہے اگر مُسلم اقوام اپنی اسی روش پر قائم رہیں اور ان میں سننے، دیکھنے اور سوچنے کا ذوق و داعیہ اور حوصلہ پیدا نہ ہوا تو اُن کا انجام بھی ویسا ہی عبرتناک ہوگا جیسا ان سے پہلی قوموں کا ہوا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت یا قانون غیر مبدّل ہے۔ اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ، جو ہم پر بھی صادق آتا ہے، قابلِ غور ہے:

فَهَلْ يَنْظُرُونَ...... إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۝ (فاطر ۳۵: ۴۳ تا ۴۴): اب کیا لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی روا رکھا جائے؟ یہی چاہتے ہیں تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے اور اللہ کی سنّت یا طریقے کو کبھی ٹلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور کہیں زیادہ طاقتور تھے؟ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کو عاجز کر سکے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید نے ان قوموں اور بستیوں کی ہلاکت و بربادی کا جابجا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اپنے حسّی، قلبی، نفسی نظام سے کام نہیں لیا۔ بالفاظِ دیگر، انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی باتوں کو گوشِ حق نیوش سے سنا، نہ اپنے سے پہلی مقہور و مغضوب قوموں کی ہلاکت و بربادی کے آثار کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا، اور نہ ان کے عبرتناک انجام کے عوامل و محرّکات کو معلوم کرنے کی خاطر عقل سے کام ہی لیا۔ اس کا ایک بنیادی سبب ربّ عزیز و قدیر نے سورۂ فرقان میں یہ بتایا ہے کہ "جو لوگ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بنا لیتے ہیں، وہ چارپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوتے ہیں" (الفرقان ۲۵: ۴۳ تا ۴۴)۔

اسی سورے میں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد قومِ نوحؑ، عاد، ثمود، کنویں والوں اور ان کے درمیانی عرصے کی بہت سی نسلوں کی ہلاکت و بربادی کی طرف عبرت انگیز اشارے کیے ہیں۔ آخر میں اس بستی کی بھی نشاندہی کی ہے جس پر تباہ کن بارش ہوئی تھی (الفرقان ۲۵: ۳۵ تا ۴۰)۔

یہ نکتہ نہایت فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ ربِّ کریم حسّی نظام یا حواسِ خمسہ میں سے صرف سامعہ و باصرہ کا اور نظامِ قلب میں سے عموماً عقل و فکر کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں حکمتِ الٰہی یہ ہے کہ خُلق کی تشکیل و تعمیر، علم و حکمت، ہنر و فن، سائنس و ٹیکنالوجی کے اکتساب اور ایجاد و اختراع، تحقیق و مطالعہ، تزکیہ و جالیاتی اِرتقاء، نیز سمعی و بصری مشاہدہ کرنے میں سامعہ، باصرہ اور عقل و فکر ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید غیر مبہم الفاظ میں انسان کو متنبّہ کرتا ہے کہ ربّ العزّت ان لوگوں کو نجاست میں غرق کر دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے (یونس ۱۰: ۱۰۰)۔ اس کے نتیجے میں قلب مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر مفلوج و ناکارہ ہو جاتا ہے اور اپنے وظائف سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا تو قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اس پر طبع (= چھاپ) اور ختم (= مُہر) لگ جاتی ہے اور وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ چونکہ امراضِ قلب اور ان کے اسباب و عقل سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، لہٰذا اگر ان کی تفصیل مقصود ہو تو تمیز القرآن کی تصنیف جالیات (قرآنِ حکیم کی روشنی میں، طبع دوم، ص ۱۰۷ تا ۱۵۰، ۱۹۸۴ء، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد) میں مفصّل بحث مل سکتی ہے۔

قلب سے متعلق یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ انسان کے باطنی یا حسّی قلبی۔ نفسی نظام میں اہم ترین مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور ان تینوں نظاموں میں ہم آہنگی و موزونی اور اعتدال و توازن قائم رکھنا اور ان کو احسن طریق سے چلانا، نیز باطنی نور کی تکمیلِ مسلسل یا انسان کا جالیاتی اِرتقاء کرنا، اس کا بنیادی وظیفہ ہے۔ اس بنا پر تزکیۂ قلب کی بنیادی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ باطنی نظام میں قلب مؤثر و عامل کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اس لیے اس کے تزکیہ سے دیگر دو نظاموں کا بھی بہت حد تک تزکیہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس موقف کی تائید اس

ارشادِ نبویؐ سے بھی ہوتی ہے کہ قلب بگڑ جائے تو نظامِ زندگی بگڑ جاتا ہے اور قلب سنور جائے تو زندگی سنور جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تزکیہ کے نتیجے میں قلب کا نور اپنا اِتمام کر لیتا ہے تو اس کی ضو و توانائی سے سامعہ و باصرہ، عقل و فکر، جمالیاتی حِس، ضمیر اور نفسِ لوّامہ، الغرض سب حواس اور قوائے باطنی حسین و منیر اور قوی و حرکی بن جاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ تزکیۂ قلب کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ جدید حقیقت کا ایک اساسی نقص یہ ہے کہ یہ تزکیۂ قلب کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہے، لہٰذا اسے قابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے نتیجے میں مغربی معاشرے میں اخلاقی، جنسی برائیوں اور بیماریوں اور فحشاء و منکر کی گرم بازاری ہے؛ نیز اس کے منفی اثرات مشرقی اقوام میں بھی اپنی نمود رکھتے ہیں۔ اس کا ایک اصل اور کچھ فروعی اسباب ہیں۔ اصل سبب تو معاشرتی سرطانیت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلم ممالک میں بالخصوص رعایا کی قیادت' نیز اقتدار و حکومت سرطانی اداروں کے ہاتھ میں ہے، جو ان کو اپنے قبضے میں رکھنے کی خاطر نہ تو احکامِ الٰہیہ کو کُلّی طور سے نافذ' اور نہ نصابِ قرآن کو اپنے نظامِ تعلیم میں شامل ہی کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، مغربی اقوام کی محکوم و غلام رہنے کے باعث مُسلم اقوام ابھی تک ذہنی غلامی کی شکار ہیں، اور علومِ جدیدہ، خاص طور پر سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی حیرت انگیز ترقّی سے حد درجہ مرعوب اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ عُمر کا کون سا حصّہ تزکیہ کے لیے موزوں ترین ہوتا ہے؟ اس کا جواب ہے، عہدِ طفولیّت؛ لیکن تزکیہ کا عمل مہد سے لحد تک جاری رہنا چاہیے چنانچہ بچوں کو سننے، دیکھنے اور سوچنے کا فن سکھانا، ان کے قلب کی تطہیر کرنا، اس میں قوائے مضمرہ کو قوت سے فعل میں لانا اور ان کے حسّی، قلبی، نفسی نورٗ کا اِتمام و ارتقاء کرنا، والدین، معاشرے اور حکومت کی اوّلیں اہم مشترکہ ذمّے داری ہے۔ دلیل یہ ہے کہ سامعہ و باصرہ اور قلب تینوں خلقِ انسانی کا سانچہ بنانے میں اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ سُننے، دیکھنے، سوچنے اور عقل سے کام

لینے والے ہی اپنے خلق کی تہذیب وتحسین کر سکتے اور خوش خلق وصاحبِ کردار اور نفوسِ مطمئنّہ و اہلِ آرزو یا اصطلاحِ قرآنی میں صالحین، شہداء اور صدیقین بن سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں کیمرے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر، سینما، سمعی بصری سائنسی کھیلوں کی ایجادات واختراعات سے سمعی بصری مشاہدے کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے؛ لہٰذا حکومت، اہلِ علم وقلم اور معاشرے کے جملہ طبقات کی مشترکہ ذمّے داری ہے کہ وہ افرادِ قوم خصوصاً بچّوں میں سُننے، دیکھنے، سوچنے اور عقل سے کام لینے کی صلاحیت پیدا کرنے اور انہیں یہ فن سکھانے کا معقول واحسن بندوبست کریں، ساتھ ہی قبیح وفحش اور مخرّبُ الاخلاق تصویروں، فیچر فلموں، ڈراموں، رسالوں، کتابوں؛ نیز عریاں ونیم عریاں مناظر اور نظاروں سے بھی ان کو باز رکھنے کا سخت انتظام اور نگرانی کریں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تزکیہ کہاں کیا جائے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ تزکیہ کے اہم ترین مقامات کون سے ہیں؟ تزکیہ کے اہم ترین مقامات چار ہیں: (۱) گھر (۲) درس گاہ (۳) مسجد (۴) مجلس۔ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ بچّوں کے تزکیہ اور ان کے خُلق کی تشکیل وتعمیر کی اہم ترین و اوّلین جگہ گھر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولاد کے تزکیہ کی اوّلین ذمّے داری ماں باپ کی ہے، لیکن اعزّہ واقارب اور حکومت ومعاشرہ کو بھی اس اہم فریضے سے بری الذمّہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غور کریں تو یہ فریضہ معاشرتی نوعیت کا ہے، اس لیے کہ بچّے قوم بلکہ جملہ اقوام کی امانت ہوتے ہیں۔ بچّوں کے تزکیہ سے متعلق ان کی یہ نفسیاتی حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ "والدین بچّوں کے آئیڈیل یا مثالی انسان ہوتے ہیں"؛ لہٰذا لڑکا باپ کی طرح اور لڑکی ماں کی طرح بننا چاہتی ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ اگر والدین کو اپنے بچّوں سے سچّی محبت ہے اور وہ ان کو عظیم اور صالح بنانے کی آرزو رکھتے ہیں تو ان کی اپنی زندگی حسین، سچّی اور صالح یا مثالی ہونی چاہیے تاکہ اُسے دیکھ کر بچّوں میں بھی اپنی زندگی ان کی طرح حسین، سچّی اور صالح بنانے کی آرزو نشوونما پائے۔ یہاں قدرت کے قانونِ آرزو کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے۔ اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار کی

آزادی ودیعت کی ہے اور وہ اس کا اس درجہ احترام کرتی ہے کہ اس کی سعی و جہد اور اپنی حکمت کے مقتضٰی کے مطابق اس کی آرزو پوری کر دیتی ہے، بشرطیکہ وہ سچی ہو۔ آرزو چار چیزوں سے معتبر یا سچی بنتی ہے: عزم بالجزم، بمطلوبہ محنت و مشقت، جہتِ صالحہ اور مطلوبہ شے بھی آرزومند کے لیے ممکن الحصول بھی ہو۔ یہاں اس امر کی بھی توجیہہ کر دی جاتی ہے کہ بچپن کیوں تزکیہ کا موزوں ترین عہد ہوتا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بچوں میں جسمانی اور باطنی یا قلبی قوائے مضمرہ کے نشو و ارتقاء کرنے، نیز بیرونی سمعی و بصری اثرات قبول کرنے کی استعداد بدرجۂ غایت پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں، بچپن ہی خُلق کی تشکیل و تعمیر کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر والدین کا اپنے حُسنِ گفتار و کردار اور اعمال و عاداتِ صالحہ سے بچوں میں حُسنِ خُلق کی شعوری و غیر شعوری آرزو کی نشو و نما کرنے میں ہمیشہ سنجیدہ و کوشاں اور آرزومند رہنا ضروری ہے۔ قدرت اس دُہری آرزو کو پورا کرنے میں والدین اور بچوں دونوں کی مطلوبہ مدد کرتی ہے۔

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ والدین کو سب سے پہلے بچوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو، جو ان میں بالقوۃ ودیعت ہوتی ہے، فعل میں لانے کی سنجیدہ و حکیمانہ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ والدین کو بچوں کے سامنے باقاعدگی سے صلوٰۃ قائم کرتے، قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے، زکوٰۃ دیتے، العفو یا حسبِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے، اس کی مخلوقات سے محبت اور ان سے عدل و احسان کرتے؛ نیز ان کے لیے ہر ممکن ایثار و قربانی کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان عبادات کی اہمیت و افادیت کو بچوں کی ذہانت کے مطابق دلچسپ و حکیمانہ اور ہو سکے تو حکایاتی انداز میں ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ علاوہ بریں، ان کو ان کی سمجھ کے مطابق صلوٰۃ کے تقاضوں اور قرآنِ مجید کی تعلیمات و احکام اور اوامر و نواہی سے آگاہ کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔ صلوٰۃ کے تقاضوں سے کم آگاہی کا نتیجہ ہے کہ قریب قریب سب مسلم اقوام میں زکوٰۃ کا نظام اس کی صحیح اور کامل صورت میں قائم نہیں۔ لہٰذا ان میں کفالتِ اجتماعیہ کے نظام کا فقدان ہے، لیکن سرمایہ داری، جاگیرداری اور

سود کا دی کے نظام قائم ہیں۔ یاد دہانی کے طور پر یہاں کفالتِ اجتماعیہ کی مجملاً تشریح کر دی جاتی ہے۔ اس کا مطلب رعایا کے رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے، علاج معالجہ کرانے اور علم و ہنر سیکھنے کا معقول و آبرومندانہ بندوبست کرنا اور ان کو روزگار مہیا کرنا ہے۔ علاوہ بریں، بے روزگاری، معذوری، بیماری، پیری، حادثات وغیرہ وغیرہ صورتوں میں افرادِ معاشرہ کی احسن و مکرم کفالت کرنے کی ذمّے داری بھی حکومت کی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کفالتِ اجتماعیہ کا انتظام کرنا حکومت کی اہم ترین بنیادی ذمّے داری ہے، لیکن اس کا نظام قائم کرانے اور رکھنے کے لیے نُطق و قلم وغیرہ سے جہاد کرنا رعایا کے اہم ترین فرائض میں سے ہے (الماعون ۱۰۷ : ۱ تا ۷)۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ اولاد کی تعلیم و تربیت، تہذیبِ اخلاق، جسمانی نشوونما، مادّی ترقّی اور جمالیاتی ارتقاء کی طرف خصوصی توجّہ دینا والدین کا ایسا اہم و مقدّس فریضہ ہے، جسے حُسن و خوبی کے ساتھ سرانجام نہ دینے کا انجام بچّوں کی دُنیوی و اُخروی ناکامی و محرومی کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ بڑی ہی عبرت انگیز و قابلِ غور حقیقت ہے کہ عصرِ حاضر میں والدین کی گوناگوں مصروفیات و مشاغل، نیز اپنے پدری و مادری فرائض سے کم آگاہی و تغافل کے سبب نئی نسل محاسنِ اخلاق، جمالیاتی ارتقاء، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے کم آگاہ و بے پروا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ خود آگاہ ہے نہ خُدا آگاہ بلکہ فحشاء و منکر کی دلدادہ، نیز احساسِ تنہائی و محرومی اور آتشِ خوف و حزن کے کرب میں مبتلا ہے؛ اور مقامِ انسانیت سے پھسلتی ہوئی حیوانیت کے قعرِ مذلّت میں گرتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال انتہائی تشویش ناک اور نوعِ انسانی کی بقا و سلامتی کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ اہلِ نظر کو اس کا احساس ہے اور اس کے علاج کے متعلق متفکّر بھی ہیں۔ غور کریں تو اس صورتِ حال کا مداوا یہ ہے کہ دُنیا میں معاشرتی سرطانوں یا سرطانی اداروں کا حسنِ انقلاب کے ذریعے استیصالِ کُلّی، اسلام کی تحریکِ توحید و رحمۃٌ لّلعالمینی کا احیاء، احکامِ الٰہیہ کا نفاذ اور ان پر عمل درآمد ہے۔ اس کی دوسری صورت تزکیۂ اولاد ہے، جو والدین کی اہم ترین ذمّے داری ہے اور جس سے انہیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر عہدہ برآ ہونا ناگزیر ہے۔

تزکیہ کا دوسرا اہم مقام درسگاہ ہے، جس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس تاریخی واقعیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کے معلّمِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تاریخ ساز و عہد آفرین ہجرت کر کے یثرب میں ورودِ مسعود فرمایا، جس نے مدینۃ النبی ہونے کا شرفِ بے مثال حاصل کرنا تھا تو بلا تاخیر مسجدِ نبویؐ تعمیر فرمائی اور اسے درسگاہ بنا دیا۔ اسے عالمِ اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ یا یونیورسٹی بننے کا شرف حاصل ہوا۔ آپؐ طالب علموں کو قرآنِ حکیم کے نصاب کے مطابق تعلیم و تربیت دینے لگے۔

قرآنِ حکیم سے دُوری و مہجوری کا نتیجہ ہے کہ بہت کم اس حقیقت سے آگہی رکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے بھی تعلیم و تربیت کا کوئی نصاب دیا ہے؟ اگر دیا ہے تو وہ کیا ہے؟ حق کی طلب و جستجو ہو اور تعصب کی عینک اُتار کر قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم کا مطالعہ کریں تو اہلِ علم و نظر کا اس نتیجے پر پہنچنا یقینی ہے کہ وہ آدمی کو صاحبِ دل و ذمّے دار شہری، خوش خلق، مؤمن و صالح، عالم و حکیم، شہید و صدّیق اور امام الصّالحین بنا دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اس آخری و محفوظ کلامِ الٰہی میں چار مقامات پر نصابِ تعلیم کا ذکر آیا ہے: سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اس سلسلے میں جو دُعا مانگی تھی، اُسے نقل کر دیا ہے۔ آپ کی دُعا تھی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا..... وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ (البقرہ ۲:۱۲۹) یعنی اے ہمارے ربّ! ان لوگوں میں انہیں سے ایک رسول مبعوث فرمانا جو انھیں تیری آیات سنائے، اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا ہی قوّت و اقتدار والا اور حکمت والا ہے۔

یہ بڑا ہی بصیرت افروز و حکیمانہ نکتہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جس نصابِ تعلیم کی دُعا مانگی تھی، اس میں "تزکیہ" کو آخر میں رکھا گیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کا جو نصابِ تعلیم دیا ہے، اس میں ایک تو "تزکیہ" کو تلاوتِ آیاتِ الٰہیہ کے فوراً بعد دوسرے مقام پر رکھا ہے؛ نیز علومِ نو کی تعلیم کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ بقرہ ہی میں ربِّ حکیم فرماتا ہے: كَمَا أَرْسَلْنَا

فِيكُمْ رَسُولًا...... مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ٥ (۲: ۱۵۱) : یعنی ہم نے تمہارے درمیان تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ تمہیں کچھ (یعنی علم کی نئی باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے (نیز دیکھیے آلِ عمران ۳: ۱۶۴؛ الجمعۃ ۶۲: ۲)۔ "تزکیہ" کو چوتھے مقام سے دوسرے مقام پر لانے سے مقصود انسان کو اس ادبس اہم حکیمانہ نکتے سے آگاہ کرنا ہے کہ علم وحکمت اور ہنر کے اکتساب کے لیے تزکیہ ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔

یہ کتنی تلخ اور عبرت انگیز حقیقت ہے کہ ایک تو پاکستان سمیت کسی بھی مسلم ملک کے نظامِ تعلیم میں نصابِ قرآن رائج نہیں، دوسرے "تزکیہ"، جو علم وحکمت اور ہنر کے اکتساب کے لیے انتہائی ضروری ہے، کسی بھی ملک کے نظامِ تعلیم میں شامل نہیں۔ میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اُمّتِ مسلمہ کی قرآنِ مجید سے دُوری و مہجوری ہے۔ مسلمان کہتے تو ہیں کہ قرآنِ مجید علم وحکمت کا سرچشمہ، مکمل ضابطۂ حیات، نور وہدایت اور شفا ہے، لیکن عملاً مانتے نہیں۔ اس صورتِ حال کے ذمّے دار سرطانی ادارے ہیں، جو مسلم وغیر مسلم ممالک پر مسلط ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ نوعِ انسانی کے معلّمِ اعظم اور پیغمبرِ اعظم وآخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چند برسوں کے اندر اندر کافر و مشرک، فاسق و فاجر، ظالم و جاہل، سرکش و بے علم، وحشی و غیر مہذّب اور رہزن و جنگجو قبائل کا ایسے احسن طریقے سے تزکیہ کیا کہ ان میں علم وحکمت، عرفان و معرفت، فنون و علومِ نو، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور حُسنِ حیات و انقلاب کی آرزو زندہ و فعّال ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں وہ مہذّب و صاحبِ کردار، عادل و محسن، حلیم و کریم، صادق و راستباز، عالم و فاضل اور حکیم و ہنرمند یا قرآنِ مجید کی زبان میں صدّیق و شہید اور صالح بن گئے۔ ربّ ذوالجلال والاکرام کے یہ بندے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے، جنہوں نے اسلام کی تحریکِ توحید کو، جو دراصل تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی ہے، عالمگیر و ہمہ گیر بنا دیا۔ علاوہ بریں، انہوں نے قرآنِ مجید کے اوامر و نواہی اور احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اسلامی معاشرے کو اخوّت و محبّت، آزادی و مساوات اور امن و

سلامتی کی جنّت بنا دیا۔ دوسرے، وہ اپنے علم، حکمت، جمال و جلال، حسنِ خلق و کردار، عدل و احسان، حق و صداقت، جود و سخا، ایثار و قربانی اور محبت و غمگساری، نیز جہاد بالقرآن کے ذریعے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو مسخر اور ان کی قیادت کرنے کے قابل ہو گئے۔

بہر حال، گھر کے بعد بچوں کے تزکیہ کی دوسری اہم جگہ درسگاہ ہے، چاہے سکول ہو یا مدرسہ، کالج ہو یا یونیورسٹی۔ اس میں ایک تو علمی ماحول ہوتا ہے اور دوسرے بچوں کو اس حقیقت کا احساس و شعور ہوتا ہے کہ وہ وہاں تحصیلِ علم و ہنر کے لیے آتے ہیں اور یہ احساس و شعور پیدا کرنا اساتذہ کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔ تیسرے، بچوں میں نقّالی و مسابقت کا داعیہ پایا جاتا ہے، اور درسگاہ اُنہیں اس کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ ان کے ذوق و شوق کو تیز تر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چوتھے، اساتذہ بھی والدین کی طرح بچوں کے آئیڈیل یا مثالی انسان ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی طرح عالم و فاضل بننے کی آرزو ان کے دلوں میں پیدا ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پانچویں، کئی جماعتوں پر مشتمل سینکڑوں ہم جماعت و ہم مدرسہ طلباء کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرنے، ان کے ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے، میل جول رکھنے، تبادلۂ خیالات کرنے اور امتحانات دینے سے طالب علموں میں نظم و ضبط، اتحاد و اتفاق، اجتماعیت، اخوت و محبت، مساوات و یکجہتی، احترامِ انسانی، آزادیِ تقریر و تحریر اور ترقی کرنے کی اہمیت کا شعور بیدار ہونے کے بکثرت امکانات ہوتے ہیں، بشرطیکہ درسگاہ میں تزکیہ نصاب کا جزوِ لاینفک ہو اور اساتذہ مزکّی و صالح ہوں اور انہیں اپنی پیشہ وارانہ ذمّے داریوں کا احساس و شعور ہو۔ چونکہ ان چیزوں کا ہماری درسگاہوں میں قریب قریب فقدان ہے، لہٰذا اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ہماری تعلیم و تربیّت غایت درجہ ناقص اور اس کا معیار انتہائی پست ہے۔

تزکیۂ نفس کا تیسرا مقام مسجد ہے، جو اس اعتبار سے غایت درجہ اہم ہے کہ یہ انسان کے اِلٰہ جلیل و کریم اور ربّ سُبحان و قدوس کا مقدّس مقام اور اس کے انوار و تجلّیات کا مہبط ہے، جس میں فجر سے عشاء تک اوقاتِ معیّنہ میں صلوٰۃِ پنجگانہ با جماعت قائم کی جاتی ہے، نیز اس

میں نمازی ذکر و فکر بھی بکثرت کرتے ہیں، اور قرأتِ قرآنِ مجید بھی سنتے ہیں۔ اس سے اہلِ آرزو کے قلوب کی تطہیر ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں ان کے حسّی۔قلبی۔نفسی نظام میں ان گنت ملکات (یعنی POTENTIAL) جو بالقوّۃ مضمر ہوتے، ان کو قوّت سے فعل میں لانے کے امکانات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان سے وہ اپنی طلب و جستجو اور سعی و جہد کی کیفیت و کمیّت کے مطابق فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ علاوہ بریں، مسجدُ جمالیاتی۔نفسیاتی لمحات" کی وقوع پذیری کا بہترین مقام ہے۔ جمالیاتی۔نفسیاتی لمحہ کیا ہے؟ اس کی مجملاً تشریح کر دی جاتی ہے۔

قدرت نے اِنسان کا باطنی نظام حسین و منوّر اور زندہ و صالح بنایا ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ جب تک نفس لذّتِ موت سے آشنا نہیں ہو جاتا، یہ زندہ رہتا ہے، اور اس میں قبولیتِ حق اور توبۃ النّصوح کرنے کی استعداد باقی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح کاہل و بے عمل اور نحیف و نزار قوم کو مُردہ کہتے ہیں، جس میں حُسن و حق، حیات و حسنہ اور آزادی و حسنِ انقلاب کی آرزو اس کی نفسانی خواہشات کے بارِ گراں تلے دب کے رہ گئی ہو، اسی طرح، اُس جمالیاتی حِسّ، ضمیر، نفسِ لوّامہ یا قلب کو مردہ کہتے ہیں، جس میں اپنا وظیفہ یا وظائف سرانجام دینے کی استعداد و آرزو غایت درجہ نحیف و مفلوج ہو گئی ہو۔ الغرض، قلب چاہے کتنے خطرناک و مہلک نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو، اس کے شفایاب، حسین و منوّر اور صالح و فعّال ہونے کا "امکان" موت سے پہلے تک ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ جس "آن" یہ امکان واقعیّت میں بدل جائے اور قلب میں حُسنِ انقلاب وقوع پذیر ہو جائے، اس آن کے لیے ہم نے "جمالیاتی۔نفسیاتی لمحے" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ جمالیاتی۔نفسیاتی لمحہ ہے جس میں "چور کو ولی اللہ" مجرم و گناہ گار صالح و محسن، ظالم و مُشرک عادل و موحّد اور اہلِ نار صاحبِ حُسن و سُرور بنتا ہے۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ہ (الاسراء ۱۷: ۷۸) یعنی صبح کا قرآن مشہود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ ہنگامِ سحر فضائے کائنات اور اہلِ ایمان و آرزو کے قلوب کی فضا بھی مطہّر و طیّب اور حسین و منوّر ہوتی ہے، لہٰذا صلوٰۃ الفجر و

میں قرآنِ عظیم، جو حسن و نور ہے، اُن پر اپنا معنوی جلوہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو صلوٰۃ اہلِ حسن و آرزو کے لیے قرۃ العین بنتی ہے؛ دوسرے اس جلوۂ معنوی سے ان پر قرآنِ مجید کے حقائق و دقائق، مطالب و معارف اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں؛ تیسرے، ان کے دلوں میں عشقِ الٰہی کی شمع فروزاں ہوتی ہے؛ فروزاں ہو تو خورشید عالم تاب بنتی ہے۔ چوتھے، اہلِ حسن و آرزو "احسان" کے مقام شاہدیت پر متمکن ہوتے ہیں، جو دید و رضوانِ "دوست" کا حسنُ المقام ہے؛ پانچویں، اہلِ حسن و آرزو کے نور کا اتمام یا جمالیاتی ارتقار ہوتا ہے۔

یہ حقیقت تو مسلمان تسلیم کرتے ہیں کہ مسجد واقعی تزکیہ کا حسنُ المقام ہے، کیونکہ وحی و تنزیل، تاریخ اور احادیثِ طیبہ و آثار بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں، لیکن بہت کم اس راز سے آگاہ ہیں کہ اب مسجد دار التزکیہ کیوں نہیں رہی؟ اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں آرزوئے تزکیہ ہی نہیں رہی۔ دوسرے فقدانِ آرزو کی علتِ فاعلی معاشرتی سرطانیت ہے، جس کا خاصہ آرزوئے تزکیہ کو ہلاک کرنا ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ مسلم اقوام سرطان زدہ ہیں اور ان پر سرطانی ادارے مسلط ہیں۔ اس دعوے کا ایک زندہ ثبوت یہ ہے کہ کسی بھی مسلم ملک میں احکامِ الٰہیہ یا قوانینِ قرآن نافذ نہیں۔ اگر جزوی طور پر نافذ بھی ہیں تو ان کے ساتھ آمرانہ، سیکولر یا عسکری احکام بھی نافذ ہیں، حالانکہ قرآنِ عظیم اور دینِ اسلام کا اصل الاصول لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ہے۔

اس کلمۂ جلیلہ میں "لا" علامت ہے، فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری اداروں اور ان کے احکام و قوانین اور اقتدارِ مطلق اور حاکمیتِ اعلیٰ کے ابطال و استیصال کی۔ بخلاف اس کے "اِلَّا" علامت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفاتِ حسنہ اور توحیدِ ربوبیت و اُلوہیت اور اس کی حاکمیتِ اعلیٰ اور اقتدارِ مطلق کے اثبات کی۔ چونکہ لَا اور اِلَّا ضدین ہیں اور اجتماعِ ضدین محال ہے، لہٰذا سرطانی ادارے اپنی بقا و سلامتی، حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ اور قوت و صولت کی خاطر ایک تو احکامِ الٰہیہ کو نافذ نہیں کرتے، دوسرے، وہ قرآنِ حکیم پر ہر گوشۂ حیات کے دروازے

بند کر دیتے ہیں۔ تیسرے، آزری ادارہ دیگر سرطانی اداروں کے استحکام و بقا اور حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کی خاطر تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے آیاتِ قرآنی کی ایسی تفسیر و تشریح کرتے ہیں کہ حق و باطل، توحید و شرک، عدل و ظلم، خیر و شر، حسنہ و سیئہ، سود و زیاں، منافع و ربوٰ، حلال و حرام اور کامیابی و ناکامی میں امتیاز کرنا ازبس دشوار ہو جاتا ہے۔ ان سرطانی اداروں کی جالیاتی فریب کاریوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں حسن و حسنہ، رحمت و مغفرت، حیاتِ محض حسنِ انقلاب اور اپنے نور کے اتمامِ مدام یا جالیاتی ارتقاء کی آرزو مردہ ہو چکی ہے؛ اور وہ قرآنِ مجید کی روح اور مسجد و صلوٰۃ کی اہمیت اور تقاضوں سے بالخصوص قریب قریب ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ معاشرتی سرطان یا سرطانی ادارے ہیں، جنہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں اور جالیاتی فریب کاریوں سے اُمتِ مسلّمہ کو قرآنِ عظیم سے دُور و مہجور، دین سے بیگانہ، نیز حلاوتِ ایمان، لذتِ حیات اور محبت و یادِ الٰہی سے ناآشنا کر رکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں قدرت نے اپنے قانونِ مجازات و احترامِ آرزو کی رُو سے اُمتِ مسلّمہ سے اقوامِ عالم کی قیادت چھین لی اور اسے ذوقِ سمع و بصر اور عقلِ سلیم، نیز جمال و جلال، حسنِ زندگی، حسنِ مآب، حسنِ انقلاب اور مادی ترقی و جالیاتی ارتقاء کی آرزو سے محروم کر کے نحیف و نزار، مُردہ و پس ماندہ، محکوم و غلام اور ذلیل و خوار بنا دیا ہے۔

یہ سوال تیرِ نیم کش کی طرح مسلمانوں کے دلوں میں پیوست ہے کہ

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

اس خطرناک و عبرتناک انگیز صورتِ حال کے ذمّے دار معاشرتی سرطان اور سرطانی ادارے ہیں اور اس کا اب ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے:

معاشرتی سرطانوں اور سرطانی اداروں کا اِستیصال بذریعہ حسنِ انقلاب!

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآنِ عظیم کے فلسفۂ آرزو کی رُو سے معاشرتی حسنِ انقلاب کی ایک پیش شرط بھی ہے اور وہ ہے آرزوئے حسنِ انقلاب؛ اور یہ تزکیہ کی غایتِ حقیقی بھی ہے؛ نیز تزکیہ کا بہترین حسن المقام مسجد اور احسن و اکمل ذریعہ حسنِ صلوٰۃ کا قیامِ مدام ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ نمازی کو اپنے تزکیہ کی خاطر باقاعدہ طور سے صلوٰۃ قائم کرنا اور اس کے تقاضوں کو حتی الوسع پورا کرنا، نیز اپنے خُلق کو صبغۃ اللّٰہ (= رنگِ الٰہی یا صفاتِ الٰہیہ) سے مزیّن کر کے صالح و خوش خُلق، صاحبدل و صاحبِ کردار، عادل و مُحسن، صادق و امین اور دوسروں کے لیے اور اپنے لیے رحمت بن جانے کی سعی و جہد کرتے رہنا چاہیے۔ اپنے لیے رحمت بن جانے کا مطلب نفسِ مطمئنّہ بننا ہے۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے نفسِ مطمئنّہ ہی جنّت کا وارث ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ تزکیہ کلیدِ جنّت ہے، لہٰذا اس کی غیر معمولی اہمیّت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مندرجۂ ذیل آیاتِ جمیلہ سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشّمس ۹۱: ۷، تا ۱۰)؛ یعنی نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم، جس نے اس کا تسویہ کیا (یعنی اس کے نظامِ کُلّی (حسّی، قلبی، نفسی) کے عناصرِ ترکیبی میں ہم آہنگی و موزونی پیدا کی) پھر اسے اس کے فجور (یعنی حد سے گزرنے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا اختیار و داعیہ) اور (اس کے نقیض و ضد) تقوٰی (= اپنے آپ کو ضرر و زیان سے محفوظ رکھنے کا اختیار و داعیہ) سے اسے فطرۃً آگاہ کر دیا۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور برباد و ناکام ہوا جس نے اسے (اپنے گناہوں کے بارِ گراں تلے) دبا دیا۔

عصرِ حاضر جسے بجا طور سے سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کا عہد کہا جاتا ہے، اصل میں خوف و حزن کا دور بھی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اہلِ دُنیا امیر ہوں یا غریب، معاشرتی سرطان ہوں یا مظلوم و محروم عامۃُ النّاس، سب رہینِ خوف و حزن ہیں، بجز صدّیقین، شہداء اور صالحین کے جو نفوسِ مطمئنّہ یا اہلِ حزن و سرور ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دُنیا میں خوف و حزن کی فضا قائم کرنے، افرادِ نسلِ انسانی کو خدا فراموش و خدا ناشناس اور خود فراموش و خود ناشناس بنانے، نیز طانیتِ قلب، سوز و سازِ محبّت، حلاوتِ ایمان و لذّتِ زندگی جسنِ و جمالیاتی ثروت، آرزوئے الٰہ و حسنِ المآب اور تمنّائے حُسنِ انقلاب سے محروم رکھنے والے سرطانی ادارے ہیں۔ علاوہ بریں، یہ

معاشرتی سرطان جو خود بھی سَمَندرسرشت اور اہلِ نار ہوتے ہیں، دوسروں کو بھی اپنے ظلم و استحصال، جبر و تشدّد اور قوّت و سطوت سے اپنے جیسا سَمَندرسرشت و اہلِ نار بنانے میں کوشاں رہتے ہیں، لہٰذا جب تک ان کا اِستیصال نہیں ہوتا، بنی آدم آزاد و خوشحال، صِدّیق و شہید اور صالح و اہلِ حسن و سُرور نہیں بن سکتے۔ الغرض "تزکیہ کے لیے آرزوئے تزکیہ ناگزیر ہے"۔

اب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "مجلس" تزکیہ کے سلسلے میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟

یہ شعری مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ

صُحبتِ صالح تُرا صالح کُند
صُحبتِ طالح تُرا طالح کُند

یہ مُسلّمہ حقیقت ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے، اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ "آدمی اپنی صُحبت سے پہچانا جاتا ہے"۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ مجلس جس قسم کے اصحاب پر مشتمل ہوگی، وہاں اسی قسم کی اچھی یا بری باتیں ہوں گی، نیز وہاں نفسیاتی لمحات بھی اسی قبیل کے ہوں گے، یعنی حسین و قبیح۔ چنانچہ اہلِ مجلس اگر صالح اور اہلِ حُسن و سُرور ہیں تو ان کی باتیں اور مشاغل بھی حسین ہوں گے اور ان کے حُسنِ اثر سے اہلِ مجلس کے دلوں میں حُسن و حسنہ، حیاتِ محض اور حُسنِ انقلاب کی آرزو کے نشو و ارتقا نیز جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کا اِمکان بھی ہوگا۔ اِس امکان کو "اِمکانِ تزکیہ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں دین، حُکماء اور مُعلّمینِ اخلاق نے ہر زمان و مکان میں بُری صحبت سے محترز و گریزاں اور ہراساں و دُور رہنا اور صالح صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اہلِ حُسن و سُرور کی صحبت اختیار کرنا حکمت ہے اور "حکمت خیرِ کثیر ہے"، اس لیے کہ اس سے "جمالیاتی ثروت" ملتی ہے۔

قُرآنِ مجید کی رُو سے اولیآءُ اللہ، یعنی اہلِ حُسن و سُرور اور انعام یافتہ عظیم انسانوں کے چار گروہ ہیں، جو حقیقت میں افرادِ نسلِ انسانی کے بہترین رفیق و دوست ہیں اور وہ ہیں: نبیّین[۴]، صِدّیقین، شُہدآء اور صالحین؛ اور ان کی صحبت و رفاقت ہی دُنیوی و اُخروی زندگی کے لحاظ سے نعمتِ

حُسنیٰ و عظمیٰ ہے (النسآء ۴ : ۶۹) ۔ اس حقیقت کا اعادہ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور ان کی بعثت کے ساتھ ہی نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے ، لہٰذا اب اس دنیا میں صرف صدّیقین، شہدآء اور صالحین کی رفاقت و صحبت ہی متیسر آسکتی ہے ۔ چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے ہی عظیم کامیاب اور انعام یافتہ انسانوں کی صحبت و رفاقت اختیار کی جائے ، جس میں تزکیۂ نفس، حُسنِ انقلاب، حُسن و حسنہ، حیاتِ محض اور اپنے معروضِ حسن و عشق کے قُرب و حضوری اور دید و رضوان کی آرزو کے اِحیا اور جالیاتی نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کے بکثرت امکانات ہوتے ہیں ۔

اس کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ تزکیہ کے زیرِ بحث چاروں مقامات نظامِ تعلیم و تربیّت میں غیر معمولی اہمیّت رکھتے ہیں ، جسے عملاً تسلیم کرنا لازم ہے ، اس لیے کہ تزکیہ صلوٰة کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے ، اگرچہ اس کا خاصّہ بھی ہے ۔

حُسنِ صلوٰة

حُسنِ صلوٰة کی اہمیّت و غایت کا مسئلہ ہماری دُنیوی و اُخروی زندگی کے لحاظ سے سب مسائلِ زندگی سے زیادہ اہمیّت رکھتا ہے ، لیکن انسان کے ظلم و جہل کا یہ حال ہے کہ وہ اسے بہت کم اہمیّت دیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بحر و بر میں فساد اپنی نمود رکھتا ہے اور سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کے ظلم و استحصال ، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بنی نوعِ انسان کی زندگیاں رہینِ خوف و حزن ہیں ، نیز ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کی بجلیاں ایٹمی بموں اور ہتھیاروں میں بند رستاخیز لانے کے لیے ایک اشارے کی منتظر ہیں ۔ حُسنِ قلب و نورِ عقل و فکر کے فُقدان کے سبب انسان ان سے خوف بداماں تو ہے اور بچنا بھی چاہتا ہے ، لیکن اپنی عقلِ عیّار اور شیطان کے جالیاتی دھوکوں کے سبب اس راز سے آشنا ہی نہیں کہ اس جوہری رستاخیز سے محفوظ و مصوؤن رہنے کا

ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے: "آرزوئے حُسن"۔ آرزوئے حُسن سے مراد ہے: الحسن، حُسنِ یقین و عمل، حُسنِ حیات، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حُسنِ آزادی، حُسنِ انقلاب اور حُسنِ جہانِ زندگی (= جنّت) کی آرزو؛ جس کو پورا کرنے کا احسن و اکمل ذریعہ ہے:

حُسنِ صلوٰۃ

حُسنِ صلوٰۃ سے مراد کیا ہے؟ قرآنِ عظیم کی زبانِ مُطہّر سے سنیے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝

(طٰہٰ ۲۰ : ۱۴) : بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں ؛ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ؛ لہٰذا میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے صلوٰۃ قائم کر۔ یہ آیۂ جلیلہ حُسنِ عبادت و صلوٰۃ کے فلسفے کی مظہر ہے۔ اس کا اعجاز یہ ہے کہ یہ گلہائے الفاظ کا گلدستہ اور معانی کا گلستانِ بیکراں ہے۔ اس کا ہر لفظ قرآنِ مجید کی ازبس اہم اصطلاح ہے۔ ایسی اصطلاحات کی مختلف مقامات پر وضاحت کر دی گئی ہے، لہٰذا یہاں لفظ "اللہ" کی مزید صراحت کر دی جاتی ہے:

اللہ کا صحیح اور سچا تصور اور عقیدہ ہی اصلِ دین و ایمان ہے۔ جس زمان و مکان میں بھی یہ تصور غلط ہوا یا حق میں باطل کی آمیزش ہوئی تو عقلِ سلیم نہ رہی اور فکر راہِ مستقیم سے بھٹک کر مختلف سمتوں میں نکل کر سرگرداں ہو گئی۔ عقل و فکر کی محرومیِ حُسن و نور اور گمراہی و سرگردانی کے نتیجے میں دین میں غلوّ و بدعات، مذاہب اور فرقے؛ نیز مختلف مکاتبِ فکر و فلسفہ پیدا ہو گئے۔ ان سے اولادِ آدم میں شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اوہام و ظنون اور تشتت و افتراق ایسی سرطانی بیماریاں پھیل گئیں۔ ادیانِ عالم کی تاریخ کے مطالعے سے اس اصلِ عظیم کا سراغ ملتا ہے کہ ان سرطانی بیماریوں کا ذمّے دار فرعونی ادارہ تھا، جس نے اللہ تعالیٰ کے تختِ حاکمیت پر خود بیٹھنا اور اپنا حکم چلانا چاہا۔ اس سرطانی ادارے نے رعایا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی خاطر تین ادارے قائم کیے، جو فرعونیت کے اجزائے لاینفک ہیں اور وہ ہیں:

ہامانی، قارونی اور آزری ادارے۔ فرعون تو آمر یا مستبد و مطلق العنان حکمران ہوتا ہے اور براہِ راست لوگوں پر حکم چلاتا ہے؛ لیکن باقی تین ادارے بالواسطہ طور سے رعایا پر اپنا حکم چلاتے، ان کا استحصال کرتے اور فرعون سے مالی مراعات و مفادات اور مناصب و اعزازات حاصل کرتے ہیں۔ یہ فرعونی حکومت کے معاون و مددگار ہوتے ہیں اور اس کی خاطر رعایا کو ان کے انسانی حقوق سے محروم کرتے، ان پر ظلم و ستم اور جور و جفا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ عموماً دین یا اللہ تعالیٰ کے نام پر کرتے ہیں، لہٰذا اس سلسلے میں اہم ترین کردار آزری ادارہ ادا کرتا ہے جس سے مراد جھوٹی دینی پیشوائیت ہے۔ اصل یہ ہے کہ فرعونیت، ہامانیت، قارونیت اور آزریت قرآنِ عظیم کی تلمیحی علامات ہیں، جو فکر انگیز و بصیرت افروز ہیں۔ ان کی مختصراً صراحت کردی جاتی ہے:

فرعونیت سے مراد ایسا حکمران سرطانی ادارہ ہے جو احکامِ الٰہیہ کے بجائے اپنے احکام چلاتا ہو، لہٰذا یہ استبدادیت و مطلق العنانیت اور ادّعائے خدائی کی علامت ہے۔

ہامانیت علامت ہے فرعونی حکومت کے معاون و مددگار اور منافق وکاسہ لیس منتظمین و حکّام، وزراء و امراء، عمائدینِ سلطنت اور عسکری منصب داروں کی۔

قارونیت علامت ہے جاگیرداری و سرمایہ داری نظام کی، نیز سود خوری و استحصال، انسانی حقوق کے سلب و نہب، اکتناز و احتکار اور بُخل و تکاثر کی۔

آزریت علامت ہے باطل مذہبی پیشوائیت یا علماء و مشائخِ سوء کے مذہبی سرطانی ادارے، نیز شرک و بت پرستی اور بدعت و غُلوّ فی الدین کی۔

ہمیں یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ چاروں سرطانی و استحصالی ادارے ہیں، جو دین و انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان چاروں اداروں کی بقا کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ رعایا کو شرک و بت پرستی اور غُلوّ فی الدین اور بدعات کے ذریعے خوگرِ محکومی و غلامی بنایا جائے۔ چنانچہ آزری سرطانی طبقے نے اس مقصد کی خاطر تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے طاغوتی فن ایجاد کیے۔ تاویل بالباطل کے ذریعے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غیر اللہ کو شریک

بنا دیا اور ان کی پرستش و بندگی کرنے اور کرانے لگے۔ اس سے لوگ شرک و بت پرستی کو عبادتِ الٰہی اور ثواب سمجھ کر کرنے لگے۔ بقول علامہ اقبال

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قُرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دینِ توحید میں شرک کی آمیزش اس طرح ہوگئی جس طرح دودھ میں چینی کی ہوتی ہے، اور جو لوگ موحِد تھے مشرک و بُت پرست بن گئے۔

تسمیہ بالباطل بھی ابلیس کا گمراہ کُن وفریب دہ فن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زندۂ مردہ، موہومہ یا واقعی برگزیدہ ہستی سے ایسی صفاتِ الٰہیہ منسوب کرنا اور اسے ان کا مالک سمجھنا، جو نہ تو اس میں ہوں اور نہ اس کے مقدور ہی میں ہوں۔ مثال کے طور سے کسی برگزیدہ ہستی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا، اوتار، خالق و مدبرِ کائنات، شریکِ کاروبارِ خدائی؛ نیز اسے عالم الغیب؛ حیّ وقیّوم، سمیع وبصیر، داتا یا رازق و پروردگار، حاجت روا و مُشکل کُشا، دستگیر و مددگار، کارساز و حبیب اور حافظ و ضامن بنا کر دکھانا اور اس عقیدے کو دین و ایمان کی بنیاد قرار دینا۔ الغرض، اسم بے مُسمّیٰ کو اسم بامُسمّٰی بنانا عبادت ہے تسمیہ بالباطل سے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے طاغوتی فنون سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے حقیقی عقیدے میں باطل کی آمیزش ہوئی تو دین میں غُلو پیدا ہوا، اور اس کے نتیجے میں اوہام وظنون، بدعات و عدوان اور شرک و بُت پرستی کی راہیں ہموار ہوگئیں اور لوگوں نے انہیں تقربِ الٰہی کی راہیں سمجھ کر ان پر چلنا شروع کر دیا اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دُور اور بہت دُور ہوتے چلے گئے؛ اس سے دُور ہونے کا مطلب ہے: اوّل، انسان کا اپنے اِلٰہ و ربّ سے؛ دوسرے، اپنی ذات سے اور تیسرے، اپنی منزلِ مقصود سے دُور ہونا اور ان کو فراموش کر دینا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی دو بنیادی صفاتِ حسنہ ہیں: اِلٰہ اور ربّ۔ (۱) اِلٰہ کا مطلب مندرجۂ ذیل آیۂ کریمہ سے یہ مستنبط کیا جاسکتا ہے: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا جایاتی اصطلاح

میں معروضِ حسن و عشق: اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ (الفرقان ۲۵: ۴۳؛ الجاثیۃ ۴۵: ۲۳)؛ کیا تم نے اس شخص کی نفسیاتی و عملی کیفیات پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ کیا تم ایسے شخص کے کاموں کے نگران ہو سکتے ہو؟

خواہش کا مطلب دُہرا ہے: نفسانی خواہش اور معروضِ خواہش (OBJECT OF DESIRE)، یعنی خواہش کی چیز یا ایسی چیز جس کی نفس خواہش کرے۔ مثال کے طور سے' زر، زن، زمین وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے محبت، محبتِ الٰہی سے شدید تر ہو جائے تو وہ نفس کی الٰہ بن جاتی ہیں۔ انسان ان سب کو یا کسی ایک کو اپنا مطلوب و محبوب اور معبود و مقصودِ زندگی سمجھ کر اس کو حاصل کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی پروا کیے بغیر جرم و گناہ، ظلم و استحصال اور ناانصافی و عدوان کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی بلا سوچے سمجھے اور برضا و رغبت اطاعت کرتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت و رویّے کو قرآنِ حکیم اپنی زبان میں ہوائے نفس کو اپنا الٰہ بنانا کہتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک انسان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے کرنی چاہیے، اس لیے کہ وہ اور صرف وہی اس کا حقیقی الٰہ ہے: یعنی معروضِ حسن و عشق یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے (البقرۃ ۲: ۱۶۵)۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ چونکہ الٰہ و رب ہے، لہٰذا حاکمیتِ اعلیٰ اسی کو سزاوار ہے اور وہی اور صرف وہی اپنے بندوں پر اپنا حکم چلانے کا مستحق و سزاوار ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری کوئی ہستی اس کے بندوں پر اپنا حکم چلانے کی مجاز ہے نہ سزاوار۔ یہی مطلب ہے اِن آیاتِ جلیلہ کا: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف ۱۲: ۴۰)؛

اے قید خانے کے رفیقو! کیا طرح طرح کے بہت سے ارباب (= خدا و رازق اور مالک و حاکم) بہتر ہیں یا ایک اللہ جو یکتا و غالب ہے۔ اس کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ محض اسمائے بے مسمیات ہیں، یعنی محض نام ہی نام ہیں اور ان میں ناموں کے معانی یا صفات نہیں پائی جاتیں۔ یہ بے معنی نام تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے یونہی رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی (یعنی یہ نام بے معنی و بے سند ہیں)۔ فرماں روائی و حاکمیتِ اعلیٰ فقط اللہ کے لیے ہے، اور کسی کے لیے نہیں ہے۔ اسی کا حکم ہے کہ اسی کی عبادت کرو، کسی اور کی نہ کرو۔ یہی دینِ حق ہے یعنی یہی صحیح شعارِ زندگی ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت سے) آگہی نہیں رکھتے۔

محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ کو اگر فلسفۂ توحید کی روح قرار دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان میں توحیدِ ربوبیت و اُلوہیت کو ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان میں عقل و طبعِ سلیم دونوں کو متاثر کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے انسان کو اس کے فطری تقاضائے عبودیت کے حوالے سے اپنے نفس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ اس کی حقیقی آرزو کیا ہے؟ کیا وہ اپنی روزی، نشوونما، حاجت روائی، مشکل کشائی، کشادگیِ زیست، مراد برآری، ترقی؛ نیز جان و مال وغیرہ کی حفاظت کیلیے طرح طرح کے آقاؤں، مالکوں اور حاکموں کو چاہتا ہے، جو خود اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے بندے، محتاج و دست نگر اور سائل و گدا ہیں؛ یا فقط ایک ربّ العالمین کو جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ، وحدہٗ لاشریک، جبّار و قہّار، عزیز و قدیر اور الحیّ و القیّوم ہے؟ انسان کو اگر اپنے نفس کی حقیقی آرزو کا عرفان و ادراک ہو جائے، جسے معرفتِ نفس کہتے ہیں تو اسے اس حقیقت کا عرفان و ایقان ہونا فطری امر ہے کہ وہ صرف ایک ربّ و الٰہ کو چاہتا ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے، جس کے سب افرادِ نسلِ انسانی مخلوق و پروردہ اور فقیر و سائل ہیں اور جو پکار پکار کر اپنے بندوں سے فرماتا ہے:

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (فصّلت ۴۱: ۳۱): ہم اس دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے اولیا یعنی دوست و سرپرست ہیں اور آخرت میں بھی۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ بار بار انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ فقط وہی عالم الغیبْ الشّہادۃ، سمیع و بصیر، رحمٰن و رحیم، وہّاب و کریم، مولیٰ و نصیر، و دود و وکیل، غفّار الذّنوب اور مستجیب الدّعوات ہے۔ ایک وہی غنی ہے اور باقی کُل مخلوقات اس کی محتاج و دست نگر اور اس کی محکوم و غلام ہیں۔ علاوہ بریں، فقط وہی سب کا اِلٰہ ہے، یعنی معبود و محبوب، مطلوبْ مقصود اور حاکم و بادشاہ ہے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سوا انسان جن اشیاء و اشخاص کی پرستش کرتا ہے، وہ سب "اَصنام" ہیں اور "اَسمائے بے مُسمّیات" ہیں؛ یعنی ان صفات سے عاری ہیں، جن سے انھیں متّصف کیا یا سمجھا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کا ظلم و جہل اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی "اَصنام" بناتا ہے اور بغیر علم اور وحی و تنزیل کی سند کے ان سے صفاتِ الٰہیہ منسوب کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح "کسی" کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا بیٹا تو کسی کو اس کا اوتار اور کسی کو اس کی صفات و خدائی میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اُن کی پرستش و بندگی کرنے اور ان کو اپنی مدد و حاجت برآری کے لیے پکارنے لگتا ہے۔ قُرآنِ مجید کے نزدیک یہی کسی کو اِلٰہ و ربّ بنانا اور یہی شرک و بت پرستی ہے اور یہی ناقابلِ معافی ظُلمِ عظیم ہے (لقمٰن ۳۱: ۱۳؛ النّسآء ۴: ۴۸)۔

شرک یا ظُلمِ عظیم کی ایک قسم استحصالی و سرطانی طبقوں یا فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری سرطانوں کی حاکمیّتِ اعلیٰ کو برضا و رغبت تسلیم کر کے ان کی حمد و ثنا اور اطاعت و بندگی اس طرح کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیے۔ اس موقف کے ثبوت میں "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" (یوسف ۱۲: ۴۰) کا فرمانِ الٰہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ الغرض، ازلی و ابدی اور سچا دین یہ ہے کہ توحیدِ اُلُوہیّت و ربوبیّت میں کسی ہستی کو شریک مانا جائے نہ کیا جائے اور غیر اللہ کی طاعت و بندگی سے منہ موڑ کر صرف اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔

انسان کے ساتھ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کے رشتے کی نوعیت دُہری ہے: ایک اُلُوہیّت یا محبّت کی اور دوسری، ربوبیّت یا رحمت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمارا اِلٰہ ہے، یعنی ہمارا معبود و محبوب اور

مطلوب و مقصود یا معروضِ حُسن و عشق ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اِلٰہ کیوں ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ "الحُسن" ہے، اس لیے ہمارا اِلٰہ ہے۔ اس کے "الحُسن" کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ، یعنی اللہ حسین ہے حُسن سے محبت رکھتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ خود اللہ جلّ شانہٗ کا ارشاد ہے: تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ٥ (الرحمٰن ۵۵ : ۷۸) : بڑی برکت والا ہے تیرے ربّ جلیل و کریم کا نام۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمال و جلال دو عناصرِ امتزاجی ہیں حُسن کے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (الاعراف ۷ : ۱۸۰؛ طٰہٰ ۲۰ : ۸؛ الحشر ۵۹ : ۲۴) : اللہ ہی کے لیے حسین نام یعنی صفاتِ حسنہ ہیں؛ لہٰذا ان حسین ناموں ہی سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو جو اس کے ناموں یا صفات میں کج اندیشیاں کرتے ہیں (یعنی ایسی صفات گھڑ لیتے ہیں جو اس کے حُسن کے منافی ہیں)۔ وہ وقت دور نہیں کہ وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔

محوّلہ بالا آیاتِ جلیلہ اور حدیثِ طیّبہ سے ایک تو یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ کی ذات جملہ صفاتِ حسنہ کی مبدأ ہے۔ دوسرے، وہ الحُسن ہے۔ تیسرے، اِس بنا پر وہ اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق ہوا، اس لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور انسان کا رشتہ ـــ رشتۂ محبت ہوا۔ اس کے رشتے کی دوسری نوعیت رحمت کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارا ربّ رحمٰن و رحیم ہے، اور اس کی رحمتِ بے پایاں کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر شے کو محیط ہے (المؤمن ۴۰ : ۷)؛ نیز اُس نے رحمت کو اپنے نفس پر لازم کر لیا ہے (الانعام ۶ : ۱۲)؛ چنانچہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اُلوہیّت و ربوبیّت، محبت و رحمت اور جمال و جلال تقاضا کرتے ہیں کہ ہم بھی اپنے والدین، اہل و عیال، اعزّہ و اقارب، مال و دولت، کاروبار، حکومت و اقتدار، عزّت و شہرت،

حتٰی کہ اپنی جان سے بھی زیادہ اس سے محبت کریں (البقرہ ۲: ۱۶۵)؛ نیز اسی کو اپنا الٰہ و رب سمجھیں، بنائیں اور اس عقیدے کے مطابق زندگی کریں اور پائے استقامت کو کبھی لغزش نہ آئے۔

مندرجۂ بالا سورۂ اعراف میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس میں آزری پیشوائیت کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کی تردید کی گئی ہے۔ ان ابلیسی فنون کے ذریعے آزری پیشوا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے متعلق ہر زمان و مکان میں طرح طرح کی جاہلانہ و مشرکانہ مثالیں وضع کرتے رہتے ہیں، اور کرتے رہے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود لوگوں کا استحصال، جلبِ منفعت و اقتدار اور اپنی دکانداری کو چمکانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ اللہ تعالیٰ کو ایسے مطلق العنان و مستبد اور نا منصف بادشاہ سے تشبیہ دیتے ہیں، جس کے دربار میں رسائی و باریابی یا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی بارسوخ شخصیت کی سفارش ناگزیر ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، وہ اُسے سبحان و صمد، عزیز و قدیر، وحدہٗ لاشریک اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ سمجھنے کے بجائے اُسے اپنے بندوں کے پیدائشی گناہوں کے کفّارے کے لیے انسان بن کر ماں کے بطن میں نو ماہ رہنے، پیدا ہوتے طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنے اور انجام کار مصلوب ہونے پر مجبور سمجھتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی بندوں کی اصلاح کے لیے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے اوتار بن کر بطنِ مادر سے عام انسانوں کی طرح جنم لینے، شادی بیاہ کرنے اور مصائب جھیلنے اور لذّتِ موت سے آشنا ہونے کے عقیدے سے ملتا جلتا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے ایسے تمام عقائد مشرکانہ و بت پرستانہ اور انسان کے ظلم و جہل پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ تھا جملۂ معترضہ۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ فلسفۂ صلوٰۃ پر تدبّر بالحق کرنے سے اِس اصلِ عظیم سے آگاہی ہوتی ہے کہ صلوٰۃ کی حقیقت "آرزوئے حسن ہے۔" جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، حسن سے مراد (۱) الحسنٰی، (۲) حسنِ حیات (۳) حسنِ المآب اور (۴) حسنِ زمان و مکان ہے۔ اب ان مصطلحات کی تشریح کی جاتی ہے:

۱) الحُسن سے مراد اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ ہے، کیونکہ فقط اور تنہا وہی جُملہ صفاتِ حسنہ کا مخزن ہے (الاعراف ۷: ۱۸۰)؛ نیز وہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (الشّوریٰ ۴۲: ۱۱)، وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ہے (الانعام ۶: ۱۶۳ وبمواضعِ کثیرہ)؛ لیکن منزّہ، یکتا اور بےنظیر ہونے کے باوصف وہ محض اپنے فضل وکرم سے اپنے کسی اہلِ ایمان و آرزو پر اپنا صُوری جلوہ برنگِ مجاز پیدا بھی کرتا ہے۔ یہ مشاہدہ ناقابلِ بیان ہوتا ہے، اگرچہ اس کے جمالیاتی اثرات قلب پر نقوش فی الحجر کی طرح مرتسم ہو کر جمالیاتی ثروت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ اس مشاہدے سے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ الحُسن دیکھنے میں صورتِ حُسن ہے یا حُسنِ صورت۔ اُس کے جلوۂ صوری میں برقِ حُسن سی ہوتی ہے، جو اہلِ ذوق ونظر کو جمالیاتی ثروت دیتی، رحیقِ جانفزا پلاتی اور مسرور ومتکیف کر دیتی ہے۔ دیدِ دوست سے ایسی قُرۃ العین یا جمالیاتی ٹھنڈک ملتی ہے، جو شدید ترین ہوتی ہے اور اس سے جو کیفِ حیرت ومستی، جمالیاتی لذّت ومسرّت، سوز و سازِ آرزو مندی اور سُرور، تب وتاب ملتا ہے، اس کی شدّت بھی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔

فاطرِ ہستی، جو الحُسن بھی ہے اور حُسن سے محبّت بھی رکھتا ہے، احسن الخالقین ہے؛ لہٰذا اُس نے آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی تخلیق کی ہے، اُسے حسین بنایا ہے (السّجدہ ۳۲: ۷)؛ نیز اس نے انسان کو جمالیاتی حِسّ اور ذوقِ حُسن بھی ودیعت کیا ہے تاکہ وہ حُسن سے محبّت کرے اور جمالیاتی حظ وطرب، جمالیاتی طمانیت ومسرّت اور جمالیاتی سوز وساز حاصل کرے۔ ساتھ ہی اُس نے انسان پر اقامتِ صلوٰۃ کو فرض کر دیا، اس لیے کہ اس میں ایک تو جمالیاتی حِسّ کو زندہ وفعّال اور ذوقِ حُسن یا جمالیاتی ذوق میں نظافت وطہارت اور بوقلمونی و رفعت پیدا کرنے کی تاثیر ہے؛ دوسرے، وہ الحُسن کے قُرب و رِضوان اور حضوری و مشاہدہ کا ذریعہ ہے، خصوصاً ان کے لیے جو اس نعمتِ عظمیٰ کی سچّی آرزو رکھتے ہیں۔ اس نعمتِ عظمیٰ سے اہلِ حُسن و آرزو کو ہر زمان "جانِ دیگر" بھی ملتی ہے اور ان کے نُور کا اتمام یا جمالیاتی ارتقا بھی ہوتا رہتا ہے۔ اسی کو ترفیعِ درجات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ راز اہلِ حُسنِ نظر ہی جانتے ہیں کہ

دیدِ دوست" ہی "رحیقِ مختوم" ہے۔ رحیقِ مختوم دو آتشہ بھی ہوتی ہے، جس سے ہم نظری و ہمکلامی کی حیرت و مستی کی لذّتِ جانفزا ملتی ہے۔ الحُسن کے قرب و حضور میں رہنے سے زندگی میں حسن و سُرور کی افزائش اور اس کا جمالیاتی ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ وہ جتنا اس کے قریب ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی دُنیا کشادہ ہوتی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے، زندگی اپنے اِلٰہِ جمیل سے جتنی دور ہوتی جاتی ہے اس کی دُنیا اتنی ہی تنگ سے تنگ تر ہوتی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، الحُسن کی دُوری سے انسان پر عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ دوسرے، اس کی دُنیا زندانِ تنگ و تاریک اور اس میں اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ صلوٰۃ سے حیاتِ انسانی اپنے اِلٰہ و الحُسن کے قریب سے قریب تر ہوتی جاتی ہے اور اس کی تاثیر سے الحُسن کا رنگ (= صبغۃ اللّٰہ) پکڑتی رہتی ہے، یعنی اس میں صفاتِ الٰہیہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان صاحبِ حسنِ خُلق، صاحبِ جمال و جلال، صاحبدل و صاحبِ ذوق و نظر، صاحبِ جذب و شوق اور اہلِ آرزو و ولی اللّٰہ بن جاتا ہے تو زندگی اس کے لیے رشکِ فردوسِ بریں بن جاتی ہے۔ اس تجربے سے اُسے اس حقیقت سے آگہی ہوتی ہے کہ زندگی واقعی اس کے اِلٰہِ جمیل اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کی ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے، جس کے لیے وہ اس کا ابدالآباد تک شکر ادا کرتا رہے تو حق ادا نہ ہوسکے۔

بخلاف اس کے، اہلِ نار جب ایک طرف اپنی آتشِ بداماں، بھیانک، تنگ و تاریک، اذیّت ناک و تشکیب رُبا زندگی کو اپنی ہی آتشِ سوزاں میں جلتے اور موت کو ترستے دیکھیں گے اور دوسری جانب اہلِ جنّت کی زندگیِ سرمدی کی اصل صورتِ حسن و سُرور کا مشاہدہ کریں گے تو اُن پر یہ حقیقت کھلے گی کہ زندگی کتنی حسین و عظیم نعمت تھی، جس کی انھوں نے دنیا میں قدر نہ کی، بلکہ اُلٹا اُسے اپنے ظُلم و جہل، کفر و شرک اور جرم و گناہ سے قبیح و تشکیب رُبا اور اجیرن بنا دیا۔ اُن پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہوگی کہ زندگی کا معنیٰ الحُسن تھا، جو اس کا اِلٰہ و ربّ تھا اور ہے، اور جس کے قُرب و رِضوان کے لیے وہ دنیا میں بھی بیقرار رہتی تھی اور یہاں بھی مضطرب و

بیقرار ہے۔

۲) حُسنِ حیات :

زندگی استحقاق نہیں، موہبتِ اِلٰہی ہے۔ یہ ایسی حسین و محبوب اور عظیم و غیر مترقبہ نعمت ہے کہ نذرانۂ تشکر کے طور پر جان بھی دینا پڑے تو جان آفریں کا حقِ تشکر ادا نہ ہو۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے :

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انسان غور کرے کہ اگر احسن الخالقین اُسے زندگی عطا نہ کرتا تو وہ معدوم ہوتا اور لذتِ حیات سے نا آشنا رہتا اور اس طرح نعمتِ عظمٰی سے محروم رہتا۔ بالفرض، اگر ربِّ کریم، انسان کو زندگی تو دیتا لیکن صورتِ بشر دیتا، نہ حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام، تو وہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ حیوان و درندہ یا حشرات الارض میں سے ہوتا تو وہ قدرت کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ اگر احسن الخالقین اُسے حسین زندگی گزارنے کی خاطر دُنیا کو طیب و شیریں اور نظر افروز و دلکش نعمتوں سے معمور نہ کر دیتا اور اسے جمیل و جلیل نظاروں کی جلوہ گاہ نہ بناتا تو بندۂ بیکس کیا کر سکتا تھا؟ علاوہ ازیں اگر فاطرِ ہستی اُسے جمالیاتی ذوق دے کر حُسن پسند نہ بناتا تو وہ دُنیا کی حسین و محبوب چیزوں سے لذّت و مسرّت، طمانیت و راحت، کیف و سُرور، جمالیاتی درد و سوز، قُرّۃُ العین یا جمالیاتی ثروت کیسے حاصل کر سکتا تھا؟ انسان فطرۃً جانتا ہے کہ حُسنِ زندگی اور اس کے لوازمات محض الحُسن کا فیضان ہیں، لیکن اپنے ظُلم و جہل کے باعث

جانتا ہے پر مانتا نہیں

زندگی کیا ہے؟ یہ ایک مُعمّا ہے جو حل ہوا ہے نہ ہو گا، کیونکہ اس سِرّ الاسرار کا ادراک عقل کے مقدور ہی میں نہیں۔ قُرآنِ مجید سے اس قدر آگہی ضرور ملتی ہے کہ زندگی نفخۂ رُوحِ اِلٰہی ہے، لیکن اس کی ماہیّت کیا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں؛ البتہ اگر اس حقیقت پر تفکّر بالحق کریں کہ اللہ تعالیٰ الحُسن اور اس کا نفخۂ روح بھی حُسن ہونا چاہیے تو نتیجۃً یہ کہہ سکتے ہیں کہ

زندگی کی اصل حسن اور اس کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود الحسن ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی طلب و جستجو میں ہر شکل و صورت، ہر رنگ و حال اور زمان و مکان میں رواں دواں رہتی ہے؛ نیز اُسے خوب سے خوب تر کی آرزو و تلاش رہتی ہے۔ انسان کی اس آرزوئے حسن سے ناجائز فائدہ اُٹھانے اور اُسے الحسن سے غافل و دُور کرنے اور اس کے نتیجے میں اُسے اپنے باطنی حسن و نور، اطمینان و سرور اور لذتِ زندگی سے محروم رکھنے کی خاطر اس کا ازلی و پیدائشی حریف ابلیسی نفسی شیطان اس کی ہر قبیح سے قبیح خواہش کو اپنی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے خوب سے خوب تر بنا کر دکھاتا رہتا ہے۔ قلب اپنے فطری حسن و نور سے محروم ہو کر اندھا ہو گیا ہو تو انسان اس انسانی دھوکے میں آ کر جرم و گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ بخلاف اس کے، قلب حسین و منیر یا بینا ہو تو وہ اس دلفریب دھوکے میں نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ حسین و منیر قلب پر گناہ اپنی اصل قبیح و تکلیف دہ شکل میں جلوہ پیدا کرتا ہے، جس کا حریف وہ نہیں ہو سکتا اور صاحبِ حسن و سرور اس کے ارتکاب سے گریزاں و ترساں رہتا ہے، جسے "تقویٰ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

حسن کی ایک بنیادی صفت حیا ہے اور یہ زندگی کا جمال و جلال ہے۔ حیات اور حیا دونوں کا ایک ہی مادّہ ہے اور وہ ہے ح ی ی۔ حیا اصل میں حسنِ زندگی بھی ہے اور آرزوئے حسنِ زندگی بھی۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ زندگی کی حقیقت حسن ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ حیا ہو تو انسان حقیقت میں زندہ ہوتا ہے؛ اگر بے حیا ہو تو مردہ ہوتا ہے۔ اس سے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس حکیمانہ ارشاد کی معنویت سے آگاہی ہوتی ہے کہ "ہر قوم کے دین کی ایک امتیازی خوبی ہوتی ہے اور اسلام کی امتیازی خوبی "حیا" ہے (المشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الرِّفقِ والحَیاءِ وحُسْنِ الخُلُقِ، ح ۵۸۶۵)۔

حیا زندگی کے اس فطری داعیہ و آرزو سے عبارت ہے کہ وہ فحشاء و منکر کے قبیح و حسن رُبا اثرات سے منزہ و محفوظ، نیز جمیل و جلیل اور طیب و منیر رہے؛ یعنی اپنی اصل فطری

حالت پر قائم رہے۔ چنانچہ زندگی کی اس آرزو کے پیش نظر ربِّ عزیز و قدیر نے اپنے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق اُسے حیا ودیعت کی ہے، جو اس کا ناقابلِ تسخیر حصار ہے، اور حریفِ آدم شیطان اس میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ انسان، خواہ صنفِ جمیلہ ہو یا صنفِ جلیلہ، اُسے خود اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ علاوہ بریں، خصوصاً صنفِ جمیلہ جب اپنے اس حصارِ حیا سے باہر نکلتی ہے تو شیطان کے جالیاتی فریب میں آجاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں حُسنِ زندگی سے محروم ہوجاتی ہے۔ حیاتِ انسانی جب تک حیا کے حصنِ حصین میں رہتی ہے، شیطان کے وسوسوں اور جالیاتی دھوکوں کے حسن رُبا و مرگ آفریں اثرات و نتائج سے محفوظ و مصئون رہتی ہے، اور اس سے باہر نکلتی ہے تو حُسن و عزّتِ نفس سے محروم اور بے حیا و آبرو باختہ ہوجاتی ہے۔

ربِّ کریم نے انسان کو خَلق اور خُلق ہر لحاظ سے حسین بنایا ہے۔ حُسن کے متعدد امتزاجی عناصر میں سے جمال و جلال اہم ترین ہیں۔ چنانچہ احسن الخالقین نے مرد کو جلیل اور عورت کو جمیل بنایا ہے۔ اس بنا پر ہم نے عورت کے لیے صنفِ جمیلہ اور مرد کے لیے صنفِ جلیلہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ صنفِ جمیلہ بلا شبہ بلحاظِ جسم نسبتاً نازک و کمزور ہوتی ہے لیکن شیطان کے مقابلے میں اس کا جمالِ حیا ناقابلِ تسخیر جلال بن جاتا ہے، جس کا وہ حریف نہیں ہوسکتا۔ یہ حیا ہی ہے جو شیطنت کے مدِّ مقابل جلال بن کر صنفِ جمیلہ اور صنفِ جلیلہ دونوں کی عزّتِ نفس کے تحفّظ کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ عزّتِ نفس کا مطلب عفّت و عصمت، عزّت و آبرو اور ناموس و طہارت ہے اور طہارت سے مراد حسّی، قلبی، نفسی پاکیزگی ہے۔ بالفاظِ دیگر، بدن کے اعضاء و جوارح، حواسِ خمسہ اور دل و دماغ کا لمسِ شیطانی اور آلودگیِ قبیح سے محفوظ و منزّہ ہونا، طہارت ہے۔

حیا بلا شبہ فطری داعیہ ہے، جسے موضوعی، معروضی شیطان اپنی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے نحیف و نزار اور بے جان کرنے اور صنفِ جمیلہ و جلیلہ کی زندگی میں نفسیاتی، جنسی لمحے کی وقوع پذیری کا سدِّ باب کرنے کا ازبس مؤثّر ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ

صلوٰۃ میں زندگی ہے: طیّب و منیر، جمیل و جلیل اور حرکی و ارتقائی حیاتِ جاوداں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اہلِ آرزو کو صلوٰۃ سے قربِ الٰہی اور قرب سے زندگی ملتی ہے، اور زندگی کا ملنا انسان کی عظیم کامیابی ہے۔

یہ اصل یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زندگی اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی ہر تخلیق کی طرح حسین ہے (السّجدۃ ۳۲: ۷)، جسے وہ پیکرِ بشری کے ساتھ صُوَری انفرادیّت و تشخّص اور حسّی، قلبی، نفسی نظام بھی عطا کرتا ہے (النّحل ۱۶: ۷۸)، اور اپنے اس منفرد و مشخّص نفخۂ روح کو "نفس" سے تعبیر کرتا ہے۔ نفس مخلوق ہونے کے باعث لذّتِ موت سے آشنا تو ہوتا ہے، لیکن فنا و معدوم نہیں ہوتا، بلکہ موت اُسے دارالفنا سے دارالبقا میں پہنچا کر خود ہمیشہ کے لیے فنا و معدوم ہو جاتی ہے، اس لیے کہ وہ خود مخلوق ہے (الملک ۶۷: ۲)۔ نفسِ انسانی موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد دُنیا سے تو ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے، لیکن الحَیوان میں، جو موت سے منزّہ جہانِ حیات ہے، دوبارہ زندہ ہوگا؛ اپنے اعمال کا حساب دینے اور ان کے حُسن و قُبح کے مطابق جنّت میں صہبائے حُسنِ زندگی کے کیف و سُرور میں سرشار رہنے، یا جہنّم میں لذّتِ حیات و موت سے ناآشنا، خوف و حزن اور حسرت و یاس کے عذابِ الناک میں نہ جینے اور نہ مرنے کے لیے۔ زندگی حسین و منیر ہو تو نفس حالتِ قرار و طمانیّت میں ہوتا ہے، جس کے لیے قرآنِ عظیم نے "نفسِ مطمئنّہ" کی تعبیر اختیار کی ہے، اور اس کی صفات کی طرف بصیرت افروز اشارے کیے ہیں (الفجر ۸۹: ۲۷تا۳۰)۔

زندگی کی اصل حُسن ہے اور حُسن جملہ صفاتِ حسنہ کا سرچشمہ ہے؛ ان میں سے ایک صفت "طیّب" ہے۔ طیّب اس انسان کو کہا جاتا ہے، جس کی زندگی ایمان و حُسنِ عمل اور طہارت و نظافت سے منوّر و معطّر ہو اور اس میں نشو و ارتقا کرنے کی صلاحیت ہو۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ وہ قُبح کی ہر نجاست، مثلاً کفر و شرک، ظُلم و جہل، فسق و فجور اور جرم و گناہ سے پاک و منزّہ ہو۔ ایسی حسین زندگی ہی حقیقت میں "حیاتِ طیّبہ" ہے، جو ایمان و عملِ صالح کا دُنیوی ثمرہ ہے۔ اس اصل

کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ (النحل ۱۶: ۹۷) ؛ جو شخص بھی صالح یا حسین عمل کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ہم اسے دُنیا میں حیاتِ طیبہ یا حسین زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اجر اُن کے حسین ترین اعمال کے حساب سے دیں گے۔

حیاتِ طیبہ کا اجر کیا ہوگا؟ مندرجہ ذیل آیاتِ جمیلہ میں ربّ کریم نے اس کی طرف بصیرت افروز اشارے کیے ہیں: وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ...... الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ ...... تَعۡمَلُوۡنَ (النحل ۱۶: ۳۰ تا ۳۲) : (بخلاف اس کے) جب تقوٰی اختیار کرنے والے لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو جواب میں کہتے ہیں: "خیر" یعنی جو چیز اتری ہے وہ دُنیوی و اُخروی حسنہ ہے۔ ایسے حسنِ عمل کرنے والوں کے لیے اس دنیا میں بھی حسنہ ہے (یعنی ہر وہ حسین چیز جو موجبِ خیر و برکت اور وجہِ طمانیت و مسرت ہو) اور آخرت کا گھر (جنّت یا حُسنُ المآب ہے، جو (یقیناً) بہتر ہے؛ اور متقیوں کا یہ گھر تو بہترین نعمت ہے۔ (متقیوں کا یہ گھر یا حُسنُ المآب) ہمیشہ قائم رہنے والے بہشت ہیں جن میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوں گے۔ ان کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی (یعنی سبزہ و گُل، رنگ و بُو اور اشجار و اثمار کے نظاروں میں آبِ رواں کے مناظر ہوں گے)؛ نیز ان میں وہ سب کچھ ہوگا، جس کی انہیں خواہش ہوگی۔ اللہ تعالٰی تقوٰی کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ دیتا ہے۔ ان متقیوں کو جب ملائکہ ان کی جانیں نکالتے ہیں تو وہ طیب یعنی پاکیزہ و خوش ہوتے ہیں، اور وہ ان سے کہتے ہیں: سلامتی ہو تم پر! جنّت میں داخل ہو جاؤ، ان کاموں کے بدلے جو تم کرتے تھے"۔ قدرت کے قانونِ مجازات کی رُو سے حیاتِ طیبہ کا اجر طوبٰی ہے؛ اور جیسا کہ ہم ابھی معلوم کر چکے ہیں، حیاتِ طیبہ وہ مُومن و صالح

انسان ہی بسر کرتے ہیں چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ○ (الرعد ۱۳: ۲۹): جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کیے ان کے لیے طوبیٰ اور حُسنُ مآب ہیں۔

اس آیۂ جمیلہ میں قرآنِ حکیم کی چار اساسی اصطلاحات وضاحت طلب ہیں: ایمان، اعمالِ صالحہ، طُوبیٰ اور حُسنُ مآب۔

(۱) **ایمان** سے مراد ایمان بالحق ہے، جس کی ضد و نقیض ایمان بالباطل ہے۔ ایمان اس اطمینان بخش یقینِ محکم و کامل سے عبارت ہے جو تشکیک و لاادریت کی آمیزش سے پاک و صاف ہو۔ قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اس کے معانی ہیں: اللہ تعالیٰ کی توحیدِ اُلوہیت و ربوبیت، پیغمبرِ اعظم و آخر سمیت اس کے جملہ رسولوںؑ، کتابوں، ملائکہ اور آخرت کا زبان سے اقرار کرنا اور قلب سے تصدیق کرنا۔ قرآنِ حکیم عموماً ایمان اور عملِ صالح کی ترکیب استعمال کرتا ہے اور اس میں یہ حکمت مضمر ہے کہ ایمان کو اعمالِ صالحہ مستلزم ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ایمان کی کسوٹی اور اعتبار اعمالِ صالحہ ہیں۔ چنانچہ ایمانیات یا معتقداتِ جلیلہ و محترکہ کو خون کی طرح اپنے قلب میں جذب کر کے ان کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی کرنے سے انسان مؤمن و صالح بنتا ہے۔ اعمالِ صالحہ کے بغیر ایمان نحیف و مضمحل ہوتے ہوتے مُردہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ایمان بالحق ہوتے ہوئے بھی ایمان بالباطل کا حریف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مُسلم اقوام میں صالحیت کی کمی یا فقدان کے باعث ان کا ایمان بالحق کمزور و مضمحل اور مردہ ہو چکا ہے اور وہ ان قوموں کے مقابلے میں کمزور و نحیف ہیں، جو ایمان بالباطل رکھتی ہیں۔

اصل یہ ہے کہ حُسنِ عمل سے ایمان میں حُسن کی صفات، مثلاً جمال و جلال، نُور و توانائی، حیات و قیومیت اور جباری و قہاری پیدا ہوتی اور اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہیں۔ تاریخی عمل کے حملے اور زیانِ مسلسل سے اگر کسی قوم کو کوئی قوت بچا سکتی ہے تو وہ زندہ ایمان و حُسنِ عمل کی ناقابلِ تسخیر

قوت ہے۔ قرآنِ مجید کی سورۃ العصر (۱۰۳: ۱ تا ۳) اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ علاوہ بریں، ایمان و حُسنِ عمل کے اشتراک سے حسّی، قلبی، نفسی نور کی تولید و افزائش ہوتی ہے اور وہ حرکی و ارتقائی بنتا ہے۔ یہ نور حیاتِ انسانی کو نہ صرف اس کے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کی راہِ مستقیم دکھاتا ہے، بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرتا ہے تاکہ انسان اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے، جو جنت ہے۔ دنیا میں یہ نور انسان کو اس کے اِلٰہ کا قُرب حاصل کرنے اور اُسے احسان کے مقامِ شاہدیت پر متمکن کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

نور کی حرکت و توانائی سے اس کی ترقی و تکمیل ہوتی ہے اور ہر کمال کے بعد کمالِ نو کا آغاز ہوتا رہتا ہے؛ اور اس سلسلۂ ترقی و تکمیل کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس ضمن میں یہ اصل یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زندگی کا بشری ارتقاء اللہ تعالیٰ نے اپنے نفخۂ روح سے مکمل کر دیا تو اس کے جمالیاتی ارتقاء کا سلسلہ شروع کر دیا، جو دنیا کے بعد دارالآخرت یا الحیوان میں بھی جاری و ساری رہے گا، جب تک كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِي شَأۡنٖ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس بارے میں یہ نکتہ ازبس اہم بصیرت افروز اور عبرت انگیز ہے کہ شرک سے جمالیاتی ارتقاء نہ صرف ختم ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے بجائے ترقیِ معکوس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جو انسان کو مقامِ انسانیت سے گرا کر اسفلِ سافلین بنا دیتا ہے۔ دوسرے، شرک سے حیاتِ انسانی کا رُخ اپنی منزلِ مقصود سے ہٹ کر اُلٹی طرف ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا اپنے معبود و مقصود کو پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تیسرے، شرک نفس کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اسے اس کی انفرادیت و تشخص سے محروم کر دیتا ہے اور یہ محرومی توبۃ النصوح کے بغیر محرومیِ جاوید بن جاتی ہے۔ چوتھے، شرک اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اور نفسِ انسانی کے خلاف بغاوت بھی ہے اور اس کی نفی بھی۔ ان وجوہ کی بنا پر قرآنِ مجید نے شرک کو ایسا ظلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے، جس کی تلافی ہو سکتی ہے نہ بخشش۔ بالفاظِ دیگر، اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی نظر میں شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے (النسآء ۴: ۴۸، ۱۱۶ ببعد)۔

(۲) اعمالِ صالحہ:

اَلصَّلَاحُ ضد ہے فساد کی۔ لفظ صَلَاح کبھی تو "فساد" کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے اور کبھی "سیئہ" کے۔ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا (التوبۃ ۹:۱۰۲): ان کا عمل مخلوط ہے؛ کچھ صالح ہے اور کچھ قبیح؛ یعنی انھوں نے حسنِ عمل اور عملِ سوء کو ملا دیا تھا۔ ثانیاً، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ٥ (یونس ۱۰:۸۱): اللہ تعالیٰ مفسدوں کے اعمال کی اصلاح نہیں کرتا (کیونکہ یہ اس کا قانونِ احترامِ آرزو ہے)۔ (دیکھیے المفردات، بذیل مادّہ ص ل ح)۔

قرآنِ مجید سیئہ کو حسنہ کی ضد کے طور پر اصطلاحاً استعمال کرتا ہے۔ حسنہ سے مراد ہر وہ حسین نعمت ہے، جو طمانیت و مسرت بخشے اور قرۃ العین ہو۔ بخلاف اس کے سیئہ ہر اس چیز یا واقعہ کو کہتے ہیں جو قبیح و ناگوار ہو اور خوف و حزن پیدا کرے۔

فساد بھی قرآنِ مجید کی بنیادی اصطلاح ہے اور وہ اسے بہت وسیع مفہوم میں استعمال کرتا ہے، مثلاً خرابی و برہمی، بےنظمی و ناہمآہنگی، تشتت و افتراق؛ بددیانتی و بےایمانی، ظلم و استحصال، فحشاء و منکر، فتنہ و شر وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ضد صلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں: توازن و موزونی، اعتدال و تسویہ، عدل و احسان، محبت و ایثار، صلح و صفائی، حسنِ اخلاق و کردار۔ فساد سے اگر زندگی کے ہر شعبے، مثلاً دینی، اقتصادی، سیاسی، عمرانی، عائلی، ثقافتی، اخلاقی، تعلیمی، علمی و ادبی، عسکری وغیرہ وغیرہ میں برہمی و خرابی پیدا ہوتی ہے تو صلاح سے ان تمام شعبوں میں توازن و ائتلاف اور درستگی و ہم آہنگی اور امن و سلامتی پیدا ہوتے ہیں۔ صالح قرآنِ مجید کی رُو سے وہ انسان ہوتا ہے جو صاحبِ حسن و سرور، خوش خُلق و نیک کردار، پاکباز و متقی، صادق و امین اور صلح جو و انصاف پسند ہو اور معاشرے میں فساد و سیئات (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) دور کرنے اور اس میں امن و سلامتی پیدا کرنے کی سعی و جہد کرتا ہو۔ چونکہ سرطانی ادارے اور معاشرتی سرطان ملک میں فتنہ و فساد، سیئہ و شر اور فحشاء و منکر ایسی سرطانی برائیوں کو پھیلاتے ہیں، لہٰذا صالحین ان کے خلاف جہاد کرنے والے ہوتے ہیں۔ الغرض، عملِ صالح میں انفرادی و اجتماعی نفس کے تزکیہ اور

تحسین و تعبیر کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

(۳) **طُوبیٰ** بھی حسنہ اور الکوثر کی طرح قرآنِ حکیم کی وسیع المعانی اصطلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں: ہر وہ نعمتِ حسنیٰ جو مطہر و خوشگوار، لذت انگیز و راحت افزا، طمانیت انگیز و مسرت آفرین اور فرحت بخش و قرۃ العین ہو۔ ہم اسے جمالیاتی ثروت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ جمالیاتی ثروت ہی حاصلِ زندگی ہے اور اسی سے زندگی حسین یا حیاتِ طیبہ اور انسان نفسِ مطمئنہ بنتا ہے۔

(۴) حُسنُ المآب یا حُسنُ مآب:

یہ اصطلاح اعجازاتِ قرآنی میں سے ہے۔ غور کریں تو اس میں فلسفۂ حیات کا دفتر پنہاں ہے۔ اس کے لفظی معانی ہیں: لوٹ کر آنے کی جگہ یا گھر کا حُسن۔ چونکہ یہ حُسنِ محض اور رنگِ قبح و ممات سے منزہ ہے، لہٰذا قرۃ العین ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گھر ہی میں انسان آرام و راحت، طمانیت و مسرت اور محبت و دلجمعی سے زندگی بسر کر سکتا ہے، اور گھر جنت یا قرۃ العین ہو تو انسان کو جس قدر کیف و سرور حاصل ہوگا، وہ اس دُنیا میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس معجزنما اصطلاح میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کا حقیقی و فطری گھر جنت ہے، جو حُسنِ محض اور قرۃ العین ہے اور جہاں زندگی رنگِ دوام سے مزین ہوگی۔ حُسنِ محض اور اس کی تاثیر مسرتِ محض کیا ہے؟ اس کی مثال نہ اس دنیا میں ہے اور نہ اس کا کوئی متنفس خیال ہی کر سکتا ہے (السجدۃ ۳۲: ۱۷)۔

ہر مسافر لوٹ کر اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ گھر کی آرزو فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ انسان اس دُنیا میں مسافر ہے اور آخرت میں حُسنُ المآب کی آرزو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس آرزو کو پورا کرنا مقصودِ زندگی، غایتِ دین اور مشیّتِ ایزدی ہے لیکن تشفیِ آرزو کی پیش شرط یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایمان و حُسنِ عمل کے ذریعے اپنی زندگی کو حسین و منیر اور مطمئن و مسرور بنائے اور اہلِ حُسن و سُرور بن کر زندگی کرے۔ یہ ہے دین و زندگی کے فلسفے کا ماحصل۔

یہ تھا جملہ معترضہ۔ موضوعِ بحث زندگی تھا، اور زندگی عبارت ہے حُسنِ زندگی یا حیاتِ طیبہ سے، جس کا صلہ جنت ہے، جسے اللہ سبحانہ، وتعالیٰ نے انسان کے لیے مہمان خانہ اور حُسنُ المآب بنایا ہے؛ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بنی نوعِ انسان اپنے آپ کو اس میں رہنے کے قابل بنائیں؛ یعنی زندہ بنیں اور زندوں کی طرح زندگی کریں۔ زندہ انسانوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ حسین و طیب زندگی بسر کرتے ہیں؛ اور ان کے قلب مطمئن ہوتے ہیں۔
ہمیں یہ اصل فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایمان بالحق اور اعمالِ صالحہ کی تاثیر سے زندگی میں جمال و جلال، توانائی و حرکتِ ارتقائی، نور و سرور اور رجائیت و اطمینان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہے حیاتِ طیبہ اور اسے بسر کرنے والا اللہ سبحانہ، وتعالیٰ کی نظر میں "زندہ" ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے کہ جب بھی اللہ سبحانہ، وتعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ ایمان کو ایسی چیز کی دعوت دے جو اُسے "زندہ کرنے والی ہو تو عقلِ سلیم اور فطرتِ انسانی کا مقتضٰی یہ ہے کہ انھیں اُسے فوراً قبول کر لینا چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (انفال ۸: ۲۴)؛ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی دعوت قبول کرو جب وہ تمھیں اس چیز کی طرف بلائے جس سے تمھیں زندہ کرے۔

غور کریں تو زندگی بخشنے والی عظیم و اہم ترین شے ربِّ حیّ و قیوم کا زندہ کلام طیّب قرآنِ حکیم ہے۔ اس میں ربِّ سبحانہ، وتعالیٰ کی "روح" ہے، جو اپنے مخلص تلامذہ میں جان ڈالتی اور انھیں لذتِ زندگی سے آشنا کرتی ہے۔ قرآنِ حکیم دراصل سرچشمۂ حیواں ہے اور جب یہ صلوٰۃ میں پڑھا اور سنا جاتا ہے تو اس کی حیات بخش تاثیر وضو، مسجد، جماعت، نیز قیام و رکوع اور سجود کی بدولت دوچند ہو جاتی ہے۔ صلوٰۃ جہاں الٰہِ جمیل و ربِّ ذوالجلال والاکرام کے قرب و رضوان کا ذریعہ ہے، وہاں چشمۂ آبِ حیات بھی ہے، لیکن ان کے لیے جو شب و روز اپنی مزرعِ حیات کو اس سے سیراب کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ نشو و نما پائے اور ثمرات لائے، جن سے نمازی خود

بھی اور دوسرے بھی تمتع یا استفادہ کریں۔ یہ مفہوم ہے مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ کا:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝ (المعارج ۷۰: ۱۹ تا ۲۸) : انسان تھڑ دلا اور بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اُسے نقصان ہوتا یا تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے؛ اور جب اُسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بُخل کرتا اور ہاتھ روک لیتا ہے، مگر وہ لوگ ایسا نہیں کرتے (یعنی نہ مصیبت میں جزع فزع کرتے ہیں اور نہ خوشحالی میں بُخل کرتے اور مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے روک رکھتے ہیں)، جو (سچے اور پکے) نمازی ہیں۔ وہ نمازی اپنی صلوٰۃ کو پابندی سے قائم رکھتے ہیں؛ اور ان کے مال و دولت میں حصہ ہے جو (قرآن و سنۃ کی رُو سے سب کو) معلوم ہے، اس کے لیے جو اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے اور جو اپنے حصے سے محروم تو ہے، مگر اسے مانگتا نہیں؛ جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں؛ اور جو اپنے ربّ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں؛ بلاشبہ اُن کے ربّ کا عذاب ایسا نہیں کہ کوئی اس سے بے خوف ہو۔

(۲) حُسنِ زمان و مکان :

انسان بیک وقت دو جہانوں میں رہتا ہے: ایک اپنے الٰہ و ربّ العالمین کے پیدا کردہ جہانِ ارضی میں، جو حسین و نظر افروز ہے؛ دوسرے، اپنے پیدا کردہ باطنی جہان میں۔ دونوں زمان و مکان کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ احسن الخالقین نے آسمانوں اور زمین میں ہر چیز حسین و نظر افروز بنائی ہے؛ لیکن دُنیا کو خوب سے خوب تر بنانا، انسان کی ذمّے داری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر خاطرِ ہستی نے انسان کو جمالیاتی حِس اور ذوقِ حُسن ودیعت کیا ہے اور وہ اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے فطرۃً حُسن سے محبت کرتا اور حُسنِ عمل کے ذریعے اپنی

خارجی اور داخلی دنیا کی تزئین و تحسین کرنے کا داعیہ رکھتا ہے۔ اُسے اپنے گھر بار، ماحول اور مُلک، بلکہ کُل دُنیا کو حسین و نظر افروز دیکھنے کی آرزو ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھر بار، ماحول اور مُلک کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے کور ذوق اور حُسن کور افراد ہوں یا اقوام، اُن کے گھر بار، ماحول اور مُلک حسین و طیّب ہونے کے بجائے قبیح و گندہ ہوتے ہیں۔

باطنی دُنیا کا معمار انسان ہوتا ہے۔ اگرچہ احسن الخالقین نے اپنی سنّتِ حسنہ کے مطابق اسے بھی حسین بنایا ہے، لیکن یہ انسان ہے، جو اپنے افکار و اعمالِ قبیحہ سے اُسے قبیح و تاریک بناتا ہے۔ بخلاف اس کے، جو لوگ اہلِ ایمان و آرزو اور صالح و محسن ہوتے ہیں، وہ اپنے حُسنِ فکر و عمل سے اپنی باطنی دُنیا کو رشکِ جنّت بناتے ہیں؛ اور جنّت کی متعدد امتیازی خوبیوں میں سے چند ایک کی نشاندہی کر دی جاتی ہے: اوّل، وہ جمیل و جلیل اور منوّر و طیّب ہے۔ دوم، اس کی وسعت و پہنائی بے قیاس ہے۔ سوم، اس میں اہلِ حُسن و آرزو کو اپنے معروضِ حُسن و عشق کی دید و لِقاء اور قرب و حضوری اور رضا و ہمکلامی ایسی حسین نعمتیں نصیب ہوں گی۔ چہارم، اس میں زندگی سدا مطمئن و مسرور اور جمالیاتی ارتقاء کرتی رہے گی۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ وہ آتشِ خوف و حزن کے عذاب سے ہمیشہ محفوظ و مصئون رہے گی۔

حُسنِ زمان و مکان کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی خارجی اور باطنی دُنیا جنّتِ ارضی ہونی چاہیے۔ وقت بھی ہماری خارجی اور داخلی زندگی میں از بس اہم کردار ادا کرتا ہے۔ حُسنِ فکر و عمل سے وقت یا زمانہ ہماری زندگی کے لیے حسین و طمانیت انگیز اور کیف پرور و سُرور آفرین بنتا ہے۔ جس طرح شبِ عروسی میں عاشق کا وقت برق رفتار ہوتا ہے، اگرچہ وہ غایت درجہ لذّت آفرین و نشاط انگیز ہوتا ہے؛ کچھ اسی طرح اہلِ جذب و شوق اپنے حقیقی معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہِ جمیل) کے قرب و حضوری میں ہوں تو وقت ان کے لیے اِنتہائی سُرور انگیز و وجد آفرین بھی ہوتا ہے اور برق نمط بھی۔ بخلاف اس کے، اہلِ نار کی دُنیا ایک تو زندانِ تنگ و تاریک ہوتی

ہے، دوسرے اس میں وقت کی رفتار میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح عمر بھر کے قیدی کے لیے قیدِ تنہائی میں وقت کی رفتار تھم جاتی ہے اور وہ عفریت کی طرح بھیانک اور اذیت ناک بھی بن جاتا ہے۔

انسان کا خارجی و داخلی ماحول حسین و جنّت نگاہ ہو تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ وقت کی ہر آن، اس کے لیے آنِ جاودانی بن جائے۔ بخلاف اس کے، اگر ماحول قبیح و زندانِ خوف و حزن ہو تو وہ زمان و مکان سے فوری نجات حاصل کرنے کی تمنّا میں گھلتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرۃً حُسنِ زمان و مکان کی آرزو رکھتا ہے۔

نمازیوں کا شعارِ زندگی

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ احسن الخالقین ہے اور اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ تزویجی ہے، لہٰذا اس نے جو چیز تخلیق کی ہے، اُسے حسین اور جوڑا جوڑا بنایا ہے۔ دُنیا بھی اس کی تخلیق ہے، اس لیے جمیل و جلیل بھی ہے اور اس کا زوج یا جوڑا بھی ہے، جو دارالآخرت ہے۔ دارالآخرت کو قرآنِ مجید نے "الحیوان" سے تعبیر کیا ہے۔ الحیوان کا مطلب ہے مرگ نا آشنا جہانِ زندگی۔ بخلاف اس کے، دُنیا جہانِ حیات و ممات اور حادث ہے۔ اس دُنیا کو حسین و دلکش بنانے سے مقصود انسان کا امتحان لینا تھا (الکھف ۱۸: ۷)، کیونکہ انسان نے حسّی، قلبی، نفسی قوّتوں، آزادیِ ارادہ و اختیار، حرّیتِ فکر و عمل اور خلافتِ ارضی کے عوض امتحانِ زندگی دینا، قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہونا اور کامیابی کی صورت میں اپنے اِلٰہ و ربّ کی جنّتِ قرّۃ الاعین کے جمیل و جلیل نظاروں اور اس کی لذیذ و نظر افروز، جاں فزا و سرور انگیز نعمتوں، نیز اپنے معروضِ حُسن و عشق کے قرب و حضور میں ہمیشہ رہنا، اور ناکامی کی صورت میں جہنّم کے عذابُ النّار میں لذّتِ موت و حیات سے نا آشنا رہنا، برضا و رغبت قبول

کر لیا تھا۔ عذاب النّار میں رہنے کا خطرہ لینا ربِّ علیم و رحیم کی نظر میں انسان کا ظلم و جہل تھا۔ بہر حال، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو اپنے اس جمالیاتی تخلیقی شہکار کی آرزو کا پاس بھی تھا اور اس سے محبّت بھی بے پایاں تھی، لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ اس کی یہ خوبصورت و راست قامت اور دانا و بینا مخلوق امتحانِ زندگی میں ناکام اور حُسن و سُرور اور طمانیّت و حیاتِ طیّبہ سے محروم ہو کر رہینِ عذابُ النّار نہ بن جائے، بلکہ امتحانِ زندگی میں کامیاب و کامران ہو کر نفسِ مطمئنّہ بن جائے، حیاتِ طیّبہ گزارے اور پھر جنّتِ قُرّۃُ العین میں اس کے قرب و حضور، لذیذ و جانفزا، کیف پرور و سُرور انگیز اور بے قیاس و لامتناہی نعمتوں میں حیاتِ ابدی گزارے۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر اُس نے انسان کو ایک تو حسّی، قلبی، نفسی قوّتیں ودیعت کر دیں، جسے معنوی یا موضوعی ہدایت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے، اپنے انبیاؑ و رسل علیہم السّلام کے ذریعے اسے معروضی ہدایت بصورتِ وحی و تنزیل عطا کی۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ اور رسولوںؑ نے اس معروضی ہدایت کی روشنی میں دنیا میں احسن و اکمل اور کامیاب و مثالی حیاتِ طیّبہ گزاری، جس میں لوگوں کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔

تاریخِ ادیانِ عالم اور کتبِ سماوی، خصوصاً قرآنِ عظیم میں تدبّر یا لحق کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دنیا میں نفسِ مطمئنّہ بن کر حیاتِ طیّبہ گزارنے اور امتحانِ زندگی میں کامیاب ہونے کا احسن و اکمل ذریعہ صلوٰۃ ہے، بشرطیکہ وہ سچّی، حسین اور کامل ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مصلّین یا نمازی ہوتے ہی وہ ہیں جو صفاتِ الٰہیہ کا شعور اور معرفتِ نفس رکھتے ہیں، نیز صلوٰۃ کو دائماً و مستقلاً قائم کرتے، اس کے معانی اور تقاضوں کو سمجھتے اور انہیں باحسن وجوہ پورا کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایسی صلوٰۃ ہی قُرّۃُ العین ہوتی ہے اور اہلِ آرزو کو "احسان" کے مقاماتِ شاہدیّت و مشہودیّت پر متمکن کرتی اور ان کو عظیم کامیابی یعنی جنّت کی حیاتِ جانفزا و سرمدی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ ایسی حسین و کامل صلوٰۃ قائم کرنے والے نمازیوں کا شعارِ زندگی کیا ہوتا ہے؟ قرآنِ مجید نے اسے اپنے ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ

ہر آیۂ جمیلہ اعجازِ معنوی ہے:

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝..... اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝.... وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝ (المعارج ۷۰: ۵ تا ۳۵):

پس صبر کر جو صبرِ حسین ہو۔ لوگ عذاب (جہنم) کو دور (یا بعید از امکان) خیال کرتے ہیں اور ہم اسے نزدیک دیکھ رہے ہیں۔ (وہ عذاب اس روز ہوگا) جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ رنگ برنگ کی دُھنکی ہوئی اون جیسے ہو جائیں گے اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو (شدّتِ عذاب کے سبب) پوچھے گا بھی نہیں، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم تمنّا کرے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو، جو اُسے پناہ دینے والا تھا، اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں (یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا)۔ وہ تو شعلہ افگن آگ کی لپیٹ ہوگی، جو گوشت پوست کو چٹ کر جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف ہر اس شخص کو بلائے گی، جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ نیز جس نے دولت جمع کی اور اسے بند کر رکھا۔

انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے (اور دولت کو روک لیتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا)۔ ان چیزوں سے مستثنیٰ مصلّین یا نمازی ہیں، جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں (یعنی جو صلوٰۃ بھی ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور اس کے حقوق بھی، نیز جو اس کے تقاضے بھی علی الدوام پورے کرتے ہیں اور جن کے مال و دولت میں سائل یعنی اپنے حق کا مطالبہ کرنے والوں اور محروم یعنی اپنے حق سے محروم لوگوں کا حصّہ ہے، جو اہلِ ایمان کو معلوم ہے، جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بلاشبہ اس کا عذاب ایسی چیز نہیں،

جس سے کوئی نذر ہو جائے؛ جو اپنی شرم گاہوں (یا آج کل کی اصطلاح میں جنس SEX) کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی مملوکہ عورتوں کے، جن سے حفاظت نہ کرنے میں کوئی ملامت یا مضائقہ نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہیں (یعنی ہم جنسی فعل یا زنا وغیرہ) تو وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد (= قول و قرار) کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں، جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ جنّت کے باغوں میں عزّت و آبرو سے رہیں گے۔

محوّلہ بالا آیاتِ جلیلہ انتہائی اہم و غور طلب ہیں۔ ان میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے آخرت کے حوالے سے فلسفۂ حیات و صلوٰۃ کے بعض بنیادی حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ سب سے پہلے اس نے قیامت و دوزخ کی بعض ہولناک و شکیب رُبا اذیتوں اور اہلِ نار کی عبرتناک و کرب ناک کیفیات کا ذکر کیا ہے اور ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ جہنّم میں دو قسم کے لوگ جائیں گے: اوّلاً، منکرینِ حق۔ حق سے مراد ایک تو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے جو الحُسن والحق اور نوعِ انسانی بلکہ جُملہ مخلوقات کا اِلٰہ و ربّ ہے۔ دوسرے، اس کا کلام مطہّر و مکرّم قرآنِ عظیم ہے، جو آئینۂ حُسن و حق ہے۔ تیسرے، صلوٰۃ، جس کی روح حق ہے اور جو حق کے اظہار و اعتراف اور الحق کی بندگی کا احسن و اکمل طریقہ ہے۔

ثانیاً، بخیل سرمایہ دار یا قارون:

اہلِ نار کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ایتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے احکامِ اِلٰہیہ پر عمل کرنے کے بجائے ان سے روگردانی کرتے اور فرار کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کا مطلب دُہرا ہے: ایک یہ کہ ہر صاحبِ نصاب اہلِ ایمان پر زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ دوسرے صاحبِ نصاب رعایا سے اپنے عُمّال کے ذریعے شریعت کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے خزانۂ عامرہ میں جمع کرانا اور کفالتِ عامّہ کا نظام قائم کرنا حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔ انفاق بالعفو کا مطلب معاشرے کے عام معیارِ زندگی کے مطابق جائز ضروریات سے زائد مال و دولت کو حکومت کے

خزانۂ عامرہ میں جمع کرانا ہے تاکہ حکومت رعایا کی احسن طریق سے کفالت کرنے پر خرچ کرے۔ جو لوگ نہ تو زکوٰۃ دیتے ہیں اور نہ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ ہی کرتے ہیں، وہ اکتناز و احتکار اور بُخل کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا دوزخ کا دردناک و رسوا کن عذاب ہے۔

فاطرِ ہستی جانتا تھا کہ دوزخ کے اس زہرہ گداز عذاب کا بیان پڑھ کر آخرت پر یقین رکھنے والوں کے دلوں میں اس سوال کا پیدا ہونا فطری امر ہے کہ عذابُ النّار سے محفوظ و مصئون کیسے رہا جا سکتا ہے؟ چنانچہ اس نے ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے کہ اس عذاب سے محفوظ سچے مُصَلّین یا نمازی ہی رہیں گے، جن کی پہچان اور شعارِ زندگی یہ ہے کہ ایک تو وہ اقامتِ صلوٰۃ کی علی الدّوام پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صلوٰۃ کے فرائض و واجبات اور لوازمات و مقتضیات کو پورا کرنا ان کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حصّہ ہوتا ہے، جو اپنے حصّے سے محروم اور مطالبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان آیاتِ جلیلہ میں حقِّ معلوم، محروم اور سائل قرآنِ حکیم کی ازبس اہم و فکر انگیز اقتصادی اصطلاحات ہیں۔ ان کی صراحت کر دینا اس لیے ضروری ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیّت کا دورِ استبداد آیا تو استحصالی و سرطانی اداروں نے لوگوں کا استحصال اور ان کے حقوق غصب کرنے، نیز انھیں ان کے حقوق سے بے خبر و ناآشنا اور ان کا مطالبہ کرنے سے باز رکھنے کی خاطر ان اصطلاحات کا مفہوم تاویلِ باطل کے طاغوتی۔ آزری فن کے ذریعے اس طرح بدل ڈالا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اہلِ علم و دانش کو بھی ان کے قرآنی معانی و مفہوم کا شعور نہ رہا۔

حقِ معلوم قرآنِ حکیم کی ذو معنی اصطلاح ہے۔ اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ قومی پیداوار یا دولت کی تقسیم قرآنِ حکیم کے دو اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے، جو تلامیذ القرآن کو معلوم ہیں: اولاً، اصُولِ سعی و محنت۔ ثانیاً، اصُولِ عدل و احسان۔

اصُولِ سعی و محنت یہ ہے کہ پیداوار یا منافع میں جملہ کارکنوں کے حصّے کی تعیین ان میں

سے ہر ایک کی سعی و محنت کی کیفیت کے مطابق ہونی چاہیے؛ لیکن کم سے کم حصّہ اتنا ضرور ہونا چاہیے، جس سے ہر کارکن اپنے خاندان کی کفالت آبرومندانہ طریقے سے کر سکے، اور وہ کسی کا محتاج و دست نگر نہ رہے۔ اصولِ محنت وسعی سے یہ استقرائی استنباط کر سکتے ہیں کہ "پیداوار میں سرمائے کا حصّہ نہیں ہوگا"۔ الغرض، یہ "محنت کرو اور کھاؤ" کا اصول ہے۔ علاوہ بریں، سرمائے یا اصل زر پر منافع یا پیداوار میں سے حصّہ لینا سود ہے، جو اسلام میں حرامِ مطلق ہے۔ اصولِ محنت وسعی سے مستثنیٰ وہ لوگ ہیں جو کسی وجہ سے محنت و مشقّت کرنے کے قابل نہ ہوں، مثلاً اپاہج، معذور و بیمار، ضعیف و پیر، نابالغ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اصولِ سعی و محنت مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ کا استقرائی استنباط ہے:

اوّل، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ؕ (البلد ۹۰: ۴): بلاشبہ ہم نے انسان کو محنت و مشقّت میں پیدا کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محنت و مشقّت کرنا انسان کا مقدّر ہے؛ لہٰذا محنت وسعی کرنا اس کے لیے ناگزیر اور اس پر فرض ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ محنت نہ کرنا یا اس سے عار محسوس کرنا عدم ادائیگیِ فرض ہے، جو گناہِ کبیرہ ہے۔ علاوہ بریں، جو شخص محنت و مشقّت نہیں کرتا، وہ ایک تو ربِّ کریم کی ودیعت کردہ جسمانی و حسّی اور قلبی و نفسی قوّتوں کی تکفیر یا کفرانِ نعمت ایسا گناہِ کبیرہ کرتا ہے، جو زوالِ نعمت کا باعث بنا کرتا ہے۔ دوسرے، وہ اپنی شہری، قومی اور انسانی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتا اور یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ تیسرے، ایسا شخص بیکار اور معاشرے پر بارِ گراں ہوتا ہے اور اس کی زندگی بے مقصد و لامعنی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص ہی معاشرتی سرطان ہوتے ہیں، مثلاً قارون و سود خور، آزر اور دیگر ہر قسم کے جرائم پیشہ لوگ۔ ایسے لوگ اہلِ نار ہوتے ہیں۔ محوّلہ بالا آیۂ جلیلہ کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ انسان کو محنت و مشقّت کے ذریعے اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت اور قومی پیداوار میں اضافہ کرنا چاہیے۔ یہ یاد رہے کہ حُسنِ محنت سے کمائی ہوئی روزی ہی حلال و طیب ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ناجائز کام اور جرائم کا ارتکاب کرنے میں سعی و محنت کرنا

پڑتی ہے، لیکن ایسی محنت و سعی غیر تخلیقی، تخریبی، فسادی اور قبیح ہوتی ہے اور اس کی طرح اس کی کمائی بھی ناجائز و حرام ہوتی ہے، اور اس کے اثرات رہزنِ حسن و ایمان، غارتگرِ طمانیت و نور اور نار آفرین ہوتے ہیں۔ کسبِ حرام انسان کو سُمندر سرشت و اہلِ نار بنا دیتا ہے۔

دوم: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ (النجم ۵۳: ۳۹ تا ۴۰): اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اُس نے سعی و محنت کی ہے اور بلاشبہ اس کی سعی دیکھی جائے گی، یعنی اس کی کوشش کی کیفیت و کمیت اور نیت کا اندازہ لگایا جائے گا۔ یہ آیۂ جلیلہ سعی و محنت کے معاوضے کے اصول کی آئینہ دار ہے، جس کا اطلاق دُنیا اور آخرت دونوں پر ہوتا ہے۔ بلحاظِ دُنیا یہ تقسیم پیداوار کا اصل الاصول ہے۔ اس کی رُو سے قومی دولت یا پیداوار میں ہر محنت کش کو حصہ اس کی سعی و محنت کی کیفیت و کمیت کے مطابق ملنا چاہیے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ جو شخص سعی و محنت نہیں کرتا، قومی پیداوار میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر پیری، بیماری، حادثے وغیرہ کے سبب وہ قومی پیداوار میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہا یا اسے کرنے کو کوئی کام نہیں ملتا تو اس صورت میں اس کی کفالت کی ذمّے داری حکومت کی ہوگی۔ بصورتِ دیگر، وہ حق و حلال کی روزی نہیں کھائے گا۔ الغرض، ہر شخص اپنی سعی و محنت کے مطابق اجر کا حقدار ہے، دنیوی زندگی ہو یا اُخروی زندگی۔

سوم: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ (البقرۃ ۲: ۲۸۶): اللہ کسی متنفس پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمّے داری نہیں ڈالتا۔ ہر شخص کے لیے وہی ہے جیسی اُس نے کمائی کی ہے اور جو کچھ اُس نے پایا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے۔

اس آیۂ جلیلہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اکتساب معیارِ معاوضہ ہے اور ہر انسان پر لازم ہے۔ ظاہر ہے اکتساب، محنت و سعی کو چاہتا ہے (نیز دیکھیے البقرہ ۲: ۲۶۷)۔

چہارم: وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ

اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ (فصلت ۴۱: ۱۰) اُس نے زمین پر پہاڑ بنا دیے اور اس کے اندر برکتیں رکھ دیں اور اس میں چار ادوار میں مخلوقات خصوصاً بنی آدم کے لیے ان کی حاجت کے مطابق رزق کے سامان رکھ دیے۔ وسائلِ رزق سب مطالبہ کرنے والوں کے لیے ان سے متمتع ہونے کے مواقع برابر ہیں۔

اس آیۂ جمیلہ کے مضمرات میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں کُل نعمتیں اپنے جملہ بندوں کے لیے ودیعت کی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں سب برابر ہیں؛ لہٰذا کوئی طاقت کسی ایک یا زیادہ لوگوں کو ان سے تمتع کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ دوسرے، کوئی طاقت وسائلِ پیداوار پر بزور قبضہ جما کر دوسروں کو ان سے محروم نہیں کر سکتی۔ رزق سب کے لیے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب کو برابر حق ہے۔

ثانیاً، تقسیمِ پیداوار کا دوسرا اُصول عدل و احسان ہے۔ عدل یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے اُسے پورا پورا دیا جائے۔ احسان یہ ہے کہ کسی کے لیے ایثار و قربانی کر کے اُسے اس کے حق سے زائد اس حُسنِ نیّت سے دیا جائے کہ وہ راضی خوش ہو جائے۔ یہ اُصولِ قرآنی ہے جیسا کہ مندرجۂ ذیل آیۂ قرآنی سے ثابت ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۹۰): بلاشبہ اللہ (سُبحانہٗ وتعالیٰ) عدل و احسان اور اعزّہ و اقرباء کو (اپنے مال و دولت میں سے ان کا حصّہ) دینے کا حُکم دیتا ہے، بُخل و بے حیائی، جرم و گناہ اور ظُلم و استحصال سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے اس حکم میں بہت سے حقائق مضمر ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں عدل و احسان اور ایتائے اعزّہ و اقارب کا فقدان ہو، اس کے نتیجے میں وہاں فحاشی، بے حیائی و بُخل (فحشاء)، اور بدی و شر، ظُلم و استحصال اور جُرم و گناہ (= مُنکر)، نیز

فساد و عدوان اور حدود اللہ سے تجاوز (= یعنی) ایسی سرطانی بیماریاں اور برائیاں پھیل جاتی ہیں۔ چنانچہ اپنے جمالیاتی تخلیقی شہکاروں کو ان مہلک امراض و شرور سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی خاطر ربِّ رحمٰن نے لوگوں کو دوسروں کے ساتھ عدل و احسان کرنے کا اور اعزّہ و اقارب کو اپنے مال و دولت میں سے ان کا حق دینے کا حکم دیا ہے، جس کی تعمیل لازمی یا فرض ہے۔

جہاں تک اقتصادی عدل کا تعلق ہے، اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ کاروبار ہو یا صنعت و حرفت، تاجر و دکاندار ہوں یا صنعت و حرفت کار، مزدور ہوں یا کاریگر، الغرض جملہ کارکنوں پر دیانت و امانت، حق و صداقت اور انصاف کو روا رکھنا فرض ہے؛ اور کاروبار کا سود و فریب اور ظُلم و استحصال وغیرہ سے پاک ہونا لازمی ہے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ کاروبار میں، چاہے صنعت و حرفت ہو یا تجارت و زراعت وغیرہ، جُملہ شرکائے کار میں سے ہر ایک کو حصّہ اس کی سعی و محنت کی کیفیّت و کمیّت کے مطابق نہ کہ طلب و رسد کے مروّجہ استحصالی اُصول کے مطابق ملنا چاہیے۔ الغرض تقسیمِ پیداوار کا اُصول عدل و احسان ہونا چاہیے۔

اب قرآنِ مجید کی بقیّہ دو اصطلاحات "محروم" اور "سائل" کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ یہ دونوں قرآنی اصطلاحات نہایت فکر انگیز اور اسلامی اقتصادی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

محروم قرآنِ حکیم کی رُو سے وہ شخص ہے جو ربّ العالمین کی نعمتوں سے جو اس نے دُنیا میں اپنے جُملہ بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، اپنے حصّے سے محروم ہو۔ اس محرومی کا سبب خواہ سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا ظُلم و استحصال، جبر و اکراہ یا ان کی قوّت و اجارہ داری ہو، یا محروم کی پیری و ضعیفی، یتیمی و بے چارگی، بیماری و معذوری یا بے روزگاری و مجبوری وغیرہ وغیرہ۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح قومی پیداواری کاموں میں حصّہ لینا ہر شخص پر فرض ہے، جو حصّہ لینے کے قابل ہو، اسی طرح قومی پیداوار میں ہر شخص کا حصّہ ہوتا ہے اور وہ اپنا حق لینے کا سزاوار و مجاز ہے۔ چنانچہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کو اس کا

حق دے یا دلوائے، خواہ وہ اس کا مطالبہ کرے یا نہ کرے۔

سائل: اگر محروم اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ سائل ہے اور اس کا مطالبہ پورا کرنا حکومت کی ذمّے داری ہے۔ اسلامی معاشرے میں سائل تو ہو سکتا ہے، لیکن گداگر نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ گداگری ننگِ انسانیت ہے۔ دوسرے، اسلامی حکومت رعایا کی کفالتِ کُلّی کی ذمّے دار ہے۔

سورۂ معارج کی محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ میں سچّے نمازیوں کی صفات اور شعارِ زندگی کی جو نشاندہی کی گئی ہے، ان سے مزید بحث کی جاتی ہے۔

ایک یہ کہ سچے نمازی صلوٰۃِ پنجگانہ کی پابندی کرتے ہیں؛ یعنی اس کے فرائض وواجبات اور مقتضیات کو پورا کرتے ہیں۔

دوسرے، وہ اپنے آپ کو اپنے مال و دولت کے امین سمجھتے ہیں اور اس میں سائل اور محروم لوگوں کا حق یا حصّہ تسلیم کرتے اور اسے زکوٰۃ کی صورت ادا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد دولت کو ایسے لوگوں کی کفالت اور ان کی مفاجاتی و مستقل حاجات کو پورا کرنے کی خاطر حکومت کے خزانۂ عامرہ میں داخل کرا دیتے ہیں کہ یہ صحیح اور باعزّت طریقۂ امداد ہے۔

تیسرے، وہ قانونِ مکافاتِ عمل اور روزِ حساب کو برحق تسلیم کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وہ جزا کے اس اصل الاصول کو مانتے ہیں کہ قدرت کے قانونِ مُجازات کی رُو سے انسان کو اپنے اعمال کا بدلہ ساتھ ساتھ بھی ملتا رہتا ہے اور روزِ حساب بھی ملے گا۔ ہر صاحبِ دل انسان اس نفسیاتی حقیقت کا شعور رکھتا ہے کہ حُسنِ عمل کے حسین و طمانیّت انگیز اثرات ہوں یا جرم و گناہ کے منفی و قبیح اور خوف آفرین و غم انگیز اثرات فوری طور پر قلب پر مرتّب ہوتے ہیں، لیکن سچے نمازی ساتھ اس حقیقت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کے روز انسان کے جملہ اعمال کا محاسبہ ہو گا اور ان کی نوعیت کے مطابق اُسے جزا و سزا دی جائے گی؛ یعنی وہ جنّت میں جائے گا یا دوزخ میں۔

چوتھے، وہ عذاب کو برحق ہی نہیں مانتے بلکہ اس سے خوف بداماں رہتے ہیں۔ یہ خوفِ عذاب ہے جو انسان کو جرم و گناہ سے باز رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

پانچویں، وہ مناکحت کے ذریعے ازدواجی زندگی کی جنسی و جمالیاتی لذت اور دیگر برکات سے مستفید تو ہوتے ہیں مگر زنا و جنس فروشی سے گریزاں و ترساں رہتے ہیں، اور اپنے جنسی اعضاء و جوارح کی حفاظت کرتے تھے، چھٹے سچے نمازی امین ہوتے ہیں اور اپنی امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ امانت کی ایک معروف قسم تو یہ ہے کہ لوگ مال و دولت، زیورات یا کوئی اور چیز ان کے پاس امانت کے طور پر رکھتے ہیں تو ان کی حفاظت کرنا اور ان کے مطالبے پر امانتوں کو صحیح سالم حالت میں ان کو بلا تاخیر واپس کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔

امانت کی دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، جسے وہ ہر شخص کو ودیعت کر کے دنیا میں بھیجتا ہے۔ یہ ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی کی امانت ہے۔ اس امانت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اس آزادی میں خیانت نہ کی جائے، بلکہ ربِّ کریم کی مشیّت کے مطابق اس کا حسین طریقے سے استعمال کیا جائے، تیسرے، ہمارا حسّی، قلبی، نفسی نظام بھی ربِّ کریم کی امانت ہے، لہٰذا ہمیں ہر نظام کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہیے۔ حواسِ خمسہ میں سے خاص طور سے سامعہ و باصرہ کی، قلب میں عقل و فکر کی اور نفس میں سے لوّامہ و امّارہ دونوں کی حفاظت کرنا فرض ہے اور نہ کرنا خیانت ہے۔ امانت کی چوتھی قسم خلافتِ ارضی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی صورت میں اپنی رعایا رکھتا ہے؛ مثلاً اہل و عیال، ملازمین، سرکاری ہوں یا نجی وغیرہ وغیرہ۔ اپنی رعایا کے حقوق اور ان کے مال و جان اور عزت و ناموس کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرنا ہر راعی کی ذمہ داری ہے۔ اگر انسان خلیفہ یا حکمران، والی یا صاحبِ اقتدار شخصیت ہو تو اپنی خلافت کی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونا اس کا فرض ہے۔ جو حکمران، والی یا حاکم اپنے فرائضِ منصبی کو پورا نہیں کرتا، وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ربِّ کریم کی اہم ترین امانت ہیں، اور ان حقوق کو ادا

کرنا بھی انسان کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ جو شخص اس ذمّے داری کو پورا نہیں کرتا، وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حقوق اللہ کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے اس کی عبادت یا بندگی، جس کی احسن و اکمل صورت صلوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کو اگر حقوق العباد کا خلاصہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ قرآن عظیم ان دونوں حقوق کے لیے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تعبیریں بکثرت استعمال کرتا ہے۔ اِقامتِ صلوٰۃ کا مطلب دہرا ہے۔ انفرادی لحاظ سے اس کا مطلب صلوٰۃ کی ہمیشہ پابندی کرنا اور اس کے فرائض و واجبات اور لوازمات و مقتضیات کو پورا کرنا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے اس سے مراد نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا ہے۔ نظامِ صلوٰۃ کا مرکز "مسجد" ہے، جو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا مقدّس گھر اور اسلامی ثقافت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کا مرکز ہے۔ مسجدِ نبوی جو ہمارے لیے حسین نمونہ ہے، بیک وقت دار العلوم، تربیت گاہ، عدلیہ، عسکری ہیڈکوارٹر، دفترِ انتظامیہ اور مرکزِ ثقافت تھی۔ یہ اسلام کی پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی۔ اس میں نصابِ قرآن کے مطابق تعلیم و تربیت دی جاتی تھی، طلباء کا تزکیہ کیا جاتا تھا، یعنی ان کے قلوب کی تطہیر و تحسین اور اخلاق کی تہذیب اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کی جاتی تھی؛ ان میں قوائے مضمرہ کو قوت سے فعل میں لایا جاتا، اور ان کو زندہ و فعّال بنایا جاتا تھا؛ نیز ان میں تقویٰ پیدا کیا جاتا تھا۔ علاوہ بریں، ان میں اِلٰہ و ربّ کے قُرب و رضوان، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حُسنِ زندگی، حُسنِ انقلاب اور حُسنُ المآب کے ساتھ اِتمامِ نور یا جمالیاتی اِرتقائے مدام کی آرزو زندہ و فعّال کی جاتی تھی۔ اس یونیورسٹی میں قرآنِ حکیم کے علوم، حکمت اور اپنے زمانے کے لحاظ سے علومِ نو اور ادب کی تعلیم بالقلم دی جاتی تھی؛ نیز انہیں عسکری تعلیم و تربیت بھی دی جاتی تھی۔ مسجد ہی اصل میں ثقافتی مرکز تھی، جسے انگریزی میں کمیونٹی سنٹر (COMMUNITY CENTRE) کہتے ہیں۔ اس میں شادی بیاہ ہوتے تھے؛ اجلاس ہوتے تھے؛ مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے؛ ذکر و فکر کی مجلسیں جمتی تھیں؛ ملکی امور سرانجام پاتے تھے؛ داخلی اور خارجی حکمتِ عملی کی راہیں متعیّن کی جاتی تھیں۔ یہ مجلسِ شوریٰ اور مجلسِ قانون ساز

بھی تھی۔ یہ ہے نظامِ صلوٰۃ، جسے قائم کرنا سچے نمازیوں کا شعار ہے؛ نیز یہ ہیں حقوق اللہ جنہیں ادا کرنا سچے نمازیوں کا شیوہ ہے۔

حقوق العباد کا خلاصہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اس کی مزید صراحت کر دی جاتی ہے۔ ایک مفہوم تو معروف ہے۔ نصابِ زکوٰۃ کے مطابق حکومت کو ڈھائی فیصد شرحِ حساب سے رقم دینا تاکہ وہ کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت پر بھی ایتائے زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا ایک فریضہ تو یہ ہے کہ اپنے عُمّال کے ذریعے صاحبِ نصاب رعایا سے زکوٰۃ وصول کرنا اور دوسرا فریضہ یہ ہے کہ "زکوٰۃ" اور "عفو" سے بیت المال میں جو مال و دولت جمع ہو، اس سے کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا تاکہ کوئی شخص کم سے کم بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔

ہر انسان ہر شعبۂ حیات میں اپنے حقوق رکھتا ہے، لہٰذا ان کی فہرست بہت طویل ہے یہاں اہم ترین حقوق میں سے دو ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ غور کریں تو "آزادی" انسان کا بنیادی حق ہے۔ اس کا مطلب ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی ہے۔ یہ ربّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ ہے، جو اس نے امانت کے طور پر انسان کو ودیعت کی ہے؛ چنانچہ اس حقِ آزادی کا پاس و احترام کرنا، افراد و حکومت سب پر لازم ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ سچے مومن و نمازی نہیں ہوتے اور نہ ایسی حکومت اسلامی ہی ہوتی ہے۔ تکریمِ انسانی بھی اولادِ آدم کا بنیادی حق ہے، لہٰذا اس حق کو عملاً تسلیم کرنا اور بغیر کسی امتیاز کے جملہ افرادِ نسلِ انسانی کی عزت و تکریم کرنا ہر فردِ بشر پر لازم ہے۔ تکریمِ انسانی صلوٰۃ کا ازبس اہم تقاضا بھی ہے اور خاصہ بھی: لہٰذا سچے نمازی بغیر کسی امتیاز کے سب بنی آدم کی عزت و تکریم کرتے ہیں، لیکن کسی کو حقیر یا "چھوٹا" اور اپنے آپ کو "بڑا" نہیں سمجھتے۔ جو لوگ حقارت سے محنت کشوں کو "کمی"، ہاری، شودر وغیرہ کہتے اور سمجھتے اور ان کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں، قرآنِ مجید کی رُو سے وہ تکبر اور تکذیبِ دین کرتے ہیں۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، رعایا کے عائلی، سیاسی، اقتصادی، دینی، عمرانی، ثقافتی اور مذہبی حقوق کا احترام کرنا اور ان کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرنا، اس کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ جو حکومت اس ذمّے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی، وہ اسلامی نہیں ہو سکتی۔

حاصل کلام یہ کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پاس و احترام کرنا، سچے نمازیوں کا شعارِ زندگی ہوتا ہے اور جس معاشرے اور حکومت کا یہ دستور ہو، وہ اسلامی ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے، جو مسلمان نمازی ہونے کے باوجود حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پاس و احترام نہیں کرتے، وہ سچے مؤمن ہوتے ہیں اور نہ سچے نمازی اور ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں ہوتی۔ یہ ہے اسلامی و غیر اسلامی معاشروں اور حکومتوں کے پہچاننے کا معیار۔ الغرض حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس، اپنے اہل و عیال، قوم و ملت کے علاوہ دیگر جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے لیے بالخصوص اور ربّ کریم کی دیگر مخلوقات کے لیے بھی "رحمت" بن جائے۔

ساتویں: سچے نمازیوں کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے وعدوں یا قول و قرار کو پورا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ایفائے عہد ان کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ صدّیق و شہید اور صالح ہوتے ہیں اور دوسرے انہیں اس ارشادِ الٰہی کا پاس و احترام ہوتا ہے کہ

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴): وعدہ ایفاء کرو۔ بیشک عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔ علاوہ بریں، انہیں اس حقیقت کا بھی علم الیقین ہوتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۔۔۔۔ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝ (الرّعد ۱۳: ۲۵): جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے

کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو اُن تعلقات کو توڑتے ہیں، جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، وہ لعنت کے سزاوار ہیں اور اُن کے لیے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

سچے نمازی اہلِ حُسن و آرزو اور عذاب النّار سے خوف بداماں ہوتے ہیں، لہٰذا وفا شعار اور عہد کے پکّے ہوتے ہیں؛ چنانچہ اُن سے متعلق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰىؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝

(الرعد ۱۳: ۱۹-۲۰) کیا وہ شخص جو اس حقیقت کا علم الیقین رکھتا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو (کلام) تم پر نازل ہوا ہے، حق یعنی سچّا اور مقصدیّت و غایت رکھتا ہے، اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو حق کور ہو؟ بلاشبہ اہلِ عقلِ سلیم ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ عہد و پیان کو پورا کرتے اور عہد و پیان کو مضبوط باندھ کر نہیں توڑتے۔

آٹھویں: انسان طبعاً تھڑ دلا اور بے صبرا ہوتا ہے، لیکن نمازی ایسا نہیں ہوتا، بلکہ حوصلہ مند اور صبور ہوتا ہے (المعارج ۷۰: ۲۱ تا ۲۸)۔

نویں: مصیبت یا افتاد اور مفلوک الحالی کی حالت میں جزع فزع نہیں کرتا (المعارج ۷۰: ۲۳-۲۴)۔

دسویں: سچے نمازی شہید ہوتے ہیں اور ہر حال میں سچی شہادت دیتے اور پھر اس پر قائم رہتے ہیں۔ وہ نہ تو شہادت بدلتے ہیں اور نہ اُسے دینے سے گریز کرتے ہیں، خواہ انہیں اپنے والدین، اعزہ و اقارب، قوم حتیٰ کہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ دینا پڑے (النسآء ۴: ۱۳۵، المائدۃ ۵: ۸)۔

گیارھویں: سچّے نمازیوں کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ امرِ ربّی ہے؛ چنانچہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ حکم دیتا ہے:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ٥ (البقرۃ ۲۳۸:۲) : اپنی نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بن کر قائم رہو۔

یہ آیۂ جمیلہ اعجازاتِ قرآن میں سے ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے بین السطور میں پنجگانہ صلوٰۃ کی فرضیت مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس میں لفظِ صلوٰۃ کے فوراً بعد "والصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" کے الفاظ آئے ہیں۔ صلوٰت عربی میں جمع کا صیغہ ہے جو تین یا تین سے زائد اعداد پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ تین کا عدد اس اعتبار سے سالم نہیں کہ اس کا نصف ڈیڑھ صلوٰۃ ہے، لہٰذا اس سے مراد چار نمازیں ہیں اور واؤ کی وجہ سے صلوٰۃِ وسطیٰ پانچویں نماز ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حافظوا جو امر کا صیغہ ہے، ذومعنی لفظ ہے۔ اس کے معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانو! پانچوں نمازوں سے متعلق ہوشیار رہو، مبادا موضوعی معروضی شیطان اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے تمھیں ان کے قیام، نیز ان کے فرائض و واجبات اور لوازمات و مقتضیات سے غافل اور ان کے ظاہری و باطنی اور دنیوی و اُخروی فوائد و ثمرات اور فیوض و برکات سے محروم کر دے۔

اس ضمن میں ایک قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ یا عصر کی نماز (دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الصّلوٰۃ) کا خصوصیت سے علیحدہ ذکر کر کے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ علاوہ بریں عصر کے وقت انسان کی گوناگوں مصروفیات و مشاغل، کاروبار کی گرم بازاری، جسم کا اضمحلال، تکان اور اس کی خواہشِ آرام و راحت ایسے کئی عوامل ہیں، جو اسے اَلصَّلٰوۃُ العصر سے غافل کر سکتے ہیں؛ نیز شیطان بھی نمازیوں کو اپنی نماز سے غافل کرنے کے لیے ایسے مواقع کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ربِّ رحمٰن نے محض اپنے فضل و کرم سے اہلِ ایمان کو صلوٰۃِ وسطیٰ کی حفاظت کی خاص طور سے تاکید کی ہے۔

زیرِ نظر آیۂ جلیلہ میں اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کا دوسرا حکم بھی نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو اللہ جلّ شانہٗ کے حضور مطیع و فرماں بردار بندوں کی طرح صلوٰۃ قائم کرنی چاہیئے۔ اس کی اطاعت و فرماں برداری کا تقاضا یہ ہے کہ ایک تو صلوٰۃ کو خشوع و خضوع اور حضوریِ قلب کے ساتھ ادا کرنی چاہیے، اور دوسرے، اس نے اقامتِ صلوٰۃ اور اس کے فرائض اور تقاضوں سے متعلق جو احکام نازل کیے ہیں، ان کی تکمیل برضاو رغبت کرنی چاہیے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کے احکام کی بجاآوری میں مستعد و ثابت رہو اور اس کے سوا کوئی اور، چاہے فرعون و ہامان ہو یا قارون و آزر، احکامِ الٰہیہ کے مقابلے میں اپنے احکام کی تعمیل اور اپنی بندگی پر مجبور کریں تو ایسا کرنے کے بجائے اس کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔

آخر میں ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے بندوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا ہے کہ جو نمازی سچے ہوں گے، یعنی اس کے احکام پر عمل کرنا، اپنی نمازوں کی حفاظت کرنا اور ان کے فرائض و مقتضیات کو پورا کرنا ان کا شعارِ زندگی ہوگا، وہ اس کی جنّت میں عزّت و آبرو سے زندگی بسر کریں گے۔

صلوٰۃِ پنجگانہ

اسلام کے دشمن مستشرقین کے پراپیگنڈے سے متأثر ہو کر نام نہاد مُسلم دانشوروں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مجلسوں میں یہ سوال اُٹھانے کا عادی ہے کہ اسلام میں صلوٰۃِ پنجگانہ یا پانچ نمازیں اوقاتِ معینہ پر مسجد میں باجماعت ادا کرنا کیوں فرض ہے؟ کاش! وہ صلوٰۃ کے اِس تجربے سے گزرتے کہ اس میں تأثیرِ برقِ حُسن ہے اور قلب و جان کو جالیاتی ٹھنڈک پہنچاتی ہے، جسے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے "قُرّۃُ العین" سے تعبیر کیا ہے۔ ہمیں نفسیاتِ انسانی

کا یہ اصل الاصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر بچّے کو جمالیاتی حسن (AESTHETIC SENSE) ودیعت کر کے دنیا میں بھیجتا ہے، اس لیے انسان فطرۃً صاحبِ ذوق ہونے کی بنا پر جاہ و جلال، نُور و رنگ، پاکیزگی و صفائی اور نظافت و خوشبو کو پسند کرتا ہے چنانچہ اہلِ ذوق ہر روز مُنہ ہاتھ دھوتے، دانت صاف کرتے اور صاف سُتھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے، کیوں؟ اس کا جواب ہر شخص جانتا ہے کہ صاف ستھرے ماحول میں رہنے کے باوجود باہر کے گرد و غبار، فضا کی آلودگیوں اور موسم و ماحول کے اثرات سے، نیز جسم کے اندر مسامات کے ذریعے غلیظ و بدبودار مواد کے نکلنے سے انسان کا جسم اور لباس میلا کچیلا اور بدبودار ہو جاتا ہے اور وہ اُسے نہا دھو کر پاک و صاف رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ذوق طرح طرح کی خوشبویات، مختلف قسم کے صابن، خوشبودار تیل وغیرہ وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔

یہی صورتِ حال ہماری باطنی دُنیا کی ہے، جو عبارت ہے انسان کی حسّی، قلبی، نفسی دُنیا سے۔ ایک تو حواسِ خمسہ کے ذریعے ہماری باہر کی دُنیا کے اثرات خود بخود ہماری باطنی دنیا پر مرتّب ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہمارے افکار و خیالات، اوہام و ظنون، معتقداتِ نظریات، نیز خواہشات و تمنّیات، امیال و عواطف اور جذبات و تعصّبات کے اثرات۔ یہ اثرات منفی و حُسن رُبا، رہزنِ تمکین و ہوش، غارت گرِ ایمان و تقویٰ، نیز ہمارے جمالیاتی ارتقاء کے لیے سدِّ سکندری اور ہماری شمعِ محبّتِ الٰہی کے لیے بادِ صرصر بھی ہو سکتے ہیں۔ آج کل کے "سرطانی" معاشروں میں ان کے ایسا ہونے کے متعلّق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان اثرات کو سرطانی کہنا موزوں رہے گا۔ ان اثرات کو ساتھ ساتھ زائل کرنے اور ان کی "سرطانیت" سے اپنے بندوں کے نفوس کو محفوظ و مصئون رکھنے کی خاطر ربّ العالمین نے محض اپنے فضل و کرم سے صلوٰۃِ پنجگانہ کے قیام کو ان پر فرض کر دیا ہے۔ اجتماعی عبادت کی غیر معمولی افادیت و اہمیت کے پیشِ نظر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے صلوٰۃ باجماعت کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے صلوٰۃ باجماعت کے قیام کے وقت کا تعیّن ضروری تھا، لہٰذا اُس نے اس کے اوقات بھی مقرّر کر دیے؛

اور اپنے بندوں کو اپنے ملک، شہر اور علاقے کے جغرافیائی محلِ وقوع اور دیگر احوال و ظروف کے مطابق ہر صلوٰۃ با جماعت کے قیام کا وقت خود متعین کرنے کا اضافی و محدود اختیار بھی دے دیا۔

اسلام میں صلوٰۃ کی نوعیت اجتماعی یا انفرادی ہے، جہاں تک اس کے فرائض کا تعلق ہے، یہ بنیادی طور سے اجتماعی ہے، اگرچہ انفرادی طور سے ادا کی جائے تو وہ ادا ہو جاتی ہے؛ لیکن جہاں تک سُنَن و نوافل کا تعلق ہے، یہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

صلوٰۃ با جماعت میں اِجتماعیت پائی جاتی ہے۔ اگر اس کے لوازمات اور تقاضے پورے کیے جائیں تو اجتماعیت کے از بس اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اجتماعیت میں قوم کے معتقدات و نظریات اور افکار و جذبات میں ہم آہنگی و وحدت پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ دوسرے، اس سے افراد کے دلوں میں مودّت و ہمدردی، اخوّت و محبّت، آزادی و مساوات، عدل و احسان اور ایثار و قربانی کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں۔ تیسرے ان میں قومی تشخّص اور نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ قوم میں اجتماعیت پیدا ہو جائے تو وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں بُنیانِ مرصوص بن جاتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو مسجد میں با جماعت صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے نمازیوں کا وقتِ مقرّرہ پر جمع ہونا، ناگزیر تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے اوقاتِ معیّنہ پر قیام صلوٰۃ کو لازمی قرار دیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ۝ (النساء ۴: ۱۰۳)؛ دوسرے نمازیوں کو فریضۂ صلوٰۃ بر وقت ادا کرنے کے قابل بنانے کی خاطر اذان دینے کا اِذن فرمایا۔ اذان کے بولوں میں دریائے معانی بند ہے، فی الحال اس کے دو بولوں سے متعلق مختصر اشارے کیے جاتے ہیں، جو صلوٰۃ کی غیر معمولی اہمیّت پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک بول ہے: حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ؛ لفظی ترجمہ ہے: آؤ نماز کے لیے یا نماز کی طرف آؤ، لیکن یہاں صلوٰۃ

سے مرادِ اقامتِ صلوٰۃ کی جگہ یا مسجد ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ مسجد میں آؤ۔ یہ لول صلوٰۃ باجماعت کی فرضیت اور مسجد کی غیر معمولی اہمیت کا آئینہ دار ہے۔ ساتھ ہی دوسرا لول ہے:

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ: یعنی نشو و نما پانے، مادّی و حیاتیاتی ارتقاء کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے آؤ۔ اس اعلان سے مسلمانوں میں بالخصوص اس حقیقت کا شعور بیدار اور ایقان و اذعان پیدا کرنا مقصود ہے کہ قیامِ صلوٰۃ سے انسان (فرد ہو یا قوم) کی خودی نشوونما پاتی، ترقّی کرتی اور محکم و بار آور بنتی ہے۔ دوسرے، اس سے مصلّین یا نمازیوں کے حسّی، قلبی، نفسی نظام کا نور ارتقاء کرتا اور اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نور کے ارتقاء و اتمام کا سلسلہ لامتناہی ہے، اس لیے کہ وہ جو ہمارا الٰہ (= معروضِ حسن و عشق یا معبود، محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ (= رازق و نشوونما دینے والا آقا و مالک) ہے، اپنے حسن کی شانِ نو بنو میں ہر آن جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ ان تازہ بتازہ اور نو بنو جلووں کے مشاہدے کے لیے اہلِ حسن و سرور ہمیشہ یہ دعا مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے:

رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (التحریم ۶۶:۸): اے ہمارے نشوونما دینے والے مالک! ہمارے (باطنی یعنی حسّی، قلبی، نفسی) نور کی تکمیل کر دے اور ہماری حفاظت فرما (خطا و نسیان، ظلم و تغافل اور جرم و گناہ وغیرہ وغیرہ سے)۔ بلاشبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد اب صلوٰۃِ پنجگانہ سے ان کے اوقاتِ معیّنہ کے حوالے سے گفتگو کی جاتی ہے۔ ابتدا صلوٰۃ الفجر سے کرتے ہیں۔

صلوٰۃ الفجر یا نمازِ فجر طلوعِ آفتاب یا صبحِ صادق سے پہلے اور صبحِ کاذب کے بعد ہوتی ہے۔ اس نماز کی افضلیت و غیر معمولی اہمیت پر یہ نصِ قرآنی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے: اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۷۸): یعنی بلاشبہ صبح کا قرآن مشہود ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس آیۂ جمیلہ کے متعدد معانی لکھے اور تاویلیں کی

ہیں۔ جہاں تک تلمیذ القرآن کے تدبّر فی القرآن کا تعلق ہے، اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ صبح کے وقت حسّی، قلبی، نفسی نظام شب بھر کے آرام و راحت کے بعد اپنے فرائض سرانجام دینے کا داعیہ و صلاحیت رکھتا ہے، دوسرے اس وقت اس پر نفسیاتی دباؤ کم ہوتا ہے؛ تیسرے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات مطہّر و طیب ہوتے ہیں؛ چوتھے، اس میں حسن و حق کو قبول کرنے کی آرزو و استعداد فعال ہوتی ہے؛ پانچویں، سحر کے منیر و حسین اور جانفزا اور روح پرور اثرات کی بدولت قلب کی آنکھ بینا اور جمالیاتی حسّ زندہ و بیدار ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کے نتیجے میں اہلِ ایمان جب قرآنِ مجید سنتے یا اس کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کی روح قلب پر اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے۔ روحِ قرآنی سے مراد اس کی معنویت ہے۔ چنانچہ سچے تلمیذ القرآن پر قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب اور حقائق و معارف آشکارا ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں، اہلِ جذب و شوق کے لیے صبح کے عالم حسن و نور میں قرآنِ مجید آئینۂ "دوست" بھی بن جایا کرتا ہے۔ اس حقیقت کا حق الیقین ان اہلِ حسن و سُرور کو ہوتا ہے، جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

صلوٰۃِ فجر کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے اور اس کے ساتھ نمازی اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اگر اُسے اپنی جمالیاتی ثروت کا شعور ہو تو وہ دن بھر اس کی حفاظت کرتا رہے گا اور نفسی۔ ابلیسی شیطان کی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہے گا یا پناہ میں رہنے کی طلب و جستجو میں رہے گا۔ آغاز اچھا ہو تو انجام بھی اچھا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے صلوٰۃِ فجر کے قیام سے احسن و افضل اور کون سا آغاز ہو سکتا ہے؟ سحر ہر روز حسن و حسنہ اور حسنِ انقلاب؛ نیز زندگی اور "دوست" کی رحمت و مغفرت کا مژدۂ جانفزا لے کر آتی ہے، لیکن فقط اہلِ آرزو ہی اپنے الٰہ و ربّ کے حضور عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے ساتھ قیام و رکوع و سجود کرتے، اس کا کلام حسن و حق گوشِ حق نیوش سے سنتے اور اس سے جمالیاتی ثروت حاصل کرتے اور قلب میں "دوست"

کی شمع محبّت کو فروزاں کر کے اور اس کی یاد کو حرزِ جان بنا کر مسجد سے نکلتے اور اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ دل میں محبّتِ الٰہی کی شمع فروزاں ہو تو اہلِ حسن و عشق کو اپنے محبوب کی تخلیقات حسین دکھائی دیتی اور پیاری لگتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ ان کے لیے رحمت بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اسلام کی تحریکِ رحمۃُ للعالمینی کی غایت بھی ہے اور پیغمبرِ اعظم و آخر و رحمۃُ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّتِ حسنہ بھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ رحمۃ للعالمینی ہی درحقیقت آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مُسلم اقوام کے درمیان ہم آہنگی و ہم فکری، یکجہتی و یگانگت، ہمدردی و غمخواری، اخوّت و محبّت، عدل و احسان اور ایثار و قربانی کے فقدان کی وجۂ حقیقی یہ ہے کہ انھوں نے آپؐ کی سُنّتِ رحمۃُ للعالمینی کو صدیوں سے ترک کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان صدیوں سے اس اصلِ عظیم کو بھلا چکے ہیں کہ سُنّتِ حسنہ اصل میں رحمۃ للعالمینی ہے

میرے نزدیک اس کے ذمّے دار خاص طور سے آزری ادارے ہیں، جنھوں نے تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ذریعے قرآن و سُنّہ کے مفہوم ہی کو خاصا بدل ڈالا ہے۔ یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ بات صلوٰۃِ پنجگانہ کی ہو رہی تھی۔ صلوٰۃِ فجر کے بعد انسان کاروبارِ زندگی میں مشغول ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ دو پہر گزر جاتے ہیں۔ جس طرح محنت و مشقّت کرنے کے بعد جسم کو آرام و توانائی کی حاجت ہوتی ہے اور جسم کے اندر سے گندہ مواد پسینے کے ذریعے نکلتا اور اسے میلا کچیلا اور بدبو دار کر دیتا ہے؛ کچھ اسی طرح بیرونی ماحول اور اندرونی احوال و ظروف (مثلاً تخیلات و تصورات، خواہشات و تمنّیات، افکار و معتقدات وغیرہ وغیرہ) کے باعث نفسِ انسانی کو بھی صفائی و غذائیت اور توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر فاطرِ ہستی نے اپنی رحمت سے اپنے بندوں پر صلوٰۃِ ظُہر فرض کر دی۔

(۲) صلوٰۃِ ظُہر روح کا تزکیہ بھی کرتی ہے، اس کو راحت و آرام بھی پہنچاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے اس کے اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق کی یاد دلاتی ہے۔ یہ جسمانی

ورزش بھی ہے، جو دل و دماغ کو فعّال و تندرست رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس وقت وضو کرنے سے جہاں اعضاء و جوارح کو تسکین ملتی ہے، وہاں دماغ کا نظام بھی فعّال ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان تازہ دم ہو کر پھر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۳) صلوٰۃ العصر یا عصر کی نماز :

گرم ممالک میں خاص طور سے دوپہر اور عصر کا درمیانی وقت جسم و جان پر بارِ گراں ہوتا ہے۔ پھر کاروبار کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور آدمی اس قدر مشغول ہو جاتا ہے کہ اپنے اِلٰہ و ربّ کی یاد سے عموماً غافل ہو جاتا ہے۔ نفس کو یادِ الٰہی کی قوت بخش شرابِ طہور پلانے کی خاطر ربِّ رحیم نے صلوٰۃِ عصر کو نہ صرف فرض کر دیا بلکہ اس کی حفاظت کا خاص طور سے حکم دیا ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ٥ (البقرۃ ۲: ۲۳۸) : اس کا مطلب ہے : اپنی نمازوں کی حفاظت کرو، اور (خاص کر) درمیانی یعنی عصر کی نماز کی اور اللہ کے سامنے مطیع و فرماں برداروں کی طرح کھڑے رہا کرو۔

اس آیۂ جلیلہ کے بین السطور میں صلوٰۃِ پنجگانہ یا پانچ نمازوں کی فرضیّت کا ذکر ہے۔ میں اسے اعجازاتِ قرآن میں سے شمار کرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰت جمع کا صیغہ ہے، جو تین یا تین سے زائد نمازوں پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے واؤ کا حرفِ اختصاص ایک تو صلوٰۃ الوُسطیٰ یا عصر کی نماز کی غیر معمولی اہمیّت کا آئینہ دار ہے، تیسرے یہ صلوٰت کے عددِ سالم پر جو چار ہے، صلوٰۃِ عصر کے پانچویں عدد پر دال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰت سے اگر تین نمازیں مراد لی جائیں تو اس کا نصف نہیں بنتا، لہٰذا اس سے چار نمازیں مراد لیں تو اس کا نصف صلوٰۃ الوُسطیٰ ہے اور واؤ ایک عدد کے اضافے کی مظہر ہے۔ اس طرح اس آیۂ جلیلہ سے پانچ نمازوں کی فرضیّت ثابت ہوتی ہے۔ یہ آیۂ جلیلہ اس مکتبِ فکر کے لیے آئینۂ بصیرت ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید

سے پانچ نمازیں ثابت نہیں۔ علاوہ بریں، اس میں یہ نکتہ بھی بصیرت افروز ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے وقت نمازیوں کو اللہ جلّ شانہ، کے حضور مطیع و فرماں بردار بندوں کی طرح بڑے ہی عجز و انکسار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ بات صلوٰۃِ عصر کی اہمیت کی ہو رہی تھی۔ اہلِ جذب و شوق کا تجربہ ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان نفسِ مطمئنّہ اپنے معروضِ حسن و عشق کی یاد میں اس قدر بیقرار ہو جاتا ہے کہ اپنے قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہے، لیکن اہلِ آرزو کے سوا اپنے نفسِ مطمئنّہ کی اس کیفیّت سے عام لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں آفتاب کے غروب اور طلوع ہونے سے پہلے ذکرِ الٰہی کی بہت تاکید آئی ہے (آلِ عمران: ۳: ۴۱؛ طٰہٰ ۲۰: ۱۳۰؛ و بمواضعِ کثیرہ) محبّتِ الٰہی کی یہ کیفیّت انسان پر ہی نہیں، ہر مخلوق پر طاری ہوتی ہے اور ہر متنفّس اپنے الٰہ و ربّ کی یاد میں حمد و ثنا کے نغمے گاتا ہے، (الجمعۃ ۶۲: ۱)، لیکن یہ انسان ہے جو اپنے ظلم و جہل کے سبب اپنے نفس کی آرزوئے دوست اور اس کی کیفیّتِ بیقراری کو نہ تو محسوس کرتا اور نہ "اُسے" یاد ہی کرتا ہے، سوائے اہلِ جذب و شوق کے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کا اپنے الٰہ کو فراموش کر دینا، اس کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔

اگرچہ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت نسبتاً بہت کم ہوتا ہے، لیکن نفسِ مطمئنّہ کے لیے بیقراری کے سبب قیامت کا طولانی ہوتا ہے اور اس کا علاج اہلِ عشق و وفا بکثرت ذکرِ الٰہی کرنے سے کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ذکرِ الٰہی میں غور و فکر بھی شامل ہے، اللہ تعالیٰ کے حوالے سے آسمانوں اور زمین اور حیات و ممات کی تخلیق و مقصدیّت، نفس کے احوال و ظروف اور اس کی آخری تمنا میں، نیز قانونِ مکافاتِ عمل، دارالآخرت یا الحیوان (= یوم الدین، جنّت و دوزخ) وغیرہ وغیرہ پر غور و فکر کرنا، ذکرِ الٰہی کی سب سے افضل و اعلیٰ شکل ہے۔ مختصر یہ کہ صلوٰۃ العصر انسان کو اس کے الٰہ و ربّ کی یاد دلاتی اور اس کی طرف بار بار رجوع

کرنے اور اس کے حوالے سے ظاہری، باطنی اور اُخروی جہانوں میں غور و فکر کرنے کی تحریک کرتی اور ترغیب و تشویق دیتی ہے۔

(۴) صلوٰۃ المغرب یا مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غروبِ آفتاب آیۂ الٰہی ہے، جو فکر انگیز و بصیرت افروز ہے۔ یہ انسان کو اس اصلِ عظیم کی یاد دلاتی ہے کہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن ۵۵: ۲۶-۲۷): یعنی ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہونے والی ہے؛ لیکن تیرے ربِّ جلیل و کریم کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ اور كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ..... مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (آلِ عمران ۳: ۱۸۵): ہر نفس نے لذتِ موت سے آشنا ہونا ہے اور تم سب اپنا پورا پورا اجر قیامت کے دن پانے والے ہو۔ کامیاب درحقیقت وہ ہے جو دوزخ کی آگ (کے عذاب) سے بچ گیا اور جنّت میں پہنچ گیا۔ جہاں تک دُنیا کی زندگی کا تعلّق ہے یہ تو محض متاعِ فریب ہے۔"

غروبِ آفتاب اس حقیقتِ نفس الامری کی بھی یاد دلاتا ہے کہ وہ اگر دُنیا کے ایک حصّے مثلاً مشرق میں غروب ہوتا ہے تو مغرب میں طلوع ہوتا ہے، اسی طرح انسان دُنیا میں مرتا ہے تو الحیوان میں زندہ ہوتا ہے، اپنے اعمال کا حساب دینے اور اپنی نیکیوں اور بدیوں کا اجر پانے کے لیے۔ قرآنِ مجید نے محولۂ بالا آیۂ جلیلہ میں فلسفۂ زندگی کا ماحصل یہ بیان کیا ہے کہ انسان کی حقیقی کامیابی آتشِ دوزخ کے عذاب سے بچ کر جنّت میں جانا ہے؛ اور جنّت کی کلید ذکرِ الٰہی ہے، جس کی ایک احسن صورت صلوٰۃ ہے۔

(۵) صلوٰۃُ العشاء:

مغرب کی صلوٰۃ کے بعد دن کی آخری صلوٰۃِ عشاء کا وقت آجاتا ہے۔ یہ صلوٰۃ کئی وجوہ کی بنا پر غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت نفس واماندگی و اضمحلال محسوس کرتا اور استراحت اور نیند کی حاجت محسوس کرتا ہے۔ دوسرے، نفسی، ابلیسی شیطان

بھی انسان کو ذکرِ الٰہی یا یہ صلوٰۃ قائم کرنے سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے اور خواہشات کو اپنی وسوسہ اندازی اور جالیاتی فریب کاری کے ذریعے حسین بنا کر دکھاتا اور ان کو پورا کرنے پر انسان کو اُکساتا رہتا ہے۔ چونکہ قبیح خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ظلمتِ شب بڑی سازگار ہوتی ہے، لہٰذا چوری، ڈکیتی، رہزنی، قتل و غارت اور جُرم و گناہ کی وارداتیں عموماً رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہیں اور اسی میں فحشاء و مُنکر کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اس واقعیت کے پیشِ نظر نفسِ مطمئنہ اپنے حریف موضوعی۔ معروضی شیطان کی وسوسہ اندازی و جالیاتی فریب کاری سے خوف کھاتا اور رب العزّت کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃِ عشاء تجویز کیا ہے، اور اسے اہلِ ایمان پر فرض کر دیا ہے۔

اوّلِ شب میں یادِ الٰہی ایک تو نمازی کے قلب کو نُور و طمانیت اور دوسرے خشیتِ الٰہی سے معمور کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا قلب جرم و گناہ اور فحشاء و مُنکر کے عبرتناک و المناک نتائج سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس میں اپنے الٰہ و رب کے قُرب و حضور اور دید و رضوان کی، نیز دُنیوی و اُخروی حسنہ، حُسنِ زندگی اور حُسنُ المآب کی آرزو فعّال و حرکی ہو جاتی ہے۔ صلوٰۃِ آخر کے بعد اہلِ آرزو کا قلب زندہ و بیدار ہو تو نیند کی حالت میں بھی شب بھر یادِ الٰہی میں رہتا ہے۔ اسے قلب کا جاری ہونا بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان نیند میں بھی عبادت کرتا رہتا ہے۔ اس طرح اس کی رات بھی عبادت میں گزرتی ہے۔ ایک تو وہ شب بھر کے زیاں سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرے، اس کا دامنِ زندگی حسنہ و خیر سے بھر جاتا ہے اور سوتے میں بھی اس کا جمالیاتی ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اہلِ ایمان و آرزو احسان کے مقامِ شاہدیت پر متمکن ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے حسین خوابوں اور جمالیاتی۔ ورائی مشاہدات سے بھی نوازتا ہے۔ اہلِ حُسن و سُرور جانتے ہیں کہ یہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی بہت بڑی نعمتِ حُسنیٰ و غیر مترقبہ ہے۔

تازہ اہلِ آرزو عموماً یہ سوال پوچھتے ہیں: کیا انسان اپنی مرضی سے مشاہدہ کرسکتا ہے؟ اس کا جواب تو نفی میں ہے؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ عشاء اور فجر، نیز عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان بالخصوص جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحات کی وقوع پذیری کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے ہی میں ایک تو اہلِ آرزو کے قلب کا جمالیاتی ثروت سے معمور و منوّر ہوجانے کا، اور دوسرے اس پر اس کے معروضِ حُسن و عشق (=اِلٰہ) کے صُوری جلوے کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ "دیدِ دوست" کی سچّی آرزو رکھنے والوں کے ذوقِ حُسن یا جمالیاتی ذوق کے معیار کی رعایت سے وہ انہیں اپنی صورت برنگِ مجاز دکھاتا ہے، اس لیے صُوری جلوے کا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں۔ ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ "دیدِ دوست" ایک تو مجازی رنگ میں ہوتی ہے، کیونکہ "وُہ" بے مثل و بے نظیر ہے اور دوسرے، محض اس کے فضل سے اہلِ آرزو پر دید کی نعمت ارزانی ہوتی ہے۔ "دیدِ دوست" ہو یا کوئی اور جمالیاتی۔ ورائی مشاہدہ، حتّٰی کہ رویائے صادقہ تک بھی "اُس" کے فضل سے میسر آتا ہے، اس میں انسان کے ارادہ و اختیار کا قطعاً عمل دخل نہیں ہوتا؛ البتّہ قدرت انسان کی سچّی آرزو کا احترام کرتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل میں سچّی آرزو پیدا ہو تو کیسے؟ اِحیائے آرزو کی ایک شرط اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ اور اس کے دین یا احکام پر ایمان لانا ہے۔ ایمان ایسے یقینِ مُحکم کو کہتے ہیں، جس میں شک کا شائبہ تک نہ ہو، بلکہ وہ طمانیت آمیز ہو۔ اصطلاح میں ایمان کا مطلب اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، کتابوں، رسولوں، نیز یوم الآخرت کو شک و شبہ کے بغیر اطمینانِ قلب کے ساتھ تسلیم کرنا اور ان عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو خون کی طرح اپنے اندر جذب کرکے ان کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی کرنا ہے۔ علاوہ بریں، اہلِ ایمان کو اس حقیقت کا بھی ایقان و اذعان ہو کہ اللہ تعالیٰ اُن کا ربّ بھی ہے اور اِلٰہ بھی۔ دوسرے، اِحیائے آرزو کے لیے تزکیۂ نفس ناگزیر ہے۔ تزکیہ سے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی تطہیر و تحسین ہوجاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ فعّال و حرکی ہوجاتا ہے اور اس میں مضمر استعدادیں قوت

سے فعل میں آجاتی ہیں۔ علاوہ ازیں، اس کا نور تدریجی ترقی اور اپنی تکمیل کرنا شروع کر دیتا ہے، جسے ہم جمالیاتی ارتقاء سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ازبس اہم حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نورِ باطنی ارتقاء کر کے اپنی تکمیل کرلیتا ہے تو اہلِ آرزو کا الٰہ و ربّ اپنے فضل و کرم سے انھیں مقامِ شاہدیت پر متمکّن کر دیتا اور انھیں جمالیاتی۔ ورائی مشاہدات اور اپنی دید سے جب چاہے نوازتا ہے۔

تیسرے، تقویٰ سے آرزوئے "دوست" پیدا بھی ہوتی ہے اور سچّی اور معتبر بھی بنتی ہے تقویٰ ذو معنی اصطلاحِ قرآنی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی شدتِ محبّت و خشیت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خشیتِ الٰہی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خوف پر دلالت کرتی ہے۔ علاوہ بریں، تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا احیاء بھی ہوتا ہے۔ چوتھے، اہلِ آرزو کی جمالیاتی حسّ زندہ و فعّال ہو، نیز اسے حسن سے محبّت اور حسنِ انقلاب کی طلب و جستجو ہو۔ پانچویں، وہ اپنے الٰہ و ربّ کو کثرت سے یاد کرے، اس کا کلام، جو آئینۂ حسن و حق ہے، اسے مستقلاً پڑھے، اس میں تدبر بالحق کرے، اور اسے اپنا شعارِ زندگی بنالے۔ چھٹے، اپنے معروضِ حسن و عشق کی یاد کے لیے صلوٰۃ قائم کرے اور حسنِ نیت کے ساتھ اس کے تقاضے پورا کرے۔ ساتویں، اپنے معبود و محبوب کی جملہ حسین تخلیقات خصوصاً بنی نوعِ انسان سے محبّت و احسان کرے اور ان کے لیے رحمت بن جائے، نیز ان کے لیے ہر ممکن ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرے۔ آٹھویں، حدود اللہ اور شعائرِ اسلام کا احترام کرے۔ نویں، شرک و بت پرستی سے گریزاں و ترساں رہے اور عقیدۂ توحید کو اپنے اندر جذب کر کے اس کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرے۔ دسویں، نہ تو فرعون و ہامان اور قارون و آزر بنے اور نہ بننے کی طلب و جستجو ہی کرے۔ گیارھویں سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کی محکومی و غلامی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے، معاشرے میں حسنِ انقلاب لانے کی خاطر ان کے خلاف جہاد کرے اور ان کے استیصال کے لیے ہر ممکن قربانی دینے سے دریغ نہ کرے۔ بارھویں، صالح، شہید اور صدّیق بننے کی طلب و جستجو اور سعی و جہد کرتا

رہے۔ تیرھویں، دُنیوی و اُخروی حُسنہ کی آرزو و دُعا کرتا رہے اور عذاب النّار سے محفوظ رہنے کی کوشش بھی کرتا رہے اور دُعا بھی مانگتا رہے۔

حاصل کلام یہ کہ ربّ العالمین کے پیغمبرِ اعظم و آخر و رحمۃ للعالمین صَلَّی اللہ علیہ وسلم کے اِتباع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرے۔ الغرض، اہلِ آرزو کی عبادت، فکر و عمل، سعی و جہد اور حیات و موت اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، نیز وہ محافظِ صلوٰت بھی ہو۔

مثالی صلوٰۃ

صلوٰۃ جس شکل میں بھی ہو، یادِ الٰہی اور فلاح کا ایک حسین ذریعہ ہے، لیکن اسلامی صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی یاد و محبّت، پرستش و بندگی، خشوع و خضوع اور "احسان" و "جمالیاتی اِرتقاء" کے اعتبار سے احسن و اکمل ہے، اس لیے مثالی ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے ربّ العالمین نے نبوّت کی تکمیل و اختتام کے ساتھ دین کی تکمیل بھی کر دی تھی جس میں نظامِ صلوٰۃ کی تکمیل بھی شامل ہے۔

قرآنِ عظیم کی رُو سے ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی حسین فطرت پر پیدا ہوتا ہے (الروم ۳۰: ۳۰)، اور اپنے اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق کی معرفت و یاد لے کر آتا ہے۔ چونکہ انسان اپنے نفس کے احوال و ظروف، مقتضیات و تمنّیات اور "آخری آرزو" کو معلوم کرنے کی خاطر اس میں غور و فکر کرتا ہی نہیں، لہٰذا وہ اپنے اِلٰہ و ربّ سے کم آگاہ و غافل رہتا ہے۔ دُنیا کے عظیم و برگزیدہ انسانوں، مثلاً نبیّینؑ، صدّیقین، شہداء اور صالحین کا مشاہدہ و تجربہ اور ان کی یہ شہادت ہے کہ قَدْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ: یعنی جس شخص نے اپنے نفس (کی سچّی آرزو اور جھوٹی خواہشات) کو پہچان لیا، اُس نے اپنے خالق و پروردگار

اور آقا و مالک کو پہچان لیا۔

حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ انسان اگر حسنِ نیت کے ساتھ نفس کا مشاہدہ و محاسبہ کرے تو اس کا قلب کی گہرائیوں میں اپنے الٰہ و ربّ کی آرزو، یاد اور محبت کی کسک محسوس کرنا ایک فطری امر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاطرِ ہستی نے انسان کو اپنی فطرت پر بنایا ہے اور یہی انسان کا دینِ حنیف بھی ہے (الروم ۳۰ : ۳۰)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچہ حسین فطرت اور اس میں اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت بالقوّہ لے کر دُنیا میں آتا ہے، جن کو قوت سے فعل میں لانا اور صرف تنہا اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ و ربّ بنا کر زندگی کرنا ہی فطرئ خالص اور سچا دینِ قیّم ہے۔ اس دین کی بنیاد توحید اور اس کا ستون صلوٰۃ ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے دُہرے رشتے کا عملی اظہار ہے۔ صلوٰۃ میں انسان ایک تو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست اس رشتے کا اظہار و اعتراف کرتا ہے کہ "بارِ الٰہا! تو میرا ربّ ہے؛ یعنی تو میرا خالق و رازق، میری نشو و نما کرنے والا آقا و مالک، میرا حافظ و ناصر، مولیٰ و کارساز، حاجت روا و مشکل کشا، منعم و محسن، والی و وارث، ہادی و مزکّی، اور غفارالذنوب و مستجیب الدّعوات ہے؛ اور میں تیرا بندہ و فقیر اور سائل و گدا ہوں۔ دوسرے! میرا الٰہ بھی تو ہے؛ یعنی تو میرا معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور ممدوح و مسجود ہے۔ تو میرا معروضِ حسن و عشق ہے اور میں تیرا عابد و حامد، ساجد و ذاکر، عاشق و پرستار اور سچّا مُصلّی (= نمازی) ہوں۔"

سچّا نمازی اللہ تعالیٰ کو اس لیے بھی اپنا الٰہ و ربّ سمجھتا اور عمر بھر اس کی یاد کو دل میں لیے زندگی کرتا ہے کہ روزِ الست اس نے جملہ بنی نوعِ انسان کو محشرِ ورائی میں اکٹھا کیا اور ان پر اپنا جلوہ پیدا کیا۔ اس جلوے کی حقیقت تو فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، جو علیم و خبیر ہے، لیکن قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان سے یہ استنباط کرنے کی گنجائش ہے کہ جلوہ صُوری و صفاتی ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ اس سے ایک تو بنی آدم کو اس حقیقت کا عین الیقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا ربّ ہے، اور دوسرے ان کے حسنِ صورت یا صورتِ حسن کے مشاہدے

سے ان کے دلوں میں اس کی محبت بالقوۃ گھر کر گئی اور ان کو حق الیقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا الٰہ یا معروض حسن و عشق بھی ہے۔ عشقِ الٰہی کی مثال ایک ایسے جوہری ذرّے کی سی ہے، جس کے اندر حسن و نور کی توانائی، جوہری توانائی سے بھی شدید تر ہے، اور اس میں جمال و جلال اور رحمت و محبت کا محیطِ بیکراں مضمر ہوتا ہے۔

ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ جمیل و جلیل ہے اور جمال کو پسند اور اس سے محبت کرتا ہے؛ دوسرے، اس نے اپنی ہر تخلیق کو حسین بنایا ہے؛ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدۃ ۳۲: ۷)؛ اس نے جو جو چیز تخلیق کی اسے حسین بنایا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے اور اپنی تخلیقات کے حسن کی جان پہچان اور اس سے جمالیاتی حظ، جمالیاتی سوز و ساز اور جمالیاتی ثروت حاصل کرنے کے لیے انسان کو جمالیاتی حس (AESTHETIC SENSE) ودیعت کر دی، جو صیرفیِ حسن بھی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حسن و عشق کی حقیقت کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ان الفاظ کی تعریف کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان دونوں میں ہر لفظ شرمندۂ تعبیر نہیں۔ بہر حال، حسن ایک ناقابلِ بیاں قوتِ جذب ہے تو عشق قوتِ انجذاب؛ اور زندگی عبارت ہے حسن و عشق سے۔ اگر حسن ایک طرف قلب و حواس میں اور دوسری طرف رنگ و نور، حیات و شباب، اصنافِ جمیلہ و جلیلہ، قد و قامت، لباس و حیا، انداز و ادا، غمزہ و عشوہ، نزہت و لطافت، رفعت و پہنائی، بہار و خوشبو، سبزہ و گل، آبِ رواں و کوہ و کمر اور دشت و صحرا میں اپنی نمود نہ رکھتا تو دنیا میں عشق و محبت اور فن و ہنر، علم و ادب، ایجادات و اختراعات اور زندگی کے ہنگامے اور نظارے بھی نہ ہوتے؛ نیز زندگی اپنی معنویت و لذتِ بے مثال اور آرزومندی سے محروم ہوتی۔ اس کے نتیجے میں وہ ایسی شرابِ تلخ و ناگوار ہوتی، جس میں سرخوشی و مستی ہوتی نہ کشش و جاذبیت؛ نیز اس میں کیف و سرور اور نشۂ جانفزا کے بجائے خمارِ کرب انگیز و شکیب رُبا ہوتا۔ غور سے دیکھیں تو دنیا کے تمام ہنگامے بالواسطہ یا

بلاواسطہ طور سے حُسن و عشق کے جمالیاتی تصادم سے پرورش پاتے ہیں اور یہ سلسلہ آدم و حوّا کی پیدائش سے لے کر آج تک جاری ہے۔

اس سے ہمیں اس اصلِ عظیم سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ چونکہ الحُسن ہے اور انسان اپنی جمالیاتی حِس کی بدولت حُسن کو پہچانتا اور اس سے محبت کرتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اس کا معروضِ حُسن و عشق ہے؛ نیز اس حقیقت کے باوصف کہ الحُسنُ الظاہرؔ ہے۔ یعنی ہر آن اپنی ایک نئی جمالیاتی تخلیقی فعلیت میں اپنا جلوۂ نو بنو پیدا کرتا رہتا ہے؛ وہ "الباطن" بھی ہے؛ یعنی انسان کی شہ رگ سے نزدیک تر ہونے کے باوجود اس کی نظروں سے مستور رہتا ہے، لہٰذا اس کی دید کی خاطر انسان کو خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ الحُسن ہی انسان کا معروضِ حُسن و عشق اور "آخری تمنّا" ہے؛ وہی زندگی کا معنیٰ اور اس کی غایت الغایات ہے؛ نیز اس کو پانے کا ایک احسن و اکمل ذریعہ "صلوٰۃ بالحق" ہے۔ صلوٰۃ بالحق سے مراد ایسی صلوٰۃ ہے، جو خشوع و خضوع سے اپنے اِلٰہ و ربّ کی یاد میں علی الدوام قائم کی جائے اور مقررہ اوقات پر مسجد میں باجماعت قائم کی جائے۔ علاوہ بریں، صلوٰۃ کے حسّی، قلبی، نفسی اور عسکری، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی و تربیتی؛ نیز ثقافتی تقاضوں کو پُورا کیا جائے۔ الغرض سچے مصلّین یا نمازی وہ اہلِ ایمان و نفوسِ مطمئنّہ ہیں، جو حقوق اللہ و حقوق العباد کو پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ادا کرتے ہیں۔

سرطانی اداروں کی ریشہ دوانیوں سے اکثر مُسلم اقوام کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا ہے کہ کاروباری و پیشہ ورانہ بددیانتی و بدکرداری اپنی جگہ اور صلوٰۃ و عبادات اپنی جگہ۔ یہ عقیدہ نہ صرف باطل ہے، بلکہ اس سے دین کی تکذیب بھی لازم آتی ہے۔ علاوہ بریں، اس شیطانی عقیدے نے مسلمانوں کے اقتصادی کردار کو حدّ درجہ بگاڑ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ بددیانت و بدکردار، مجرم و زیاں کار اور حرام کار و حرام خور، نیز ننگِ اسلام و بدنامِ زمانہ ہیں۔ غور کریں تو تکذیبِ دین تکفیرِ دین سے کہیں زیادہ سنگین جُرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ قرآنِ مجید کی

رُو سے نفاق کا خاصّہ تکذیبِ دین ہے، لہٰذا وہ ایمان کے منافی اور بدترین خصلت ہے؛
اور "نیمے دروں اور نیمے بیروں" کی حالت پر دلالت کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔
وجہ یہ ہے کہ نفاق کے شخصیت کُش اثرات سے انسان کی شخصیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور
اس کے نتیجے میں وہ اپنا جمالیاتی اِرتقاء کرنے کے قابل نہیں رہتا؛ دوسرے، اس سے فرد و
قوم کا نفس سرکش ہو جاتا ہے اور قوم و ملّت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ حکم دیتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا...... (النساء ۴: ۱۳۶)؛
یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو پورے طور پر ایمان لاؤ۔

اس آیۂ جلیلہ میں مسلمانوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اگر وہ سچے مؤمن بننا چاہتے ہیں
تو انہیں اسلام کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کے مطابق اپنے فکر و عمل کی راہیں متعین و اختیار کرنا
اور موحِد و مجاہد بن کر زندگی کرنا ہوگی۔ "آدھے تیتر آدھے بٹیر" بن کر زندگی کرنا منافقت ہے؛
جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے: چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ اگر اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہو تو
پورے پورے داخل ہو جاؤ (البقرۃ ۲: ۲۰۸)۔

تاریخ شاہد ہے کہ افراد و اقوام کی ناکامی و محرومی کی ایک بنیادی وجہ ان کا ادھورا یقین و
عمل، ادھورا منصوبہ و ارادہ اور ادھوری طلب و سعی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے ہر گوشے
میں فساد برپا ہے اور وہ سرطانی برائیوں کی جولانگاہ ہے، نیز اس پر سرطانی اداروں کی سیادت و
حکومت ہے اور اس میں فحشاء و منکر کا بازار گرم ہے، اس کی وجہِ حقیقی بھی منافقت ہے؛
یعنی نہ تو مسلمانوں کا ایمان کامل ہے اور نہ وہ پوری طرح اسلام میں داخل ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے
کہ صلوٰۃ ادا تو کرتے ہیں، لیکن اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ یہ عقیدہ کہ "نماز اپنی جگہ
اور بددیانتی اپنی جگہ"، انتہائی مضرّت رساں بلکہ مہلک ہونے کے باوجود مُسلم اقوام کا جزوِ زندگی بنا
ہوا ہے۔ اس باطل عقیدے کے پیدا ہونے کے چھ بنیادی عوامل و محرّکات ہیں:
اوّل، سرطانی ادارے؛ دوم، ایمان کی ناپختگی؛ سوم، نفاق؛ چہارم، الحسن، دُنیوی و

اُخروی حسنہ، حُسنِ حیات، حُسنِ المآب اور حُسنِ انقلاب کی آرزو کا فقدان؛ پنجم، ابلیس کی جالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی؛ اور ششم، جذبۂ تکاثر یعنی مال و دولت اور نام و نمود میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش۔

اسلامی صلوٰۃ کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص توحید کی مظہر ہوتی ہے اور اسے صرف اور صرف ذکرِ الٰہی کے لیے قائم کیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیۂ جمیلہ سے ثابت ہے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۴)؛ یعنی بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں۔ میری سوا کوئی اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا خدا) نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کر اور میرے "ذکر" (=یاد دہانی) کے لیے صلوٰۃ قائم کر۔

یہ ارشادِ الٰہی شرک و بُت پرستی (= اکابر پرستی، مورتی پوجا، صنم پرستی، شبیہہ و قبر پرستی وغیرہ وغیرہ) کی نفی و ابطال اور خالص توحید کے اثبات و تاکید پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی رُو سے صلوٰۃ غیر مسلموں کی ہو یا مسلمانوں کے کسی فرقے کی، اگر وہ غیر اللہ کے لیے ہو یا اللہ تعالٰی کے سوا کسی اور "برگزیدہ" ہستی کے لیے ہو، وہ حقیقت میں صلوٰۃ ہی نہیں۔ شرک کی آمیزش سے صلوٰۃ ہو یا عبادت کی کوئی اور صورت، باطل بلکہ ظُلمِ عظیم ہوتی ہے۔

صلوٰۃ، چونکہ محض ذکرِ الٰہی کے لیے قائم کی جاتی ہے، لہٰذا اس سے اطمینانِ قلب یا قرارِ جان ملتا ہے؛ جیسا کہ قرآنِ مجید سے ثابت ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ط اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد ۱۳ : ۲۸)؛ یعنی وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ ان کے قلوب کو ذکرِ الٰہی سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھو کہ صرف ذکرِ الٰہی ہی سے قلوب کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔

قلب چونکہ قرآنِ حکیم کی از بس اہم نفسیاتی اصطلاح ہے، لہٰذا اس کی تشریح کر دی جاتی ہے۔ انسان کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اس کا "باطنی نظام" ہے، جو عبارت ہے حسِّ قلبی۔

نفسی نظام سے۔ قلب مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دو نظام ہیں؛ جنہیں اردو میں دل اور دماغ کہتے ہیں۔ یہ دونوں بڑے ہی دقیق و پیچیدہ، محیّر العقول اور لاینفک نظام ہیں۔ نظامِ دل کے اہم اجزاء یہ ہیں: جمالیاتی حسّ، ذوقِ حسن، ضمیر و وجدان، نیز یہ خود جذبات و احساسات، ایقان و اذعان اور جبلّتوں کا مبدء ہے۔ نظامِ دماغ کے اہم کل پرزے یہ ہیں: عقل و فرقان، مفکرہ، واہمہ، متخیلہ، متصوّرہ اور حافظہ؛ نیز یہ افکار و تصوّرات، تعقلات و مُدرکات، اوہام، ظنیّات اور اندیشوں کا مخزن ہے۔

قلب کے ان معانی کی رُو سے متذکرہ آیۂ جمیلہ کا مطلب یہ ہوا کہ ذکرِ الٰہی سے ذہنی انتشار و خلفشار، نفسیاتی دباؤ، تفکرات اور اندیشہ ہائے گوناگوں دور ہو کر دل کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی زبان میں خوف و حزن کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے؛ یا بالفاظِ دیگر، یادِ الٰہی میں انسان کے لیے قُرّۃُ العین ہے۔ اس کا مطلب طمانیّت و مسرّت کی جمالیاتی ٹھنڈک ہے، جو جتنی شدید ہوتی ہے، اُتنی ہی جانفزا و کیف پرور بھی ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، اللہ تعالیٰ کی یاد سے قلب میں پہلے اس کی محبت کی شمع فروزاں ہوتی ہے، پھر اس کا نور تیزی سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کا اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق ہر آن ایک نئی شان میں اپنی نمودِ ارتقائی رکھتا ہے (الرحمٰن ۵۵: ۲۹)؛ اس لیے وہ اپنے اِلٰہ کے قرب و رضوان اور دید و حضوری کی خاطر اپنے نورِ قلب کے اِتمامِ مدام کی طلب و جستجو میں رہتا ہے؛ اور اس کی آرزو بصورتِ دُعا اس طرح اس کے لبوں پر رہتی ہے:

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (التحریم ۶۶: ۸): اے ہمارے رب! ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔ بلاشبہ تُو ہر شے پر کامل قدرت رکھنے والا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نور کا اِتمام ہو جائے تو پھر دُعا مانگنے کا کیا فائدہ؟ اس اہم سوال کا جواب یہ ہے کہ "اِتمام" ایک تو اس اعتبار سے اضافی حیثیت رکھتا ہے کہ

یہ نقطۂ متناہیت پر نہیں، بلکہ کمالِ نو کے نقطۂ آغاز پر دلالت کرتا ہے؛ دوسرے، اتمامِ نور اس لحاظ سے بھی اضافی ہے کہ اس کا تعلق کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ٥ (الرحمٰن ۲۹:۵۵) سے ہے۔ اس آیۂ جمیلہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جلّ شانُہٗ ہر آن اپنی جالیاتی تخلیقی فعلیت میں اپنے حسن کی نمودِ نور کرتا ہے۔ چنانچہ ان تازہ بتازہ اور نو بنو ارتقائی مظاہرِ حسنِ "دوست" کے مشاہدۂ سرمدی کے لیے نفوسِ مطمئنّہ یا اہلِ حسن و سرور کو اپنے نور کی درجہ بدرجہ ترقّیِ مسلسل کی حاجت و آرزو رہتی ہے۔ نور چونکہ حسن کا عنصر ہے، اس لیے اس کی تدریجی ترقّی کے لیے ہم نے "جالیاتی ارتقاء" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جالیاتی ارتقاء اور ترفّعِ درجات ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

یہ اصلِ عظیم ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ صلوٰۃ ذریعہ ہے جالیاتی ارتقاء کا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے نہ صرف محبّتِ الٰہی کی شمع روشن ہوتی ہے، بلکہ اس کا نور بتدریج ترقّی کرتا رہتا ہے اور اپنے اتمام کے ہر حال و مقام سے آگے گزرتا رہتا ہے۔ اسے ہی ترفّعِ درجات کہتے ہیں۔

ذکرِ الٰہی یا اقامتِ صلوٰۃ سے انسان نفسِ مطمئنّہ اور وارثِ جنّت بنتا ہے اور اُسے ہاں جنّت کی بے مثال و بے قیاس نعمتوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ و اہلِ حسن و سرور بندوں کی رفاقت اور اپنے معروضِ حسن و عشق کی دید و لقاء اور قرب و رضوان ایسی نعمتِ عظمٰی نصیب ہوگی۔ بخلاف اس کے، تارک الصلوٰۃ دنیا میں لذّتِ زندگی، حسن و خیر اور طمانیتِ نفس سے اور الحیوان (= دارالآخرت) میں جنّت ایسی نعمتِ عظمٰی اور اس میں اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں (نبیّین، صدّیقین، شہداء اور صالحین) کی رفاقتِ حسنٰی سے، نیز اپنے معروضِ حسن و عشق (= اللہ) کی دید و لقاء اور حضوری و رضوان سے محروم رہے گا اور یہ ایسی محرومی و نامرادی ہے جس کی اذیّتِ سوزاں اور کربِ جاوید کا احساس و تصوّر اس دنیا میں کوئی بشر کر نہیں سکتا۔

علاوہ ازیں، ترکِ صلوٰۃ کے نتیجے میں ایک تو انسان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے، اور

دوسرے اس دُنیا میں وہ خوف و حزن کی آتشِ سوزاں اور کربِ مدام میں مبتلا اور نورِ بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ایسا شخص قیامت کے دن یقیناً اندھا اُٹھے گا، جیسا کہ اس نصِ قرآنی سے ثابت ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ٥ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴) "یعنی جس کسی نے میری یاد سے منہ موڑا تو اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔"

اب اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دُنیا میں بھلا دینے سے انسان قیامت کے روز اندھا کیوں اُٹھے گا؟

یہ حقیقت جتنی اہم اور سچی ہے اتنی ہی انسان کے قلب و نگاہ سے مخفی رہتی ہے کہ ہر عمل چاہے نیک ہو یا بد، حسین ہو یا قبیح، اس کی اپنی تاثیر ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر عمل مؤثر کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی تاثیر ہوتی ہے اور خدا فراموشی کی تاثیر خود فراموشی و بے بصری ہے۔ اس امر کی توجیہہ باندازِ دیگر بھی کی جا سکتی ہے۔

انسان کے حسی نظام کا نظامِ قلب کے ساتھ ربطِ لاینفک ہے، جس کی نوعیت دُہری ہے۔ حسی نظام سے مراد حواسِ خمسہ ہیں: سامعہ، باصرہ، ذائقہ، شامّہ اور لامسہ۔ یہ کتنی ایمان افروز حقیقت ہے کہ چودہ صدیاں پہلے قرآنِ مجید نے انسان کو اس اصل سے آگاہ کیا تھا کہ حواسِ خمسہ میں سے سامعہ و باصرہ ہی حیاتِ انسانی میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ حقیقت دنیا کے اہلِ علم و دانش تقریباً دو صدیاں پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ علم و حکمت، ہنر و فن، سائنس و ٹیکنالوجی نیز جمالیاتی مشاہدات اور دیگر تجربات میں سامعہ و باصرہ دیگر حواسِ ثلاثہ سے کہیں زیادہ اور اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ قرآنِ حکیم کے اس علمی انکشاف کے تقریباً تیرہ صدیاں بعد مغرب کے علمائے جمالیات نے اسے تسلیم کیا۔ کیا یہ واقعیت اہلِ حق کے لیے قرآنِ مجید کے الہامی ہونے کی برہانِ قاطع نہیں؟ یقیناً ہے لیکن انسان ہی ظالم و جاہل ہے کہ

جانتا ہے پر مانتا نہیں

حواس و قلب کے تعلّق کی دُہری نوعیت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عامل و معمول بھی ہیں اور معمول و عامل بھی۔ مثال کے طور سے سامعہ و باصرہ جو کچھ سنتی اور دیکھتی ہیں، اس کے اثرات خود بخود قلب پر مرتّب ہوتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف قلب کے جذبات و احساسات، امیال و عواطف، نیز اعتقادات و خیالات، افکار و تصورات اور اوہام و تعصبات وغیرہ وغیرہ بھی سامعہ و باصرہ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً محبّت کی نظر سے دیکھیے تو ہر چیز حسین اور نفرت کی نظر سے دیکھیے تو ہر چیز قبیح دکھائی دیتی ہے۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ محشر میں اُٹھنے کی بات کی توضیح مندرجۂ ذیل آیۂ جمیلہ کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج ۲۲: ۴۶) : کیا اُن لوگوں نے دُنیا میں سیر و سیاحت نہیں کی ہے کہ ان کے قلوب یعنی دل و دماغ سمجھنے والے یا ان کے کان سُننے والے ہوتے؟ اصل میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ قلوب یا دل و دماغ اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قلب کا نظام جو حسّی اور نفسی نظاموں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اپنے فطری نور سے محروم ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حواس کی فعلیّت بالحق سے نظام قلب فعّال ہو جاتا ہے اور ان کے اثرات قبول کرتا ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اگر قلب اپنے نور اور اس کی حرکت و توانائی سے محروم ہو چکا ہو تو اس میں حواس کے عبرت انگیز، سبق آموز اور جمالیاتی اثرات قبول کرنے کی استعداد مفلوج یا مسلوب ہو جاتی ہے۔ اس کی توضیح باندازِ دیگر بھی کی جا سکتی ہے۔ یادِ الٰہی جس کی احسن و اکمل شکل صلوٰۃ ہے، انسان کی محبّتِ الٰہی پر دلالت کرتی ہے۔ قلب میں شمعِ محبّتِ الٰہی فروزاں ہو تو اس کے نور سے وہ منیر و حرکی اور توانا بن جاتا ہے؛ نیز اس کے نور کی تب و تاب اور توانائی سے سارا باطنی نظام قلب کی

طرح منیر و فعّال ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں نظامِ باطنی سے مراد حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام ہے۔ چنانچہ ایسے ہی قلبِ منیر و فعّال کو قرآنِ مجید "بینا" کہتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص اپنے اِلٰہ و ربّ کو بھلا دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل میں محبّتِ الٰہی کی شمع بھی خاموش ہو جاتی ہے اور باطنی نظام محبّتِ الٰہی کے نور کی تب و تاب اور توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ باطنی صورتِ حال قلب کی بے بصری یا اندھے پن پر دلالت کرتی ہے۔ ایسے ہی قلب کو قرآنِ مجید "اندھا" کہتا ہے۔ چونکہ قلب باطنی نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا وہ نابینا ہو جائے تو نور و توانائی کے فقدان کے سبب کُل باطنی یا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام ناکارہ و معطّل ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان کی اپنی یا باطنی دُنیا تاریک و تنگ ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خارجی اور باطنی نور ہے جو خارجی و داخلی مکان یا کائنات و حیات میں وسعت و پہنائی پیدا کرتا ہے اور جتنا پھیلتا جاتا ہے اسی نسبت سے وہ وسعت و پہنائی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کا قلب جتنا زیادہ منیر و حرکی ہوتا ہے، اس کی باطنی دُنیا اتنی ہی زیادہ روشن و وسیع ہوتی جاتی ہے؛ نیز اس نور سے حیاتِ انسانی میں "جمالیاتی سوز و ساز" پیدا ہوتا ہے۔

"جمالیاتی سوز" سے مراد جلالِ سوز ہے۔ جلال زوج ہے جمال کا اور یہ دونوں حُسن کے عناصر ہیں۔ اس سے مراد دل کی کیف پرور و جاں فزا تب و تاب ہے۔ جمالیاتی سوز کو ہم جنّت کی شرابِ زنجبیل سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، جس میں جمالیاتی ارتقاء کو تحریک دینے کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس میں غمِ انسانیت کی آتشِ لالہ ہوتی ہے، جس کی حرارت جمالیاتی ارتقاء کے لیے مہیّج (STIMULENT محرک) کا کام دیتی ہے؛ نیز اس کی بدولت انسان کے نور کا اِتمام و نشوونما ہوتا رہتا ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔

"جمالیاتی ساز" کی تشبیہہ ہم جنّت کی شرابِ کافور سے دے سکتے ہیں، جس میں لذّت و قُرّۃُ العین ہوتی ہے۔ قُرّۃُ العین قرآنِ حکیم کی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں طمانیت و مسرّت،

لذتِ حیات اور سرخوشی و کیف کی جانفزا ٹھنڈک کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جمالیاتی ساز بھی جمالیاتی ارتقاء میں ازبس اہم کردار ادا کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں جنّت کو اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صلوٰۃ کو قُرّۃُ اعین سے تعبیر کیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فی الصَّلوٰۃِ۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ بلحاظِ معنویت جنّت و صلوٰۃ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جنّت اور صلوٰۃ دونوں میں اہلِ حسن و سُرور کو اُن کے اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق کے قرب و رضوان، حضوری و لقاء اور ہم نظری و ہمکلامی کی نعمتِ عظمیٰ ملتی ہے۔ اس سے صلوٰۃ کی ہماری دُنیوی و اُخروی زندگی میں غیر معمولی اہمیّت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان نام نہاد مسلمانوں کی کمی نہیں جو ایک تو مُصلّین یا نمازی نہیں، یعنی باقاعدہ اور مستقل صلوٰۃ یا نماز قائم کرنے والے نہیں، اور دوسرے اقامتِ صلوٰۃ کی دُنیوی و اُخروی زندگی میں غیر معمولی اہمیّت کے قائل نہیں۔ ایسے ہی لوگ ظالم و جاہل ہوتے ہیں (الاحزاب ۳۳: ۷۲)۔

حقیقت یہ ہے کہ صلوٰۃ بالحق ربّ ذوالجلال والاکرام کی نظر میں ایسا حسنِ عمل ہے، جس میں نمازیوں کو جمالیاتی ثروت دینے، ان کو نفوسِ مطمئنّہ بنانے، ان کا جمالیاتی ارتقاء کرنے، ان کی باطنی دُنیا کو حسین و منوّر اور کشادہ و وسیع بنانے اور دارالآخرت یا الحیوان میں ان پر جنّت کے دروازے وا کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جو لوگ صلوٰۃ بالحق قائم نہیں کرتے، اس کے نتیجے میں ان کی باطنی دُنیا تنگ و تاریک اور خوف و حزن کا آتشکدہ بن جاتی ہے۔ قیامت کے دن یہ سمندر سرشت و اہلِ نار تارکینِ صلوٰۃ اپنے باطنی نور کے فقدان یا اندھے پن کی وجہ سے حسرت و یاس کے کرب انگیز عالم میں بھٹکتے، ٹھوکریں کھاتے جہنم میں جا گریں گے اور الحیوان کے اس شرّ المآب میں عذاب النّار کی شدّت سے لذّتِ حیات و موت سے نا آشنا رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اگر کلیدِ جنّت ہے تو ترکِ صلوٰۃ کلیدِ دوزخ ہے۔ اس حقیقت کی آئینہ دار مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ ہیں:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝..... لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝

(المدثر ۷۴: ۳۸ تا ۴۳) : یعنی ہر متنفّس جو کچھ اکتساب کرتا ہے (حسنہ یا سیئہ)، اس کا مرہون یا گروی ہے؛ بجز اہلِ یمن وسعادت یا دائیں بازو والوں کے، جو بہشتوں میں ہوں گے۔ وُہ مجرموں سے پوچھیں گے! "کون سی چیز تمہیں دوزخ میں کھینچ لائی ہے؟" وہ جواب دیں گے: "ہم صلوٰۃ قائم کرنے والے یعنی سچے نمازی نہ تھے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مُسلم ممالک میں اسلامی حکومت نہ ہونے اور سرطانی اداروں کی حکمرانی ہونے کے سبب ایسے بے شمار خواندہ وناخواندہ پیر و جوان مرد و زن ہیں، جنہیں صلوٰۃ کی غیر معولی اہمیت کا شعور ہے نہ اس حقیقت کا کہ صلوٰۃ اگر سچے اور پکّے نمازیوں کو راہِ راست پر چلاتی، انہیں اہلِ یُمن وسعادت بناتی اور جنّت میں لے جاتی ہے تو ترکِ صلوٰۃ سے آدمی راہِ راست سے بھٹک کر مجرم و اہلِ نار بن جاتا ہے اور اس کا دوزخ میں جانا شدنی ہوجاتا ہے۔

اس موقع پر قرآنِ حکیم کے حوالے سے جنّت و دوزخ (جہنّم) سے متعلق چند ایک حقائق کا مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی طرح جنّت و جہنّم کو بھی زوجین بنایا ہے اور یہ دونوں دارالآخرت کے دو جہان ہیں۔ چونکہ دارالآخرت میں موت کا فقدان ہے، اس لیے اُسے الحَیَوَان کہتے ہیں۔ موت سے منزّہ و ناآشنا الحیوان کو ہم عالمِ حیات یا جہانِ زندگی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ الحَیَوَان یا دارالآخرت ہماری اس دُنیا کا زوج ہے، جو موت و حیات کا جہانِ فانی ہے۔ علاوہ ازیں، دُنیا دارالامتحان ہے تو الحیوان دارالجزاء۔ جنّت کو قرآنِ مجید نے قُرَّۃُ العین سے تعبیر کیا ہے، جس کے لفظی معانی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں (السجدۃ ۳۲: ۱۷)۔ اس کے اصطلاحی معانی ہیں: طمانیت و مسرّت، سوز و ساز، لذّت و سرخوشی، کیف و سرور اور وجد و حال کی جاںپاتی ٹھنڈک؛ جو اپنے حُسن کی تاثیر کی بدولت جتنی شدید ہو، اتنی ہی جاںفزا و

کیف پرور ہوتی ہے۔ جنّت کی ایک بے مثال خوبی یہ بھی ہے کہ یہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامانِ لازوال و گوناگوں ہے، جو شوق افزا بھی ہے۔ علاوہ ازیں، یہ رنگین و شاداب اور لذت انگیز و نظر افروز نظاروں، جمیل و جلیل، دلکش و سحر انگیز اور سُرور انگیز و جانفزا مناظر کی جلوہ گاہ؛ اور ان دیکھی اور ان سنی مسحور کن و بے قیاس نعمتوں اور پیکرانِ جمیل و جلیل کی تفریح گاہ بھی ہے، نیز یہ خُلدِ بریں، انسان کا حُسن المآب بھی ہے اور اس کی صفاتِ حسنہ کا کوئی متنفس تصوّر تک نہیں کرسکتا (السجدہ ۳۲: ۱۷)۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنّت الحُسن کی، جو انسان کا الٰہ یا معروضِ حسنُ و عشق ہے، ہم نظری و ہمکلامی، قُرب و حضوری اور باہمی محبّت و ہم رضائی کی جائے لقا ہے۔

یہ اصل بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جنّت میں حیاتِ انسانی حسین و جاودانی، سُرور آگین و مطمئن، نیز سدابہار و جوان، سدا متکیّف و خوش رہے گی، اور انسان اس سے نکلنا نہیں چاہے گا، بلکہ ہمیشہ اس میں رہنا چاہے گا۔ موت کی ہر صورت و شکل اور سر انداز و رنگ سے، نیز خوف و حزن، مصائب و آلام، کلفت و مشقّت، اِضمحلال و ضعیفی، حسرت و ندامت اور احساسِ محرومی و کرب سے ہمیشہ نا آشنا رہے گا۔ اس حقیقت سے کوئی صاحبِ ذوق و عقلِ سلیم انکار نہیں کرسکتا کہ جنّتِ ارضی ہو یا جنّتِ سماوی، اس کی آراستگی و تزئین، نیز مرد کی جمالیاتی حِسّ کی تسکین اور اس کی زندگی کی تکمیل صنفِ جمیلہ کے بغیر نہیں ہوسکتی، لہٰذا جنّت دوشیزہ و مطہّر اور باحیا و قُرّۃُ العین حورانِ دلکش و سحر انگیز اور پیکرانِ جمیل و مسحور کن کی وصال گاہ بھی ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ جنّت ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے کہ اس میں جانے کے لیے ایک بار کیا، لاکھ بار بھی جان قربان کرنا پڑے تو یہ سرمۂ مفت نظر ہوگی۔

جہاں تک جہنّم کا تعلّق ہے وہ ہر اعتبار سے جنّت کا زوجِ قبیح ہے۔ یہ مجرموں، گناہگاروں، ظالموں اور معاشرتی سرطانوں کا جو سمندر سرشت اور اہلِ نار ہوتے ہیں، شرّالمآب ہے۔ قُرآنِ مجید نے دوزخ کو سعیر، ہاویہ، جہنّم، سقر، النّار وغیرہ وغیرہ کئی ناموں سے موسوم کیا

ہے۔ سورۂ ہمزہ میں اس کے لیے اس نے حطمہ کی تعبیر اختیار کی ہے، جس کا معنیٰ ہے،
چکنا چور کر دینے والی جگہ۔ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: (اے لوگو!) تمھیں اس حقیقت
کا ادراک کہاں کہ وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ کیا ہے؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی آگ
ہے جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ان (مجرموں) پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت
میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (مقیّد ہوں گے) [الہمزۃ ۱۰۴: ۴ تا ۹]۔ اس بحث کا
خلاصہ یہ نکلا کہ مثالی صلوٰۃ سے مراد وہ صلوٰۃ ہے جو قرآنِ حکیم اور رحمۃ للعالمین و حاملِ خُلقِ
عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کے مطابق قائم کی جائے۔ مثال کے طور پر اگر مسلمانوں
کی حکومت ہو تو اُس میں نظامِ صلوٰۃ اور اس کے اجزائے لاینفک زکوٰۃ، امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کے نظام بھی قائم ہوں۔ دوسرے، صلوٰۃ فقط ذکرِ الٰہی کے لیے قائم کی جائے۔
تیسرے، خشوع و خضوع، حضوریِ قلب، اور خوشدلی اور حسنِ نیت کے ساتھ احسان کے حُسنُ المقام
پر متمکّن ہو کر قائم کی جائے۔ چوتھے، نمازی سچا تلمیذ القرآن ہو اور صلوٰۃ میں جو کچھ سُنے اور
پڑھے، اس کے معانی و مفہوم سے آگہی رکھتا ہو۔ پانچویں مُطہّر ہو، یعنی پاکباز اور صاف
ستھرا ہو، رزقِ حلال کماتا اور کھاتا ہو اور اُس کا قلب سرطانی و دیگر امراض سے پاک و
صاف اور زندہ و فعّال ہو۔ چھٹے اس کا حسّی، قلبی، نفسی نظام منیر و حرکی ہو۔ ساتویں، ماحول
پاکیزہ، صاف ستھرا اور صالح ہو۔ بالفاظِ دیگر، شرک و بدعات کی نجاست و تعفّن سے منزّہ
اور توحید و تقویٰ کے نور و رنگ اور خوشبو سے معمور و معطّر اور منوّر ہو۔ آٹھویں، امام صالح و
مُتقی اور موحّد ہو اور مذہبی عصبیت اور آزریت سے پاک و منزّہ ہو، نیز وہ نہ خود بے حضور
ہو اور نہ اس کی صلوٰۃ بے سُرور ہو۔ نویں، نمازی صلوٰۃ کے فرائض و واجبات، حقوق اور
تقاضے حتّی المقدور پورا کرنے والا ہو، دسویں نمازی، نفسِ مطمئنّہ و اہلِ آرزو ہو۔

ذکرِ الٰہی

صلوٰۃ و ذکرِ الٰہی کا ربطِ باہمی کیا ہے؟ یا یہ کہ صلوٰۃ کی غایتِ حقیقی کیا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ صلوٰۃ بذاتِ خود "ذکر" ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اہلِ ایمان سے ارشاد فرماتا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ...... تَعْلَمُوْنَ ۝ (الجمعۃ ۶۲: ۹): یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لیے (تمہیں) پکارا یا بلایا جائے تو اللہ کے "ذکر" کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تمہیں علم ہو تو یہ تمہارے لیے موجبِ خیر و برکت ہے۔

اس آیۂ جلیلہ سے دو حقائق سے آگاہی ہوئی: ایک یہ کہ صلوٰۃ ذکرِ الٰہی ہے اور دوسرے یہ موجبِ خیر ہے۔ خیر میں دُنیوی و اُخروی حسنہ اور برکت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صلوٰۃ میں چونکہ قرآنِ مجید پڑھا جاتا ہے جو ایک تو نمازی کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی یاد دلاتا ہے اور دوسرے اس میں اس حقیقت کا شعور بیدار کرتا ہے کہ وہ اس کا خالق و پروردگار اور آقا و مالک بھی ہے اور معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بھی، اور انسان اس کا پروردہ و فقیر اور سائل و گدا بھی ہے اور پرستار و عابد بھی۔

صلوٰۃ کی غایتِ حقیقی ذکرِ الٰہی ہے، لہٰذا اسی خاطر اسے قائم بھی کرنا ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل آیۂ جلیلہ سے ثابت ہے: اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱۴): یعنی میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود و خدا نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کر اور میرے ہی ذکر کے لیے صلوٰۃ قائم کر۔ اس امرِ دینی سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ ہی اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق و پرستش ہے، اور صرف اسی کی پرستش و بندگی کرنی چاہیئے، نیز اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، لہٰذا کوئی بھی

حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کا سزاوار نہیں اور غیر اللہ کی بندگی حرام و ناجائز ہوئی ؛ لیکن اِس ارشادِ الٰہی میں کہ "میرے ذکر کے لیے صلوٰۃ قائم کر" یہ حکمت مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ الحسن و الحق بھی ہے اور معروضِ حسن و عشق بھی، لہٰذا اس کی یاد سے اہلِ آرزو کے قلب و جان کو اطمینان و قرار ملتا ہے۔

یادِ الٰہی کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ طمانیتِ قلب غایتِ دین و حیات ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جہاں تک دین کی غایت کا تعلق ہے، ہم معلوم کر چکے ہیں کہ صلوٰۃ جو دین کا ستون اور معراجِ عبادت ہے، اس کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے، اور ذکرِ الٰہی سے طمانیتِ قلب ملتی ہے، جیسا کہ اس آیۂ جمیلہ سے ثابت ہے:

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝

(الرعد ۱۳ : ۲۸) اہلِ ایمان ہی کے قلوب کو اللہ کے ذکر سے اطمینان نصیب ہوتا ہے سُن رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذکرِ الٰہی اور اطمینانِ قلب لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو طمانیتِ قلب و جاویاتی ثروت بخشنے کے لیے انہیں کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنے کی تاکید کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ..... اَجْرًا كَرِيْمًا ۝

(الاحزاب ۳۳ : ۴۲ تا ۴۴) : اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا ذکر کرو اور بہت زیادہ ذکر کرو۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت و نصرت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے رحمت و نصرت کی دُعا کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ وہ مؤمنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے جس دن وہ اس سے ملیں گے، ان کی پذیرائی سلام سے ہوگی اور اللہ نے ان کے لیے باعزت و حسین

آجر تیار کر رکھا ہے۔"

یہ آیاتِ جلیلہ مخزنِ معانی ہیں۔ ذکر کے حوالے سے بعض اہم نکات کی تصریح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے: اولاً، ایمان کا تقاضا ذکرِ الٰہی ہی نہیں، ذکرِ کثیر ہے۔ اس اعتبار سے ذکر و ایمان لازم و ملزوم ہوئے۔ ثانیاً، ذکرِ کثیر کے نتیجے میں اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت اور فتح نصیب ہوتی ہے۔ ثالثاً، اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت ہی کی بدولت انسان حسنِ عمل کر سکتا، مشکلات پر قابو پا سکتا، مسائل حل کر سکتا اور عظیم کارنامے سرانجام دے سکتا، دُنیوی و اخروی حسنہ حاصل کر سکتا، نیز دُنیا میں آتشِ خوف و حزن کے کرب اور الحیوان میں جہنّم کے عذاب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جہنّم کے کرب یا عذابُ النّار سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات بتائی ہے، جو اعجازاتِ قرآنی میں سے ہے اور اس میں فی الواقعہ معانی کا دفتر پنہاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّہٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّہٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَھَنَّمَ ط لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی ○ (طٰہٰ ۲۰: ۷۴، نیز دیکھیے الاعلیٰ ۸۷: ۱۳) "حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے ربّ کے حضور مجرم بن کر حاضر ہوگا تو اس کے لیے جہنّم ہے، جس میں وہ مرے گا نہ زندگی ہی کرے گا (یعنی موت و حیات کی لذّت سے ناآشنا رہے گا)۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ موت جسّی، قلبی، نفسی نظام کے حقیقی معنوں میں جمود و تعطّلِ کُلّی اور نتیجۃً احساس و شعور کے فقدان پر دلالت کرتی ہے۔ بخلاف اس کے، زندگی جو اس کی ضد ہے، اس نظام اور احساس و شعور کے زندہ و فعّال ہونے کی مظہر ہے۔ اس عبرت ناک و بصیرت افروز آیۂ جلیلہ کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ میں مجرم و گناہگار، سَمندرِ سرشت انسان اپنی محرومی و نامرادی، حسرت و یاس، رسوائی و ندامت اور خوف و حزن کی آگ کی اذیّتوں کے ساتھ دوزخ کا شکسب رُبا عذاب بھی جھیلیں گے

اہلِ نار کی محرومی حقیقت میں جنّت کی محرومی ہوگی۔ زیرِ نظر آیۂ جمیلہ میں اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ

نے جنّت کو اجرِ کریم سے تعبیر کیا ہے، جو انسان کے لیے اس کے معروضِ حُسن و عشق کی جائے لقاء و سلامتی ہے۔ دوسری جگہ اس نے جنّت کو "قُرَّةُ اَعْيُنٍ"، یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (السّجدۃ ۳۲: ۱۷): یعنی کوئی نفس جانتا تک نہیں کہ اُن کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا سامان چھپا کر رکھا ہوا ہے؟ یہ جزا ہے ان اعمال کی جو وہ کرتے تھے۔

اس آیۂ جمیلہ میں دو نکات نہایت بصیرت افروز اور قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ جنّت اعمالِ صالحہ کی جزا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے حسنہ کا بدلہ حسنہ یا قُرَّةُ اَعْيُنٍ (= آنکھوں کی ٹھنڈک) ہے اور سیّئہ کا بدلہ سیّئہ یا عذابُ النّار ہے (البقرۃ ۲: ۲۰۱)۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جنّت میں وہی انسان جائیں گے جن کے نفس مُطمئن ہوں گے (الفجر ۸۹: ۲۷)، اور اس اصلِ عظیم سے ہمیں آگہی ہو چکی ہے کہ ذکرِ الٰہی ہی سے طمانیّتِ قلب نصیب ہوتی ہے اور نفسِ انسان مطمئنّہ بنتا ہے۔ اس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قُرَّةُ اَعْيُنٍ قرآنِ حکیم کی جامع و مانع اصطلاح ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جنّت کی ہر نعمت، نظارہ اور منظر ایسا جمیل و جلیل، دلکش و نظر افروز، لذّت انگیز و سُرور آگیں اور کیف پرور و روح افزا ہو گا، جس کا کوئی متنفّس تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جنّت و جہنّم زوجین ہیں اور الحیوان کے دو جہان ہیں، اس لیے ان میں موت نہیں ہو گی۔ دوزخ میں زندگی کے دُکھوں، اذیّتوں، محرومیوں اور نامرادیوں کا احساس و شعور تو ہو گا، لیکن اہلِ نار لذّتِ زندگی سے نا آشنا رہیں گے، اس لیے کہ وہ اپنے حسن سے محروم ہو گی۔ بخلاف اس کے جنّت میں زندگی اپنے حُسن یا جمال و جلال کے ساتھ ہمیشہ اپنی اکمل و احسن صورت میں اپنی نمود دکھاتی رہے گی۔ گلستانِ زندگی سدا بہار و خزاں نادیدہ اور گلِ شباب ہمیشہ نوخیز و شاداب رہے گا۔ زوج آشنا ہونے کے باوصف صنفِ جمیلہ دوشیزہ و دُرِ ناسُفتہ ہی رہے گی۔ وہاں لذّت و طرب، مسرّت و مستی اور کیف و سُرور ہر آن ایک نئی تاثیر رکھتے

رہیں گے۔ جنّت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اہلِ حسن و آرزو کے معروضِ حسن و عشق کی جلوہ گاہ بھی ہوگی اور جائے لقا بھی، جہاں انہیں ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و رضوان کی نعمتِ عظمیٰ ملے گی اور ہمیشہ ملتی رہے گی، نیز وہ ان کے لیے ان کے ربِّ کریم کا مہمان خانہ و تفریح گاہ اور اس کے دوستوں کی بزمِ طرب اور ان کا حُسنُ المآب ہے، اور وہاں انہیں ہر وہ نعمت اسی وقت میسّر ہوگی، جس کی وہ خواہش کریں گے اور ان کے دلوں میں حسین تر خواہش اور خوب سے خوبتر کی آرزو پیدا ہوتی اور پوری ہوتی رہے گی۔

جنّت کی چار امتیازی صفات کی نشاندہی کی جاتی ہے:

اوّلاً، یہ امر تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حرکت و تغیّر زندگی کو مستلزم ہیں۔ بالفاظِ دیگر، حرکت و تغیّر زندگی کی تقدیر ہیں، لہٰذا جنّت میں بھی حیاتِ انسانی مائل بہ ارتقاء رہے گی۔

ثانیاً، حیاتِ انسانی وہاں "خالص" یا حُسنِ محض ہوگی، لہٰذا وہ موت و قبح سے منزّہ و وراء ہوگی۔ اس کے نتیجے میں وہ جمود و تعطّل، انحطاط و تنزّل، پیری و معذوری اور ضعف و زوال سے، نیز سیّئہ و قبح، خوف و حزن، اذیّت و کرب، حسرت و یاس، احساسِ محرومی و تنہائی، احتیاج و تنگیٔ زیست سے منزّہ و وراء ہوگی۔

ثالثاً، جنّت میں حیاتِ انسانی کے جمالیاتی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، جمالیاتی ارتقاء کا مطلب انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی حسن کے نُور کی تدریجی ترقی ہے جسے ہی الٰہیات کے محاورے میں ترفیعِ درجات کہتے ہیں۔

رابعاً، جمالیاتی ارتقاء کی علّتِ غائی یہ ہے کہ الحُسن، جو معروضِ حسن و عشق ہے، اور ہر آن اپنے حسن اور حسن آفرینی کی شانِ نو بنو میں جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے اور سدا کرتا رہے گا، انسان اس کے خوب سے خوب تر نظاروں اور قُرب و حضوری اور ہم نظری و ہمکلامی کی رحیقِ مختوم کی جانفزا اور سرور انگیز لذّت و نشے سے محظوظ و متکیّف رہے گا۔ چنانچہ اس کے تازہ بتازہ اور نو بنو صُوری جلوؤں کے مشاہدے کی خاطر اہلِ حسن و سُرور کو اپنے جمالیاتی ارتقائے مدام کی طلب و آرزو

رہے گی اور ربِّ کریم اس آرزو کا اِتمام و اِحیاء بزنگِ دوام کرتا رہے گا۔ اس کے نتیجے میں اہلِ جنّت کی زندگی اپنی حسین فطرت کے مطابق حسنِ تغیّرِ جاوداں میں رہے گی، نیز ان کے شوقِ سیر و تغیّر اور جمالیاتی ذوق کی تسکین اور خوب سے خوب تر کی آرزو کی تکمیل بزنگِ ارتقاء ہوتی رہے گی؛ لہٰذا حسنِ خواب و تصوّر سے کہیں زیادہ جمیل و جلیل اور دلکش و روح پرور حسنِ الٰہی اور اپنے معروضِ حسن و عشق کی ہم نظری و ہمکلامی اور قرب و حضوری کے جہانِ حسن و حیات سے نقلِ مکانی کی خواہش تو درکنار، کسی کو اس کا دھیان تک نہ آئے گا۔ یہ ہے ذکرِ الٰہی کا اجرِ کریم جس کے متعلق عقلِ سلیم کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی خاطر اگر انسان ہر لحظہ اپنی جان اپنے جان آفریں معروضِ حسن و عشق پر قربان کرتا رہے تو پھر بھی یہ مُفت کا سچّا سودا ہو گا اور جنّت سُرمۂ مُفت نظر ہو گی۔

اس تصویرِ حقیقت کا دوسرا رُخ کیا ہے؟ آئینۂ قرآن ہی میں دیکھیے۔ ربِّ ذوالجلال و الاکرام کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ٥ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ٥ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ٥ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴-۱۲۵) "جو شخص میرے ذکر سے مُنہ موڑے گا تو اس کے لیے زندگی تنگ ہو گی (بالفاظِ دیگر، اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا) اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔ وہ عرض کرے گا: پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، جبکہ میں (دنیا میں) دیکھنے والا تھا؟ (اللہ تعالیٰ جواب میں) فرمائے گا: ایسا ہی ہے (وجہ یہ ہے کہ) ہماری آیات کو، جو تیرے پاس آتی تھیں، تو بُھلا دیتا تھا۔ اسی طرح آج تجھے بھلایا جا رہا ہے"۔ انسان کو اس حقیقت کا یقینِ محکم ہوتا کہ اپنے ربِّ ذوالجلال والاکرام کو بُھلا دینے کا انجام ایسا کربناک ہے تو اس کی یاد کو حرزِ جان بنا لیتا۔

محوّلۂ بالا آیاتِ جلیلہ کے بین السطور میں فلسفۂ حیات کے بہت سے حکیمانہ نکات

مضمر ہیں، جن میں سے چند ایک کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے :

اوّل، ہم دیکھ چکے ہیں کہ ذکرِ الٰہی سے انسان خوف و حزن کی آگ سے محفوظ رہتا اور اسے طمانیتِ قلب نصیب ہوتی اور نفس مطمئن بنتا ہے؛ اور یہ نفسِ مطمئنہ ہے جو ولی اللہ اور وارثِ جنّت ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے انسان خواہ کتنا ہی دولت مند اور صاحبِ اقتدار، مثلاً فرعون، ہامان، قارون اور آزر ہی کیوں نہ ہو؛ نیز جمال و جلال، شہرت و محبوبیت میں آپ اپنی مثال کیوں نہ ہو، اس کے پرستاروں، مریدوں، عقیدت مندوں اور پیروؤں کا حلقہ وسعت میں عالمگیر کیوں نہ ہو، ذکرِ الٰہی سے منہ موڑنے اور اسے بھلا دینے کی پاداش میں اس کے اندر کی دُنیا تاریک و تنگ اور آتشکدۂ خوف و حزن ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، ایسا شخص چونکہ حسن و نور اور اطمینان و قرار سے محروم ہوگا، لہٰذا اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔ بعض دُنیوی معاملات میں خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار و زیرک اور شاطر و عیّار کیوں نہ ہو، حقیقت میں قلب کا اندھا اور بے بصر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے الٰہ و ربّ کو فراموش کر دینے کے نتیجے میں انسان کا حسّی۔قلبی۔نفسی نظام اپنے نور و توانائی سے محروم ہو کر اپنے حقیقی وظائف ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا، لیکن اُسے اس کا شعور نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگ حقیقت میں خدافراموش و خداناشناس اور خودفراموش و خودناشناس ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں قیامت کے دن ان کا حشر ہوگا تو وہ بصیرت و بصارت دونوں سے محروم ہوں گے۔

دوسرے، ذکرِ الٰہی ہی کی تاثیر سے نُور پیدا ہوتا اور اس کا اِتمام و اِرتقائے دوام ہوتا رہتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ ذکرِ الٰہی کے بغیر انسان کے باطنی یا حسّی۔قلبی۔نفسی نظام میں نُور پیدا ہی نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے اِرتقاء و اِتمام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تیسرے، یہاں ذکرِ الٰہی سے مراد آیاتِ اِلٰہیہ ہیں۔ اس قرآنی اصطلاح کا مطلب آیاتِ قرآنی بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بھی، مثلاً اس کی تخلیقی فعلیت کے مظاہر، تاریخی عمل کے نتائج اور حوادث و سانحات وغیرہ وغیرہ۔ آیات معروضی بھی ہوتی ہیں اور موضوعی بھی۔

چوتھے، آیاتِ الٰہی کو قابلِ التفات نہ سمجھنا اور ان سے منہ موڑنے کا مطلب ایک تو قرآنِ حکیم سے دوری و مہجوری ہے، اور دوسرے، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان سے اعراض و اغماض کرنا ہے۔

پانچویں، ذکرِ الٰہی کی کوئی شکل ہو (مثلاً قیامِ صلوٰۃ ہو یا تلاوتِ قرآن، یا قدرت کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت اور تاریخی عمل پہ تدبر بالحق ہو) اُسے بھلا دینے کا مطلب خود فراموشی و خدافراموشی ہے، جس کا مآل قدرت کے قانونِ مجازات کی رُو سے یہ ہوگا کہ ایسے ظالم و جاہل لوگ قیامت کے روز اندھے اُٹھیں گے اور ان کا الٰہ و ربّ ان کی طرف نظر کرے گا نہ ان سے کلام ہی کرے گا۔ انسان کی اس محرومی و نامرادی سے بڑھ کر نہ کوئی محرومی و نامرادی ہو سکتی ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی عذاب ہی ہو سکتا ہے۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ ذکرِ الٰہی کا اجر جس قدر عظیم ہے، اس سے تغافل و اعراض کا نتیجہ بھی اسی قدر کرب انگیز و المناک ہے۔ اس ضمن میں ایک اور ازبس ایمان افزا آیۂ جمیلہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝ (البقرۃ ۲:۱۵۲):

(اے انسانو!) تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔"

اس آیۂ جمیلہ میں پانچ بنیادی نکات قابلِ غور و بصیرت افروز ہیں:

اولاً، اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ سُبحان و صمد، اکبر و اعظم، حمید و مجید، عزیز و قدیر، غنی و وہاب، الٰہ جمیل و کریم اور ربّ ذوالجلال والاکرام ہے اور جملہ افرادِ نسلِ انسانی اس کے بندے، محکوم و پرستار، پروردہ و محتاج اور سائل و گدا ہیں، اس کی رحمتِ بے پایاں اور فضلِ بے قیاس کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو یہ نعمتِ عظمیٰ عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ اسے یاد کریں اور یاد رکھیں گے تو وہ بھی ان کو یاد رکھے گا۔ اللہ جلّ شانہٗ کا

اپنے بندوں سے یہ وعدہ کرنا ان پر اس کی اتنی بڑی نوازش و مہربانی، رحمت و شفقت اور لُطف و کرم نوازی ہے کہ انسان اس کے عوض شکرانے کے طور پر لاکھ بار بھی اپنی جان اس کی راہ میں قربان کرے تو کم ہے۔ ثانیاً، اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً حقیقت ہے کہ خود قرآنِ حکیم اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اطمینانِ قلب و قرارِ جان ایسی نعمتِ عظمیٰ بطورِ اجر نصیب ہوتی ہے، جس کی بہلجنت ہے تو اس انسان کی خوش نصیبی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے، جسے اس کا معبود و مقصود اور معروضِ حسن و عشق یاد کرتا ہو، جو ربّ العرش ہے اور جس کی عظمت و کبریائی اور قدرت و صمدیت کا صحیح اندازہ لگانا تو کجا؟ کوئی متنفس قیاس تک نہیں کر سکتا۔ اس نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ پر تو ہر لحظہ اپنی جان کا نذرانہ بھی اس کے حضور پیش کیا جائے تو پھر بھی حقِ شکر ادا نہ ہو۔ ثالثاً، یہ بھی "دوست" کی رحمتِ بے حساب کی دلیل ہے کہ اس نے خود ہی اپنے بندوں کو اپنی اس نعمتِ عظمیٰ کا خاص طور سے شکر بجالانے کی تاکید اور کفرانِ نعمت کی مخالفت فرمائی ہے۔ رابعاً، اس آیۂ جمیلہ کے بین السطور میں یہ انتہائی اہم نکتہ، جسے علم ثابت بھی کر چکا ہے۔ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی نعمت کی قدر ناشناسی و تکفیر کے نتیجے میں وہ نعمت سلب کر لی جاتی ہے، جبکہ اس کی قدر شناسی اور اس کا شکر بجالانے سے اس میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ خامساً، قدر شناسی و تشکرِ نعمت اس کی طلب و آرزو پر اور قدر ناشناسی و کفرانِ نعمت اس کے فقدانِ آرزو پر دلالت کرتا ہے؛ اور قدرت کا قانونِ آرزو یہ ہے کہ وہ بندوں کی آرزو کا پاس و احترام کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اظہارِ آرزو ہی کا دوسرا نام دُعا ہے، اور ربِّ رحمٰن مستجیب الدعوات ہے۔

غور کریں، تو ہم انسان ہی ظالم و جاہل ہیں جو قرآنِ مجید ایسی کتابِ رُشد و ہدایت کو، جو نذیر و بشیر بھی ہے اور مزکّی و مُنیر بھی، درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھتے؛ لہٰذا اس کے مطابق زندگی کرنا تو کجا؟ اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم ذکرِ الٰہی کے ثمرات، مثلاً حسن و حسنہ، رحمت و مغفرت، طمانیت و مسرت اور لذتِ زندگی

سے محروم ہیں؛ نیز ہمارے قلب (= دل و دماغ کے نظام) بے نور و توانائی ہیں، جس کے نتیجے میں ہم نورِ عقل و بصیرت اور فرقان ایسی غیر مترقبہ نعمتوں سے محروم ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے قلب گوناگوں امراض کے شکار ہیں اور ہماری جمالیاتی حس، ضمیر اور نفسِ لوّامہ نحیف و نزار ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ہمارے حسی۔قلبی۔نفسی نظام قریب قریب معطّل و بیکار ہو چکے ہیں۔

جمالیاتی اِرتقاء

صلوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ جمالیاتی اِرتقاء کا بہترین وسیلہ ہے، اور جمالیاتی ارتقاء "اہلِ آرزو" کی "آخری تمنّا" کے اِتمام کا واحد ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں سکتیں۔ "آخری تمنّا" سے میری مراد آرزوئے اِلٰہ ہے۔ جیسا کہ متعدّد بار اس حقیقتِ عظمیٰ کی صراحت ہو چکی ہے کہ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی جملہ مخلوقات کا حقیقی اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے۔ اس اعتبار سے "اہلِ آرزو" کی مُصطلحہ کا مطلب ہوا، وہ اہلِ عشق و وفا یا اہلِ جذب و شوق، جنہیں اپنے اِلٰہ یا حقیقی معروضِ حسن و عشق کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ آرزو کو اپنے حقیقی اِلٰہ کی طلب و جستجو کس لیے ہوتی ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کے رشتے کی نوعیت دُہری ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہمارا ربّ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ ہمارا اِلٰہ ہے۔ وہ صرف اہلِ ایمان کا نہیں، بلکہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی کا ربّ اور اِلٰہ ہے، چاہے وہ کافر و مشرک کیوں نہ ہوں۔ انسان مانے یا نہ مانے، مگر وہ روزِ الست سے یہ حقیقت جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا اس کا اِلٰہ و ربّ ہے اور وہ اس کا عبد و پرستار اور محتاج و سائل ہے؛ نیز وہ اپنے فطری جذبۂ عبودیّت کی تشفّی اور جبلّی احتیاج کو پورا کرنے

کے لیے اپنے اِلٰہ و ربّ کو چاہتا ہے، اگرچہ موحدین کے سوا کم لوگ اس کا شعور رکھتے ہیں۔ یہ شعور نہ ہونے یا ادھورا ہونے کی صورت میں لوگ کافر یا مشرک بن جاتے ہیں۔

علاوہ بریں، قدرت اِلٰہ و ربّ کی محبّت انسان کے قلب میں بالقوّۃ ودیعت کر کے اسے دُنیا میں بھیجتی ہے، جو ذکرِ الٰہی سے فعل میں آتی ہے۔ یہ محبّت نورانی ہوتی ہے۔ اس کی تب و تاب سے ایک تو قلب کا نُور افزوں تر ہوتا اور اپنی تکمیل کرتا ہے۔ دوسرے، اس سے اس کو طمانیت یا جمالیاتی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس محبّت کا خاصّہ ذکرِ الٰہی ہے تو تقاضا اس کا قُرب و رضوان، لِقاء و حضوری اور ہم نظری و ہمکلامی ہے۔ یہ جمالیاتی ثروت یا نعمتِ عُظمٰی اپنی کامل شکل میں جنّت میں میسّر آئے گی، جو الحیوان و حُسنُ المآب ہے۔ اس میں اہلِ جنّت اپنے ربِّ ذوالجلال والاکرام کے مہمان بن کر ہمیشہ رہیں گے؛ جہاں ایک تو وہ حسین و ابدی زندگی بسر کریں گے، اور دوسرے وہاں ان کا جمالیاتی اِرتقاء "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ" (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) کی نسبت سے ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اس سے امر کی توجیہہ ہوجاتی ہے کہ کیوں اہلِ آرزو کو اپنے معروضِ حسن و عشق کی طلب و جستجو رہتی ہے۔

جمالیاتی اِرتقاء کا مطلب حسّی، قلبی، نفسی نظام کے نُورِ حُسن کی درجہ بدرجہ ترقّی ہے، جو "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ" کی نسبت سے ہوتی ہے۔ چونکہ انسان کا باطن حسین ہوتا ہے اور نُور بھی حُسن کا ایک اہم عنصر ہے، اس اعتبار سے نُور کی تدریجی ترقّی کو ہم نے "جمالیاتی اِرتقاء" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تعبیر اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت و ذکر سے انسان کا حُسنِ باطنی کے ساتھ اس کا نُور بھی تدریجی ترقّی کرتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی چشمِ قلب بھی بینا ہوجاتی ہے، اور وہ حَسنہ و سیّئہ، خیر و شر، سود و زیاں، توحید و شرک، حُسن و قُبح، معروف و منکر وغیرہ وغیرہ میں امتیاز کرتا اور جادۂ مستقیم کو دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ علاوہ بریں، جمالیاتی اِرتقاء کے ذریعے اہلِ آرزو "احسان" کے مقامِ شاہدیت پر متمکن ہوتے ہیں، جو ان کے معروضِ حُسن و عشق کی دید و حضوری اور قُرب و رضوان کا حُسنُ المقام ہے۔

اصل یہ ہے کہ جمالیاتی اِرتقاء کی بدولت ہی اہلِ حُسن و سُرور یا نفوسِ مطمئنّہ کا نُور دنیا میں اگر انہیں اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں، نبییّنؑ، صدّیقین، شہدآء اور صالحین کی صراطِ مستقیم دکھاتا ہے تو اُخروی یا دار الآخرت میں ان کو جنّت کی راہ دکھلائے گا اور ان کے آگے آگے اور دائیں دوڑتا جائے گا، یہاں تک کہ وہ جنّت کے دروازے پر پہنچ جائیں گے (التحریم ۶۶: ۸)۔ یہاں پہنچ کر اہلِ حُسن و سُرور کو ان کا ربّ کریم بڑے پیار سے اپنی خوشنودی اور جنّت میں اپنا مہمان بناتے کا مژدۂ جانفزا سنائے گا اور فرداً فرداً ان کو اپنی جنّت میں اپنے بندوں کی رفاقت وصحبت میں رہنے کی دعوت دے گا (الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔

ربّ ذوالجلال والاکرام کی جنّت میں ایسی ایسی اَن دیکھی، اَن سُنی اور غیر مترقّبہ نعمتیں ملیں گی اور خواہش کے پیدا ہوتے ہی چشم زدن میں ملیں گی کہ اہلِ جنّت ان کے حیرت انگیز نظاروں سے متحیّر اور ان کی گوناگوں کیف پرور و جانفزا لذّتوں سے مکیّف و مسحور ہو کر رہ جائیں گے۔ ان نعمتوں کے علاوہ رضوانِ الٰہی کی نعمتِ عُظمیٰ سے ان کی طمانیّت و مسرّت بحدِّ کمال پہنچ جائے گی، لیکن کمال نقطۂ متناہیت پر نہیں، بلکہ کمالِ نو کے نقطۂ آغاز پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اہلِ جنّت کے لیے حیرت انگیز و مسحور کن نعمتِ عُظمیٰ ان کے لیے معروضِ حُسن و عشق یا آخری تمنّا کا جلوۂ صُوری ہو گا، جو ہر آن ان کے لیے تازہ بتازہ، نو بنو اور ارتقائی ہو گا۔ اِرتقائی اس اعتبار سے کہ الحُسن ہر آن اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت کی شانِ نو میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہے گا (الرّحمٰن ۵۵: ۲۹)۔ یہ جلوہ ایک تو جمالیاتی شیئون کی صورت میں ہو گا، دوسرے صُوری بھی ہو گا اور غیر متشکّل بھی، نیز یہ جلوہ اہلِ جنّت کی نظر کے لیے خوب سے خوب تر، اور ان معنیٰ میں اِرتقائی ہو گا۔ اس سے مقصودِ الٰہی ایک تو اہلِ جنّت کی جمالیاتی ثروت میں مستقلاً اضافہ کرنا اور دوسرے ان کے نُورِ باطنی کے "اِتمامِ اِرتقائی" کے سلسلے کو جاری و ساری رکھنا ہو گا۔ چونکہ اہلِ آرزو کا یہ جمالیاتی اِرتقاء اس کی آخری تمنّا کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لیے یہ مشیّتِ الٰہی، مقصودِ فطرتِ انسانی اور غایتِ زندگی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ جالیاتی اِرتقاءِ حیاتِ انسانی کی تقدیر اور اس کا حقیقی اِرتقاء ہے۔

اس مقام پر اس اصلِ عظیم کا اعادہ کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ جو لوگ اس دنیا میں اپنے اِلٰہ و ربّ کے ذکر اور اوامر و نواہی کو بھلا کر اپنے جالیاتی اِرتقاء سے غافل رہتے ہیں، وہ قلب کے اندھے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا حسّی قلبی یعنی نظام اپنے نُور سے محروم ہوتا ہے۔ چنانچہ قدرت کے قانونِ مکافات کے مطابق یہ لوگ الحیوان یا دارالآخرت میں بھی اپنے اس نُور سے محروم اور اندھے اُٹھیں گے (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴-۱۲۵)۔ اس کے نتیجے میں وہ دُنیا کی طرح آخرت میں بھی اپنے اِلٰہ و ربّ کو جانے والا راستہ نہ دیکھ سکیں گے اور نہ ہی اپنی منزلِ مقصود کو پا ہی سکیں گے، جو حُسنُ المآب یا جنّت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ جالیاتی اِرتقاء کی ہماری حیاتِ کُلّی یا دُنیوی۔ اُخروی زندگی میں غیر معمولی اہمیّت ہے تو پھر وہ کون سے عوامل و محرکات ہیں جو انسان کو اس سے غافل و کم آشنا رکھتے ہیں؟ دوسرے جالیاتی اِرتقاء کا منہاج کیا ہے؟

یہ دونوں سوال اہم اور تفصیل چاہتے ہیں، لیکن موقع کی مناسبت سے ان کا اختصار سے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ معاشرتی سرطان یا سرطانی ادارے ہیں، جو ہر زمان و مکان میں افرادِ نسلِ انسانی کو جالیاتی اِرتقاء کی غیر معمولی اہمیّت سے ناآشنا و غافل رکھنے میں سرگرمِ عمل رہے ہیں اور اب بھی ہیں؛ اس کے لئے "منفی تاریخی عمل" کو مثبت بنانے یا اس کی سمت کو صالحہ و درست کرنے کی خاطر ہر زمان و مکان اور قوم میں انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں اور ختمِ نبوّت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کی خاطر جملہ افرادِ نسلِ انسانی کو اپنی زندہ کتاب عطا کر دی، جو جالیاتی اِرتقاء کرنے کے رہبر اُصول اور منہاج بتاتی اور تاریخ کے حوالے سے ان کی تصریح کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، اس سلسلے میں نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّتِ حسنہ بھی نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سرطانی و استحصالی یا فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری اداروں کی سلبی سرگرمیوں سے ایک تو قوم کے تاریخی عمل کی جہت صالحہ درست نہیں رہتی، دوسرے، معاشرے میں ذیلی طاغوتی و سرطانی ادارے بھی معرضِ وجود میں آجاتے ہیں۔ ان سب کی سلبی سرگرمیاں انسان کو جمالیاتی ارتقاء کے مفہوم اور اہمیت و غایتِ حقیقی سے بے خبر و غافل رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتی اور کرتی رہی ہیں۔ علاوہ بریں، یہ ادارے افرادِ نسلِ انسانی کے باطنی نور کی شمع کو خاموش کر کے ان کے قلوب کو اندھا اور مردہ اور انہیں گمراہ کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں اپنی شمعِ نور کو فروزاں کرنے اور اپنے نور کا نشوو ارتقاء کرنے یا اپنا جمالیاتی ارتقاء کرنے کی آرزو بھی مضمحل و ضعیف ہوتے ہوتے بے جان ہو جاتی ہے۔

دوسرے سوال کا ایک جواب اجتماعی اور دوسرا انفرادی نوعیت کا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے بھی اس سوال کے دو جواب ہیں؛ ایک سلبی اور دوسرا ایجابی۔ سلبی جواب یہ ہے کہ ان سرطانی اداروں کا ان کے ذیلی اداروں سمیت استیصالِ کلی کر دیا جائے اور معاشرے کو ان کے اثرات سے پاک و صاف کر دیا جائے۔ اس کا ایجابی جواب یہ ہے کہ سرطان زدہ معاشرے کی جگہ اسلامی یا مثالی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کے ہر گوشے میں قرآنِ حکیم کی حاکمیتِ اعلیٰ تسلیم کی جائے۔ بالفاظِ دیگر، حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہو اور اس کا حکم چلتا ہو۔ انفرادی لحاظ سے اس کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے: تزکیہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمالیاتی ارتقاء کا بہترین منہاج تزکیۂ نفس ہے۔ اور تزکیۂ نفس کا احسن اکمل طریقہ حسنِ صلوٰۃ پنجگانہ ہے۔ حسنِ صلوٰۃ سے مراد ایسی صلوٰۃ ہے جس کے جملہ فرائض وواجبات اور تقاضے پورے کیے جائیں؛ اور اس کے لیے نظامِ صلوٰۃ کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نظامِ صلوٰۃ اپنی تکمیل کے لیے نظامِ زکوٰۃ کو چاہتا ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ کسی معاشرے میں افراد کو اپنا جمالیاتی ارتقاء کے قابل بنانے کے لیے صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم کرنا اور ان کو قرآن و سُنّہ کے مطابق چلانا، لازمی ہے؛ نیز ان دونوں

نظاموں کو فعّال و حرکی بنانے اور رکھنے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظاموں کا قیام بھی لابدی ہے سان چاروں نظاموں کو قائم کرنے اور چلانے کی ذمّہ داری مشترکہ طور پر حکومت اور معاشرے کی ہے۔

جالیاتی اِرتقاء انسان کی امتیازی خصوصیّت ہے، کیونکہ یہ انسان سے مخصوص ہے۔ علاوہ بریں، یہ اللہ تعالیٰ کے قرب و رضوان اور دید و لِقاء، نیز ترفّع درجات یا معراجِ انسانی کا وسیلہ ہے۔ اس اعتبار سے جالیاتی اِرتقاء حُسنِ عبادت کی غایت اور حیاتِ انسانی کی غایت الغایات کا واحد ذریعہ ہوا۔ اس کا سلسلہ دُنیا میں شروع ہوتا ہے، لیکن آخرت میں بھی جاری و ساری رہے گا، اور کبھی ختم نہ ہوگا۔ اسی کی بدولت اہلِ جنّت یا اہلِ حُسن دسُرور اپنے معروضِ حُسن و عشق کی ہم نظری و ہمکلامی کی رحیقِ مختوم کی لذّت سے سرشار رہیں گے؛ اُن کی دُنیا میں وسعت و پنہائی پیدا ہوتی رہے گی اور اسی نسبت سے ان کی جالیاتی ثروت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

قرآن فی الصّلوٰۃ

صلوٰۃ و قرآن کا رشتہ جسم و روح جیسا ہے، لہٰذا دونوں لازم و ملزوم ہوئے۔ جسم بغیر روح کے مُردہ، یعنی حُسن و حیات کی صفات سے معرّا ہوتا ہے، لہٰذا جسم اپنے جمال و جلال حرکت و توانائی اور ثبات کے لیے روح چاہتا ہے اور روح اپنا جلوہ پیدا کرنے کے لیے جسم کو چاہتی ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ قرآن کو اور قرآن صلوٰۃ کو چاہتا ہے۔ قرآنِ مجید الحُسن و الحق اور الحیّ و القیّوم کا زندۂ جاوید کلام ہے، جس میں اس کا نفخۂ روح ہوتا ہے۔ نفخۂ روح کی حقیقت کا علم تو صرف اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کو ہے، لیکن اُس نے جو علم قلیل عطا کیا ہے اس کی بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نفخۂ روح اس کی شمیمِ حُسن و عشق ہے، جسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حُسن سرچشمہ ہے جملہ صفاتِ حسنہ کا اور عشق عبارت ہے حُسن کی دید و لقاء، ہم نظری و ہمکلامی اور قرب و رضوان کی آرزو کی تب و تابِ جاودانی سے۔ اس اعتبار سے حُسن و عشق اور زندگی ایک ہی حقیقت کی تین تعبیریں ہیں۔ زندگی کو دراصل اپنے معروضِ حُسن و عشق کی دید و لقا اور قرب و حضوری (جسے تصوّف میں "وصال" کہتے ہیں) کی آرزو ودیعت کی گئی ہے، لہٰذا اس آرزو کی تشفّی کے لیے اُسے خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ اس جستجو کی علّتِ غائی یہ بھی ہے کہ الحُسن ہر آن خوب سے خوب تر شان میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں زندگی خود اپنے لیے بھی خوب سے خوب تر پیکر و شکل کی آرزو کرتی رہی۔ قدرت اس کی آرزو پوری کرتی رہی، یہاں تک کہ اس نے بشر کی اکمل و احسن صورت اختیار کر لی۔ ربِّ کریم نے زندگی کی آرزو کے مطابق اس کے جمالیاتی صُوری اِرتقاء کی تکمیل کر دی تو اس میں جمالیاتی اِرتقاء کی آرزو پیدا کر دی تاکہ اس کے ترفّعِ درجات اور تقرّبِ اِلٰہی کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس کی علّتِ غائی یہ تھی کہ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے جو الحیّ والقیّوم ہے، اپنی روح یا شمیمِ حُسن پیکرِ بشر میں پھونک دی۔ اس نفخۂ روح یا شمیمِ حُسن کا اعجاز تھا کہ اس میں حِسّی، قلبی، نفسی نظام معرضِ وجود میں آ گیا اور اس کی فعالیّت سے انسانی زندگی کا باطن حسین و منیر ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک تو اس میں اپنے معروضِ حُسن و عشق کا شعور و عرفان زندہ و فعّال ہو گیا، دوسرے، اس کا سوزِ عشق افزوں تر ہو گیا اور اس سے اس کے نُور کی تکمیل ہونے لگی، جمالیات کی زبان میں اس کے جمالیاتی اِرتقاء کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، جو الحیوان کے جہانِ حُسن و عشق (= جنّت) میں ابدالآباد تک جاری و ساری رہے گا۔ جمالیاتی اِرتقاء کا جذبۂ محرّکہ حیاتِ انسانی کی آرزوئے معروضِ حُسن و عشق ہے جو اپنی سُنّت کے مطابق ہر آن ایک نئی شان میں اس میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہے گا، اور وہ اس مشاہدے سے جمالیاتی ثروت حاصل کرتی رہے گی۔

اس مشاہدے کی حقیقت کا علم تو فقط الحُسن و الحق کو ہے، البتّہ اہلِ حُسن و آرزو کو اس دنیا میں جو مشاہدۂ الحُسن ہوتا ہے، وہ ایک تو مجازی رنگ و صورت میں ہوتا ہے، دوسرے ان

کے جمالیاتی ذوق کی رعایت سے ہوتا ہے، اور تیسرے، وہ صورت بے مثال و قرۃ العین ہوتی ہے۔ اِس بے نظیر جمالیاتی مشاہدے سے ایسی شرابِ طہور و کافور ملتی ہے، جس کے نشے کی حیرت و مستی اور جمالیاتی ٹھنڈک جتنی شدید ہوتی ہے اتنی ہی لذّت آفرین وطمانیت انگیز، کیف پرور و سرور آگیں اور وجد آفرین و مسحور کُن ہوتی ہے۔ اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جہانِ حُسن و عشق یا خُلدِ بریں میں مرگ و سیئہ سے منزّہ پیکرِ حُسن و عشق زندگی کو اپنے معروضِ حُسن و عشق کا جو مشاہدۂ صُوری نصیب ہو گا، وہ رنگِ حقیقت سے زیادہ مزیّن ہو گا اور اُسے اس کی لقاء و حضوری، ہم نظری و ہمکلامی اور قرب و رضوان کی ایسی رحیقِ مختوم ملے گی، جس کی بے مثال لذّت و سرخوشی، حیرت و مستی اور کیف و سرور کی جمالیاتی ٹھنڈک ایسی وجد آفرین و مسحور کن ہو گی کہ جب تک الحُسن جلوہ افروز رہے گا، اُسے زمان و مکان کا احساس و شعور نہ ہو گا۔ اُسے آرزو ہو گی تو یہ ہو گی کہ وہ ابدالآباد یہ نظارہ کرتی رہے۔ لیکن اہلِ حُسن و عشق کے شوقِ وصال کو سوا اور انھیں لذّتِ فراق سے آشنا کرنے کے لیے الحُسن عالمِ حجاب میں جائے گا تو وہ پھر اپنے پہلے عالمِ طرب و نشاط میں لوٹ آئیں گے۔

اہلِ حُسن و عشق کو جہانِ حُسن و حیات میں اَن دیکھی اور اَن سُنی بے مثال نعمتوں کے علاوہ ہر وہ نعمت چشم زدن میں ملے گی، جس کی وہ خواہش کریں گے۔ نفس وہاں بھی ہر دم خواہش پیدا کرے گا، جو حسین ہو گی اور پوری ہوتی رہے گی۔ اس جہانِ حُسن و حیات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہو گی کہ سیری برنگ اِشتہا اور اِشتہا برنگ سیری ہو گی۔ حیاتِ انسانی اپنے زوج کی آرزو رکھتی ہے کہ یہ اس کی ناگزیر حاجت ہے۔ اس کی یہ آرزو بھی اس حسین انداز سے پوری ہو گی کہ اس پر حیرت و مستی کی حالت طاری ہو جائے گی۔ صنفِ جمیلہ رنگِ حیا سے مزیّن، اگر گوہرِ ناسفتہ و ناسفتہ اور شبابِ نوخیز و سحر انگیز کا پیکرِ جمیل و دلکش ہو گی تو مردِ جلیل کی جوانی و مردانگی بھی مسحور کن و جاذبِ نظر اور رنگِ دوام سے مزیّن ہو گی۔ زوجین میں محبت کا یہ عالم ہو گا کہ وہ یک جان دو قالب ہوں گے، وفاداری بشرطِ استواری ان کا شعارِ حیات ہو گا۔ علاوہ بریں،

دوستوں کی رفاقت و صحبت سے جالیاتی ثروت حاصل کرنے کے لیے اہلِ حسن و سرور (نبیین، صدیقین، شہدآء اور صالحین) ان کے دوست و رفیق ہوں گے۔

جہانِ حسن وحیات کی یہ حیاتِ طیبہ و ابدی ان کو ملے گی جو دنیا میں سچے نمازی تھے اور صلوٰۃ سے وہ جالیاتی ثروت حاصل کرتے تھے، اس کے نتیجے وہ اہلِ حسن و سرور تھے۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو قرآن و صلوٰۃ کا رشتہ حسن و عشق کا ہے۔ قرآنِ عظیم حسن ہے، اس لیے کہ اس میں الحسن کی شمیم حسن ہے؛ اور صلوٰۃ اس لیے عشق ہے کہ وہ تمسک بالقرآن اور الحسن کے قرب و رضوان کی آرزو کا حسین و حیات آفرین مظہر ہے۔ حسن میں جمال و جلال، نور و توانائی، طمانیت و قرۃ العین، کیف و سرور، حیات و محبوبیت، طہارت و نظافت، توازن و زیبائی ایسی صفاتِ حسنہ پائی جاتی ہیں۔ عشق میں جو حسن کا زوج ہے، درد و سوز، آرزو مندی، داعیۂ احسان و فدائیت اور جذبۂ ایثار و قربانی پایا جاتا ہے۔ قرآن کا حسن اور صلوٰۃ کا عشق یک جان ہو جاتے ہیں تو ان کی رحیقِ مختوم دو آتشہ ہو جاتی ہے اور اس میں اہلِ آرزو نمازیوں کو اہلِ حسن و عشق، اولیاء اللہ، نفوسِ مطمئنہ اور اصحاب الجنۃ یا صدیقین، شہدا اور صالحین بنانے کی تاثیر ہوتی ہے۔ ایسے نفوس تیار کرنا ہی حقیقت میں نظامِ صلوٰۃ کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں نظامِ صلوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ غور کریں تو نظامِ صلوٰۃ ہیئتِ اجتماعیہ کا محور ہے، جس کے گرد ربط و ضبط کے ساتھ انفرادی و اجتماعی زندگی گردش کرے تو اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔

اجرامِ فلکی ہوں یا ذراتِ ارضی، آزادیٔ ارادہ و اختیار سے محروم اور پابندِ تقدیرِ الٰہی ہونے کے باعث اپنے اپنے مدار کے گرد ارتباط کے ساتھ گھومنے پر مجبور ہیں، اسی لیے ان کا توازن برقرار ہے اور وہ برہمی و فساد اور تباہی و بربادی سے محفوظ و مصئون ہیں۔ چنانچہ حیاتِ انسانی کو بھی اپنی بقا اور توازن کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محور کے گرد مربوط طریقے سے گھومنا ناگزیر ہے، لیکن انسان صاحبِ ارادہ و اختیار ہے اور اسے اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی

کو اپنے محور سے دُور لے جانے اور اس سے رابطہ منقطع کرنے کی آزادی حاصل ہے۔
لہٰذا تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی مستند، سچی اور جامع و مانع کتاب اللہ یعنی قرآنِ حکیم شاہد ہے کہ جس زمان و مکان میں کسی قوم نے اپنے محور سے رابطہ منقطع کر لیا اور اس سے دُور ہو گئی، تو اس کا توازن بگڑ گیا، شیرازہ منتشر ہو گیا اور اس کے نتیجے میں وہ گمراہ ہو کر ہلاک و برباد ہو گئی یا ذلت و مسکنت اور محکومی و غلامی اس کا مقدر بن گیا۔ یہ ہے اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے فلسفے کا لُبِّ لباب۔

کسی قوم کا اپنے محور سے رابطہ استوار نہ رہے تو وہ حُسن و زندگی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ربّ العالمین، جو رحمٰن و رحیم ہے، اس کے ہر نبی اور رسول علیہ السلام کی بعثت کی غایتِ حقیقی بالخصوص اپنی مردہ قوم کو زندہ کرنا تھا۔ اس کا ایک ہی احسن و اکمل طریقہ تھا اور ہے، جو سب نے اپنایا کہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کر کے اُسے ہیئتِ اجتماعیہ کا محور بنایا جائے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا اس سے رابطہ استوار کیا جائے۔ یہ درحقیقت زندہ و بیدار کرنا اور اس سے ان کا رابطہ استوار کرنا تھا تاکہ اس کے نتیجے میں وہ دیگر جملہ باطل معبودوں کو چھوڑ کر صرف اور تنہا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو اپنا معبود و محبوب اور مقصود و خدا (= اِلٰہ)، اور رازق و پروردگار، مولیٰ و نصیر، کارساز و دستگیر، مشکل کُشا و حاجت روا اور حاکم و مالک (= ربّ) سمجھیں، مانیں اور بنائیں۔ یہ ہے دین و ایمان اور صلوٰۃ و حیات کی حقیقت، جسے فلسفۂ صلوٰۃ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ چونکہ صلوٰۃ میں زندگی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں پر بے حد مہربان اور ان پر لطف و کرم کرنے والا ہے، نیز اس کی رحمت کُل اشیاء کو محیط ہے، انہیں "زندہ" اور حیاتِ طیبہ سے آشنا دیکھنا چاہتا ہے، لہٰذا بانداز نصیحت انھیں حکم دیتا ہے کہ "اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسولِ (اعظم و آخرؐ) کی دعوت کو قبول کرو جب وُہ تمہیں اس چیز (= صلوٰۃ) کی طرف بلائے، جو تمھیں زندہ کرنے والی ہے (الانفال ۸ : ۲۴؛ نیز حیاتِ طیبہ کے لیے دیکھیے النحل ۱۶ : ۹۷)۔

اس میں شک نہیں کہ قرآنِ عظیم چشمۂ حیات ہے، جس سے تقوٰی و ایمان، صدق و حق، امانت و دیانت، علم و حکمت، حسن و نور، طمانیت و سرور، حسنہ و صلاح، عدل و احسان، محبّت و رحمت، ایثار و قربانی اور جذبۂ جہاد کے سوتے پھوٹتے اور مزرعِ حیات کو سیراب و زندہ اور طیّب و بار آور کرتے ہیں؛ لیکن جب صلوٰۃ کی صورتِ حسن، الحسن والحق کے خانۂ حسن و نور میں اس کے حضور اس کا حسنِ کلام نور فشاں ہوتا ہے تو اس کی تاثیر سہ گونہ ہو جاتی ہے۔ اسکے نتیجے میں قرآن فی الصلوٰۃ میں قلوب کا تزکیہ و احیاء کرنے اور انہیں حسین و منیر بنانے؛ نیز ان میں ان کے اِلٰہ و ربّ، حسن و حق، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حسنِ حیات اور حسنُ المآب کی آرزو کا احیاء اور ان کے نورِ باطنی کا اِتمام کرنے کی تاثیر کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رہے کہ اِتمامِ نور سے مراد ترفیعِ درجات ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔

قرآنِ مجید بلاشبہ آئینۂ حسن و حق ہے، لیکن صبح کی جمیل و منیر اور طیّب و مُطہّر فضا میں وہ مشہود ہوتا ہے (الاسراء، ۱۷: ۷۸)؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہنگامِ سحر الحسن اپنے حسنِ کلام میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے، لیکن اس کا مشاہدہ وہ اہلِ حسن و آرزو یا مُطہّرین کرتے ہیں، جو احسان کے مقامِ شاہدیّت پر متمکن ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآنِ عظیم سے متعلق متعدّد مقامات پر جو بصیرت افروز حقائق بیان کیے ہیں، ان میں سے صرف دو مقامات سے چند آیات پیش کی جاتی ہیں: سورۂ واقعہ میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ ..... اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ ..... وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (الواقعہ ۵۶: ۷۵ تا ۸۲)؛ بلاشبہ میں تاروں کے ڈوبنے کی قسم کھاتا ہوں۔ اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ حسین و بلند مرتبت قرآن (= پڑھنے کی چیز ہے)، جو ایک محفوظ مصئون کتاب میں ہے، جسے مطہّرین (= پاکباز و پاک سیرت، اہلِ صدق و صفا) کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا (یعنی اس کی معنویت تک ان کے عقل و فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی)۔ یہ کُل عالموں (یعنی

انسانی، حیوانی، نباتاتی، جماداتی، سماوی، فضائی، بحری، نیز برزخی، الحیوانی عالموں اور ان کے وراء الوراء عالموں) کا خالق و پروردگار اور مالک و حکمران کی تنزیل (ملفوظی و مکتوبی وحی) ہے۔ اس اصل عظیم کے باوجود تم ایسے (عظیم و حسین اور مکرّم و مطہّر) کلام کے ساتھ بے التفاتی روا رکھتے ہو۔ (غضب تو یہ ہے کہ) اس نعمتِ (بے بہا) میں تم نے اپنا حصّہ یہ مقرّر کیا ہے کہ (اس سے حسن و حیاتِ طیبہ و جاودانی، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور جمالیاتی ثروت حاصل کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کے بجائے) اسے جھٹلاتے ہو۔

ان آیاتِ جمیلہ میں اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے ہماری توجّہ مندرجۂ ذیل حقائق کی طرف مبذول کرائی ہے:

ایک یہ کہ قرآنِ عظیم نہایت بلند مرتبت و حسین ملفوظی و مکتوبی وحی و تنزیل ہے، جو ہر طرح کی تحریف سے محفوظ و مصئون ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود ربِّ ذوالجلال والاکرام نے لے رکھا ہے (الحجر ۱۵:۹)۔

دوسرے، اس کی معنویت یا روحِ حسن سے صرف وہی لوگ رابطہ قائم کر سکتے ہیں، جن کا حسّی، قلبی، نفسی نظام طیّب و مُطہّر ہو، اور وہ پاکباز ہوں، نیز اُن کی فکر و نظر، آرزو اور حیات حسین و پاک ہوں۔ طہارت اصل میں حُسن کی روح ہے، لہٰذا مُطہّرین ہوتے ہی وہ ہیں جو محسن و حُسن پسند، اہلِ حسنِ فکر و نظر اور اربابِ اخلاقِ حسنہ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی روح یا معنویت تک رسائی حاصل کرنے اور اس سے رابطہ استوار رکھنے، نیز الحُسن کا اپنے اس کلامِ مطہّر و حسین میں جلوہ دیکھنے کے لیے اہلِ ایمان و آرزو کا مطہّر ہونا ناگزیر ہے۔

تیسرے، قرآنِ مجید کی عظمت و رفعت اور اس کی آفاقی و ابدی حیثیت کا اندازہ اس واقعیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ربُّ العالمین کا کلام ہے، اور اسی نے اِسے اپنے بندوں کے لیے نازل کیا ہے تاکہ وہ اس کی تاثیر سے اپنے امراضِ قلب کا علاج کریں، شفا پائیں،

حیاتِ طیبہ، دُنیوی و اُخروی حسنہ، علم و حکمت اور جنّت حاصل کریں ؛ جو اس کے معروضِ حُسن و عشق کے بے مثال جلووں اور بے قیاس نعمتوں کا جہانِ حُسن و زندگی ہے۔

چوتھے، انسان کے ظلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ اس سے زیادہ فائدہ اُٹھانے، جاہ و ثروت حاصل کرنے، اس کی روشنی میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے اور وہاں اپنے اِلٰہ و ربّ کے قرب و حضوری میں ابدی زندگی گزارنے، نیز اس کی ہم نظری و ہمکلامی کی رحیقِ مختوم کے نشۂ روح پرور سے سدا مکیّف و مسرور رہنے کے بجائے وہ اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ مزید برآں وہ قرآنِ مجید ایسے گوہرِ بے بہا کی قدر کرنے کے بجائے، جو بہلائے جنّت ہے۔ اس کی ناقدری بلکہ تکذیب کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے حوالے سے اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اہلِ نظر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کے انحطاط و زوال کا سبب قرآنِ حکیم سے دوری و مہجوری ہے اور اس مہجوری کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مُطَہّر نہیں رہی۔ یہ مطہّر یا حسین و منیر قلب ہے جو قرآنِ حکیم کی روحِ حُسن یا معنویت کو دیکھ، سمجھ اور اس سے رابطہ استوار کر سکتا ہے۔ دید و ادراک کے اس اصل الاصول کو مولانا رومیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے :

قیامت شو قیامت را ببیں
کہ دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ قرآنِ مجید ایسے مُطَہّر و منیر اور حسین و کریم کلام کے معانی و مطالب، معارف و غوامض اور اسرار و رموز سمجھنے اور اس کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھنے کی خاطر اہلِ ایمان کا مطہّر و حسین اور سچے نمازی ہونا ناگزیر ہے۔ بالفاظِ دیگر، تمسک بالقرآن کی تین بنیادی شرائط ہیں : ایک طہارتِ حیات، دوسری نظامِ صلوٰۃ اور تیسری اقامتِ صلوٰۃ بالحق۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں صلوٰۃ میں تلاوتِ قرآن فرض ہے اور اس کے بغیر صلوٰۃ نہیں ہوتی۔

صلوٰۃ و فلاح

صلوٰۃ میں قرآنِ مجید کی تاثیرِ برقِ حسن سے اہلِ آرزو کے قلوب کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جس میں جمالیاتی ۔نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کا امکان ہوتا ہے، جو انسان کی کایا پلٹ کر دیتا ہے ۔ اگرچہ ہر صلوٰۃ میں ایسے جمالیاتی ۔نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کا امکان ہوتا ہے، لیکن صلوٰۃ الجمعۃ میں بالخصوص نمازیوں کی کثرت کے باعث ذکرِ الٰہی بھی بکثرت ہوتا ہے اس لیے اس میں جمالیاتی ۔نفسیاتی لمحات کی وقوع پذیری کے امکانات بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیثِ جمیلہ میں نمازِ جمعہ جامع مسجد میں پڑھنے کی تاکید بھی کی گئی ہے اور اس کے فضائل بھی کثرت سے بیان ہوئے ہیں ۔ اس وقت سورۂ جمعہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، جس میں صلوٰۃ کو صاف الفاظ میں ذکرِ الٰہی کہا گیا ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ.... تُفْلِحُوْنَ ○ (الجمعۃ ۶۲: ۹-۱۰):

اے مسلمانو! جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لیے پکارا جائے یعنی اذان دی جائے تو "اللہ کے ذکر" کی طرف لپک کر آؤ اور خرید و فروخت (یعنی لین دین اور کاروبار) چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے (دُنیوی واُخروی حسنہ کے اعتبار سے) زیادہ بہتر ہے، اگر تمہیں اس حقیقت کا علم ہوتا۔ پھر جب صلوٰۃ ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کی طلب و جستجو کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ "فلاح" قرآنِ حکیم کی اہم ترین مصطلحات میں سے ہے۔ اس کے مفہوم کو واضح طور سے سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس لفظ کا مادہ ف ل ح ہے، جس کے معانی میں کاشتکاری کا مفہوم پایا جاتا ہے چنانچہ فلاحت کو کاشتکاری اور فلّاح کاشتکار کو کہتے ہیں (المفردات، بذیل مادہ ف ل ح)۔ اس مادے

کے معانی و مفہوم کے حوالے سے اس مصطلحۂ قرآنی پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ کاشتکار کا بویا ہوا دانہ، روئیدہ جب اس کی محنت و مشقت اور رحمتِ الٰہی کی بدولت زمین کے سینے کو پھاڑ کر اس کے اندھیروں اور مٹی کے بارِ گراں سے باہر نکلتا اور سورج کی روشنی میں آتا ہے تو کثرت سے برگ و بار لاتا اور کاشتکار کی متاع بنتا ہے۔ کچھ اسی طرح نفسِ انسانی تقویٰ و آرزوئے حسن اور ایمان و حسنِ عمل کے نور اور فضلِ الٰہی کی بدولت اپنے تغافل و تجاہل، جرم و گناہ، فحشاء و منکر کے بارِ گراں اور تاریکیوں سے نکل کر اپنے نور کا اتمام یا جمالیاتی ارتقاء کرتا ہے تو اس کا ثمرہ اُسے دُنیوی و اُخروی حسنہ، طمانیت و مسرت، جمالیاتی ثروت، اور اپنے اِلٰہ اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کی دید، حضوری اور قرب و رضوان کی صورت میں ملتا ہے۔ اسے قرآنِ مجید "فلاح" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس اصطلاح کی معنویت و اہمیت کو جامع طور سے سمجھنے کی خاطر چند آیاتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں:

(۱) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ٥ (الشمس ۹۱ : ۷ تا ۱۰) :

نفس اور اس ذات کی قسم، جس نے اس کا تسویہ کیا، یعنی اس کی تکمیل کی اور موزوں بنایا، پھر اس کا فجور (یعنی قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بے خوف و بیباک ہو کر حد سے تجاوز کر جانے اور سرکشی اختیار کرنے کی خواہش) اور تقویٰ (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت کی بدولت حدود میں رہنے اور جرم و گناہ کے کانٹوں سے دامن بچا کر نکل جانے کی آرزو) کو وجدانی طور پر ودیعت کر دیا۔ جس شخص نے نفس کا تزکیہ کیا (یعنی اس کی تطہیر و تحسین کر کے اس کی نشوونما کی)، وہ کامیاب و بامراد ہو گیا۔ (بخلاف اس کے) جس نے اسے (گناہوں اور برائیوں کے بارِ گراں) تلے دبا دیا اور اس کی نشوونما نہیں کی، وہ بے نیلِ مرام رہا۔

ان آیاتِ جلیلہ سے اس اصلِ عظیم سے آگاہی ہوئی کہ تزکیۂ نفس انسان کی دُنیوی و اُخروی کامیابی و ترقی کی پیش شرط (PRE-REQUISITE) ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں "فلاح" کی معنویت اس

ایجاز بلاغت سے بیان ہوتی ہے کہ اُسے اعجازِ قرآن کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۞ سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ ۞ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۞ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۞ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۞ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۞ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۞ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۞ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۞

(الاعلیٰ ۸۷: ۹ تا ۱۷):

نصیحت کرو اگر نصیحت فائدہ پہنچائے۔ نصیحت وہ قبول کرتا ہے جو (انجام سے) ڈرتا ہے۔ اور اس سے گریز وہ کرے گا جو انتہائی شقی القلب (= بدبخت) ہوگا۔ ایسا شخص سب سے بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر عذاب النار سے اس کی حالت یہ ہوگی کہ) اس میں نہ مرے گا اور نہ جیے گا (یعنی لذّتِ موت و حیات سے ناآشنا رہے گا)۔ یقیناً وہ شخص کامیاب و کامران ہوگیا۔ جس نے تزکیۂ نفس کیا، اور اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر صلوٰۃ ادا کی۔ مگر تم تو دُنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر بھی اور اسے بقا بھی ہے۔

یہ آیاتِ جلیلہ فلسفۂ حیات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں حیاتِ انسانی کی ناکامی و نامرادی کی بنیادی وجہ بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کرتا وہ شقی القلب بن جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں نصیحت پر کان دھرنے کے بجائے اس سے گریز کرتا ہے، اور اس کا آخرت میں انجام یہ ہوگا کہ اسے جہنّم کی انتہائی شدید آگ میں جلنا پڑے گا، جہاں اُسے نجات دلانے کے لیے نہ موت آئے گی اور نہ وہ لذّتِ زندگی سے آشنا ہی ہوگا۔ یہ عالم سکرات جیسا عالم ہوگا، جس کے عذابِ مقیم میں انسان کو رہنا پڑے گا تو اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ زندگی کتنی شیریں و حسین نعمتِ عظمیٰ و غیر مترقبہ ہے۔ لیکن ظلم و جہل شرک و کفر، جرم و گناہ اور عدوان و تکذیبِ دین کے اثرات کے سبب وہ اجیرن اور شکیب رُبا بن جائے تو پروانۂ حیات یا نفس کے لیے موت شمعِ حسنِ نجات بن جاتی ہے۔ نیند جو موت کی زوجہ ہے اور خوف و حزن، رنج و محن اور درد و الم سے نجات پانے

اور سا آرام و راحت اور سکینت و طمانیت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، قدرت کی بڑی ہی فکر انگیز و بصیرت افروز نعمتِ عظمیٰ ہے، جو موت کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔

یہ تھا جملۂ معترضہ۔ زیرِ نظر آیاتِ جمیلہ سے فلاح کی معنویت واضح ہو جاتی ہے کہ عذاب النار سے نجات، لذتِ حسنِ حیات سے بہرہ مندی اور جنت میں حیاتِ ابدی پانا عبارت ہے "فلاح" سے؛ نیز ان سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فلاح پانے کے تین اہم ترین ذرائع ہیں: تزکیہ، یادِ الٰہی اور اقامتِ صلوٰۃ۔

علاوہ بریں اللہ تعالیٰ دُنیوی و اُخروی زندگی کی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ہمیں عبرت دلاتا ہے کہ دُنیا کی زندگی رنگِ دوام سے مزین اُخروی زندگی کے مقابلے میں رقصِ شرر کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے دُنیا اپنے جمیل و جمیل نظاروں اور نعمتوں کی فراوانی کے باوجود آخرت یا جنت کے حسنِ بے مثال اور اس کی بے حساب و بے نظیر نعمتوں اور حیاتِ جاوید و تقربِ الٰہی کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس کے باوجود انسان اگر دُنیا کو آخرت پر ترجیح دے تو یہ اس کا ظلم و جہل ہوگا۔

آخر میں سورۂ مؤمنون کی ابتدائی آیات پیش کی جاتی ہیں، جن میں واضح طور سے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ فلاح کا ذریعہ "ایمان" ہے اور ساتھ ہی سچے اہلِ ایمان کی صفات بھی بیان کر دی ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ o الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o (المؤمنون ۲۳: ۱تا ۱۱)؛ ان کا ترجمہ دوسری جگہ دیا جا چکا ہے، لہٰذا یہاں ان کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔ مؤمنوں کی اوّلین صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنی صلوٰۃ میں عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے خشوع کو اپنی اصطلاح میں استعمال کیا ہے، جس میں تضرع و خشیتِ الٰہی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ بہر حال، ایمان اگر صلوٰۃ کو چاہتا ہے تو صلوٰۃ اہلِ ایمان سے مندرجۂ ذیل اعمالِ صالحہ کا تقاضا کرتی ہے اور جو یہ

تقاضا پورا کرتے ہیں وہی سچے مؤمن ہوتے ہیں اور فلاح انھیں کو نصیب ہوتی ہے: (۱) لغو و بے ہودہ باتوں سے اعراض کرنا (۲) زکوٰۃ کے لیے سرگرمِ عمل رہنا، یعنی زکوٰۃ دینا اور اس کا نظام قائم کرنے اور چلانے میں فعّال رہنا (۳) اپنی شرم گاہوں یا جنسی اعضاء کی حفاظت کرنا بجز ازواج کے (۴) اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس و احترام کرنا (۵) اپنی نمازوں کی محافظت کرنا، یعنی ان کے فرائض و واجبات اور تقاضوں کو پورا کرنا۔

یہ نکتہ فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ محولہ بالا پہلی آیۂ جمیلہ میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ مؤمن ہی فلاح پائیں گے، اعمالِ صالحہ کرنا جن کا شعارِ زندگی ہوتا ہے، اور آخری آیہ میں فلاح کا مطلب ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ ایسے صالح مؤمن ہی وارثِ جنّت ہیں، جہاں وہ ہمیشہ حیاتِ جاودانی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

صاحبِ دل و دردمند لوگ عموماً یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اکثر مسلمان کیوں صلوٰۃ قائم نہیں کرتے؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ذکرِ الٰہی کی احسن و اکمل صورت ہے اور اس کے بغیر انسان فلاح نہیں پا سکتا اور نہ لذّتِ زندگی سے آشنا ہی ہو سکتا ہے؛ نیز وہ اپنے ربِّ کریم کی رحمت و مغفرت اور دُنیوی و اُخروی حسنہ، نیز اپنے اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق کی حضوری و ولایت اور قُرب و رضوان اور اس کی جنّت سے، جو قُرّۃُ العین اور حُسنُ المآب ہے، محروم رہتا ہے؟

اس کا ایک سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انسان اپنے ظلم و جہل کے سبب

جانتا ہے پر مانتا نہیں

اس کا دوسرا جواب جو جامع و مانع ہے، سورۂ منافقون میں ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ج وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ہ (المنٰفقون ۶۳: ۹)؛ یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو یعنی مسلمانو! تمھارے مال (مویشی، اراضی، باغات کھیتاں، کاروبار، روپیہ پیسہ، جائیدادیں، کارخانے وغیرہ وغیرہ) اور تمھاری اولادیں تمھیں ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر دیں۔ (یاد رکھو!)

جو ایسا کریں گے وُہی اصل میں خسارے میں رہنے والے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو یادِ الٰہی سے غافل کر دینے والی اہم ترین چیزیں دو ہیں: مال و دولت اور آل اولاد۔ اس سے یہ استنباط کرنا کہ ذکرِ الٰہی کی خاطر رہبانیت (= ترکِ دُنیا) اختیار کرنا ضروری ہے، کیونکہ "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی"، منطقی مغالطہ ہے۔ غور کریں تو اس سے مال و دولت اور آل اولاد کی حاجت و اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ یوں بھی رہبانیت اور نفس کُشی ایک غیر فطری فعل ہے۔ اگر کُل افرادِ نسلِ انسانی رہبانیت اختیار کرلیں تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور حیاتیاتی تخلیقی فعلیت کے سلسلے کے ختم ہونے کے ساتھ نسلِ انسانی بھی ناپید ہو جائے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفسِ انسانی موت سے پہلے نہ مرتا ہے اور نہ اس کی خواہشیں ختم ہی ہوتی ہیں، لہٰذا نفس کُشی کے لیے رہبانیت یا ترکِ دُنیا اختیار کرنا اپنی فطرت کے خلاف بغاوت کرنا اور ربّ العالمین کی حیاتیاتی تخلیقی فعلیت میں حصّہ لینے سے انکار کرنا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور کُل زندگی کو محیط ہے اور اس کی رُو سے ربّ العالمین نے اپنی کُل نعمتیں، جو حسین و دلکش ہیں، جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے تمتع و استفادہ کے لیے بنائی ہیں، لہٰذا ان سے استفادہ و تمتع کرنے کی کوشش نہ کرنا، کفرانِ نعمت ہے، جو گناہِ کبیرہ ہے؛ نیز اس اعتبار سے بھی رہبانیت کفرانِ نعمت ہوئی۔ قرآنِ حکیم نے اس ضمن میں ایک تو ہم پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ انسان میں نرینہ اولادوں، سونے چاندی کے ڈھیروں، چیدہ گھوڑوں، مویشیوں اور زرعی اراضی کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے اور یہ چیزیں دُنیا کی زندگی کی متاع بھی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے جہانِ حسن و زندگی یا جنّت، جو (انسان کا حقیقی) گھر ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (آل عمران ۳: ۱۴)۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس اصلِ عظیم سے بھی آگاہ کر دیا کہ "جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولادیں (تمھارے لیے) کڑی آزمائش (فِتنہ) ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم ہے (الانفال ۸: ۲۸)"۔ ساتھ ہی

اپنے فضل سے اس کڑی آزمائش پر پورا اترنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ اہلِ ایمان سب چیزوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں (البقرہ ۲ : ۱۶۵)۔ اس سے مستنبط ہوا کہ ایمان کا معیار شدید ترین محبتِ الٰہی ہے؛ یعنی ایسی محبتِ الٰہی کو جو ماسوا سے شدید تر ہو "عشقِ الٰہی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دین و دانش اور ایمان و تقویٰ کا تقاضا ہے کہ ہم جو مدعیانِ ایمان ہیں، اس معیار پر اپنا ایمان جانچیں اور دیکھیں کہ وہ اس پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ بالفاظِ دیگر، ہمیں تحلیلِ نفسی کے ذریعے معلوم کرنا ہوگا کہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت غیر اللہ یعنی اس کے سوا دیگر جملہ ہستیوں اور چیزوں کی محبت سے زیادہ اور اس پر غالب ہے یا نہیں؟ اگر ضمیرِ قلب بتائے کہ محبتِ الٰہی شدید تر ہے تو ہم اہلِ ایمان ہیں؛ ورنہ نہیں۔ تاریخی عمل کے حوالے سے اگر ہم اپنی ذلت و مسکنت، پس ماندگی و ضعیفی، محتاجی و دست نگری، ظلم و جہل، شرک و بت پرستی اور ناخواندگی و سرطان زدگی کے اسباب معلوم کریں تو ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتے۔ ہمیں اس کا دماغ ہی نہیں رہا؛ حتیٰ کہ ہمیں اس کی اہمیت کا شعور تک ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہم خمارِ تغافل میں ہیں اور اس کے باعث ہم خدا آگاہ رہے ہیں نہ خود آگاہ؛ بلکہ خدا فراموش بھی ہیں اور خود فراموش بھی۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآنِ عظیم میں اہلِ ایمان کو بالخصوص اپنے حقیقی معبود و مقصود اور معروضِ حسن و عشق (= اِلٰہ) اور اپنے رازق و پروردگار اور آقا و مالک (= ربّ) کو یاد کرنے اور رکھنے کی خاطر دن میں کم سے کم پانچ بار صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا فرمان بھی مضمر ہے۔

علاوہ بریں، صلوٰۃ، جو اپنے اِلٰہ و ربّ کو یاد کرنے، اس کا کلام سننے، اس کے حضور نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کرنے، اپنی عبودیت و فقر کا اظہار کرنے، نیز اس سے مانگنے اور اس کے سامنے ناصیہ سائی کرنے کی احسن و اکمل صورت ہے، انسان کو اس حقیقت کی یاد دہانی

کراتی ہے کہ وہ ہر حال اور ہر حیثیت میں اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام کا بندہ و محکوم، محتاج و سائل اور اپنے اِلٰہِ جمیل و کریم کا پرستار و ثناخواں اور مطیع و فرماں بردار ہے؛ نیز اس کا اِلٰہ و ربّ رحمٰن و رحیم، وہّاب و کریم، مولیٰ و نصیر، کارساز و مشکل کُشا، عزیز و قدیر، الحیّ و القیوم، سُبحان و صمد، سمیع و بصیر اور مستجیب الدّعوات ہے، لہٰذا اہلِ ایمان صلوٰۃ کو ذکرِ الٰہی اور اپنی فلاح کے لیے قائم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اپنے اِلٰہ و ربّ کی شمعِ محبّت کو فروزاں رکھنے اور اس کی روشنی اور تب و تاب کو تیز سے تیز تر کرنے، اور اس کی بدولت اپنے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نُور کا اِتمام کرنے یا اپنا جمالیاتی اِرتقاء کرنے؛ نیز دُنیوی و اُخروی حسنہ، جمالیاتی ثروت و ولایت اور رحمت و مغفرت حاصل کرنے، جنّت میں جانے اور اللہ تعالیٰ کا قُرب در رضوان اور دید و حضوری حاصل کرنے کی خاطر شب و روز میں کم سے کم پانچ بار صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں جس طرح قائم کرنے کا حق ہے؛ نیز اس کے جملہ تقاضے پورا کرتے ہیں۔ ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ صلوٰۃ کا نظام قائم کیے اور اس کے فرائض اور تقاضے پورا کیے بغیر وہ مؤثر نہیں بنتی اور نہ نمازی اس کے ثمرات سے بہرہ مند ہی ہو سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ فلاح نہیں پا سکتے اور فلاح ہی حُسنِ عبادت کی غایتِ حقیقی ہے۔

صلوٰۃ و عقیدۂ آخرت

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی توحیدِ اُلوہیّت و ربوبیّت کے ساتھ انسان کو عقیدۂ آخرت بھی بالقوۃ ودیعت کیا ہے، جسے قوّت سے فعل میں لانے کا اکمل و احسن طریقہ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ نظری۔ عملی منہاج ہے۔ نظری اِس اعتبار سے کہ اس میں قرآنِ عظیم پڑھا اور سُنا جاتا ہے، جو نمازی میں اس کے وحدہٗ لاشریک اِلٰہ و ربّ کی یاد اور اس کے عقیدۂ آخرت کا اِحیاء کرتا ہے، لہٰذا اُسے "الذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے (الجمعۃ ۶۲: ۹)۔

صلوٰۃ عمل بھی ہے، اس لیے کہ اس میں قیام و رکوع اور قعدہ و سجود بھی کیے جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے ایمان بالآخرت پر اس کثرت سے زور دیا ہے کہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ اسلام کی اساس ہے؛ نیز یہ جلیلہ و محرکہ عقیدہ ہماری زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر ہماری دنیوی و اُخروی حسنہ کا انحصار ہے۔ اس نکتے پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اسلام کا عقیدۂ آخرت کیا ہے؟ چنانچہ اس کو جامع و مانع طور پر سمجھنے کی خاطر ہمیں دیگر ادیان کے نظریۂ حیات پر ایک تقابلی نظر ڈال لینا بیجا نہ ہوگا۔ زندگی سے متعلق اہم نظریات پائے جاتے ہیں؛ جن سے مختصراً گفتگو کی جاتی ہے:

اوّل: نظریہ دہریت:

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی خود رو اور مادّی ہے۔ اس کا کوئی خالق ہے نہ رب۔ یہ خود بخود معرضِ وجود میں آئی ہے اور خود ہی اپنا نشو و ارتقاء کرتی ہے۔ انسان اس حیاتیاتی ارتقاء کا نتیجہ ہے، اور اس کے سمیت جملہ جاندار اشیاء فانی ہیں؛ لہٰذا انسان مر کر دوبارہ زندہ نہیں ہوگا، بلکہ دوسری جاندار و بے جان چیزوں کی طرح ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے گا۔ یہ مکتبِ فکر آخرت کا منکر ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے قانونِ مکافات کا بھی انکار کرتا ہے۔ اسلام اس انکارِ حق کو کفر سے تعبیر کرتا ہے؛ اور اسے انسان کی محرومی و نامرادی اور ہلاکت و بربادی کی علتِ فاعلی قرار دیتا ہے (النساء ۴: ۳۸، ۱۳۶ و بمواضع کثیرہ)۔

دوم، عقیدۂ تناسخ:

اسے آواگون کا عقیدہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے بڑے علمبردار ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ مت ہیں۔ ان ادیان کے نزدیک مادّہ اور آتما (= روح یا نفس) قدیم یا غیر مخلوق ہیں، لہٰذا یہ حادث نہیں۔ آتما پیکرِ خاکی میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ موت پیکرِ مادّی کو فنا تو کر دیتی ہے، لیکن آتما کو فنا نہیں کرتی، بلکہ اُسے جسم سے نجات دیتی ہے۔ آتما مادّی پیکر سے آزاد ہو کر

دوسری دُنیا میں چلی جاتی ہے، اور وہاں اپنے حسین و قبیح اعمال کے مطابق سورگ (= جنّت) اور نرک (= جہنّم) میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد واپس دنیا میں لوٹ آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ بشری پیکر و صورت ہی میں جنم لے، بلکہ وہ اپنے اعمال کے حُسن و قُبح کی نوعیت کے مطابق بشری، حیوانی، نباتاتی کسی بھی صورت و پیکر میں دنیا میں پھر ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ موت و حیات کا یہ چکّر چلتا رہتا ہے، اور اس کا سلسلہ اس وقت تک جاری و ساری رہتا ہے جب تک انسان گناہوں کے اثرات سے پوتّر یا پاک و منزّہ نہ ہو جائے۔ آتما جب گیان، دھیان اور اعمالِ صالحہ کی بدولت پوتّر ہو جاتی ہے تو اسے شانتی مل جاتی ہے، اور اس کے ساتھ وہ موت و حیات کے چکّر سے آزاد ہو جاتی ہے، جسے "مُکتی" یا "نجات" کہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی اصل پرآتما سے مل جاتی ہے اور اس وصال سے وہ اپنی ہستی و انفرادیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی ہے۔ اپانی شدوں کی رُو سے پرآتما طمانیت و مسرّت کا سمندر ہے اور اس میں آتما کا فنا ہو جانا ہی دھرم کا مقصود اور آتما کی غایتِ حقیقی ہے۔ اسے ہنود اور بدھ مت وغیرہ ادیان کے فلسفۂ نجات سے تعبیر کرتے ہیں۔

سوم: نفس کی بقائے دوام کا عقیدہ:

اسلام کے علاوہ یہ عقیدہ یہودیت و مسیحیت اور دیگر ادیان میں بھی پایا جاتا ہے چونکہ اس عقیدے کی مختلف و غلط تاویلیں بھی کی جاتی ہیں، لہٰذا ہم اس کی تشریح قرآنِ مجید کی روشنی میں کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک ہی کتابِ سماوی ہے جو ہر قسم کی تحریف سے محفوظ و مصئون اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس میں تحریف ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہی ہے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمّہ خود ربِّ سبحانہٗ و تعالیٰ نے لیا ہوا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر ۱۵:۹): ہم نے اس ذکر (= قرآن حکیم) کو نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت کرنے والے بھی ہم ہی ہیں۔

قرآنِ عظیم کی رُو سے نفسِ انسانی ایک منفرد و مشخّص شے ہے، جسے ربّ کریم دُنیا میں

بشر کے پیکر دصورت میں پیدا کرتا ہے۔ دُنیا اس کی حسین تخلیق اور حادث ہے۔ اس نے ہر چیز کی طرح دُنیا کا بھی زوج بنایا ہے، جسے قرآنِ حکیم دارالآخرت سے تعبیر کرتا ہے۔ دُنیا جہانِ مرگ و حیات، فانی اور انسان کے لیے دارالامتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی آرزو کے مطابق آزادیِ ارادہ و اختیار ودلیعت کی ہے اور اس کے بدلے اسے اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کا متوجب بنایا ہے۔ بخلاف اس کے دارالآخرت الحیوان ہے؛ یعنی موت نا آشنا حیاتِ سرمدی کا جہانِ جاوداں۔ اس کے دو حصّے ہیں: ایک حسن و سرور، رنگ و نور اور امن و سلامتی کا عالمِ بے مثال و لازوال؛ جسے قرآن مجید جنّت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی وسعتِ بیکراں کا اندازہ اس آیۂ قرآنی سے ہوتا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران ۳: ۱۳۳): اپنے ربّ کی مغفرت اور جنّت کی طرف لپک کر چلو، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین (کی وسعت) ایسی ہے، اور وہ متّقیوں یا اہلِ آرزو کے لیے تیار کی گئی ہے۔

جنّت اہلِ حسن و سرور کے لیے ان کے ربِّ کریم کا مہمان خانہ، حسنُ المآب اور قرۃُ العین ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور حسین و مسرور اور ارتقائی زندگی بسر کریں گے۔ انہیں نہ تو پھر لذّتِ موت سے آشنا ہونا اور نہ لوٹ کر دنیا میں آنا پڑے گا۔ وہ وہاں سدا اپنے معروضِ حسن و عشق کے قرب و حضور میں رہیں گے اور اس کی ہم نظری ہمکلامی اور رضوان کی رحیقِ مختوم کے بے مثال کیف و سرور سے سرشار رہیں گے۔

موت کی یاد

ہر متنفس کو اس حقیقت کا یقین ہے کہ موت شدنی ہے اور اُسے مرنا ہے۔ اسی لیے خالقِ موت وحیات نے اپنے کلام پاک میں موت کو "الیقین" سے تعبیر کیا ہے (الحجر ۱۵ : ۹۹)۔ موت اٹل حقیقت ہو اور انسان کو اس کا کامل یقین بھی ہو اور وہ پھر اپنی زندگی ان چیزوں کی خاطر گنوا دے، جو اس نے دنیا میں چھوڑ جانی ہیں، تو اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ موت کا یقین ہونے کے باوجود اس نے اُسے زینتِ طاقِ نسیاں بنا رکھا ہے۔ اس کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انسان کو اُخروی زندگی اور روزِ حساب کا یقین نہیں۔

جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے موت فراموشی کے دو عوامل ہیں: خدا فراموشی اور خود فراموشی، اور اس دو گونہ فراموشی کی بنیادی عاملہ نفسِ امّارہ اور شیطان یا موضوعی، معروضی شیطان کی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری ہے۔ شیطان اس طریقِ واردات کے ذریعے انسان کو اس کی خواہشات مزیّن کر کے دکھاتا رہتا ہے اور اس کے اس خوشنما دھوکے میں آ کر انسان ان کو اپنا اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بنا لیتا ہے اور ان کو پورا کرنے میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا حقیقی اِلٰہ و ربّ یاد رہتا ہے نہ اپنا نفس اور نہ اس کے ہیولے میں مضمر موت ہی یاد رہتی ہے۔

موت یاد رہے تو انسان کو نہ صرف اللہ تعالیٰ، بلکہ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل، روزِ حساب اور جنّت و جہنم، نیز اپنا نفس اور حیاتِ اُخروی بھی یاد رہتی ہے۔ ان چیزوں کی یاد برنگِ یقین ہو تو انسان کے صالح، شہید اور صدّیق ہونے کے امکانات بہت زیادہ اور مجرم و گناہگار اور ظالم و جاہل اور معاشرتی سرطان بننے کے امکانات اتنے ہی کم

ہوتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موت یاد رہے تو کیسے؟ دوسرے لفظوں میں موت کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ اگرچہ اس کے کئی طریقے ہیں، لیکن اس کا احسن و اکمل طریقہ حُسنِ صلوٰۃ ہے۔ اس میں ایک تو قرآن حکیم پڑھا اور سنا جاتا ہے، جو انسان کو چار حقائق کی یاد دلاتا ہے: اوّل، اس کے اِلٰہ و ربّ کی؛ دوسرے، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل اور روزِ حساب کی؛ تیسرے، موت کی؛ اور چوتھے جنّت وجہنّم کی۔ صلوٰۃِ پنجگانہ مختلف اوقات میں نمازیوں کو ہر روز ان چار حقائق کی یاد دلاتی رہتی ہے، اس کے نتیجے میں موت کی یاد ان کے قلوب میں نقش فی الحجر کی طرح جاگزین ہو جاتی ہے۔ اہلِ آرزو اس چہارگونہ یاد کو حرزِ جان بنا لیتے ہیں۔ وہ نمازی جو دکھاوے یا رسمی طور سے صلوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اس کے فرائض وحقوق اور تقاضوں کا نہ تو علم رکھتے ہیں اور نہ ان کو پورا ہی کرتے ہیں، ان کی صلوٰۃ چونکہ غیر مؤثر ہوتی ہے، اس لیے ان کو نہ صرف موت کی، بلکہ دیگر تین حقائق کی بھی یاد نہیں رہتی۔ اس کے نتیجے میں وہ خدا فراموش، خود فراموش، عاقبت فراموش اور موت فراموش رہتے ہیں۔ اسے حقیقتِ فراموشی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور خود فراموشی خود ظلمی وجہل ہے۔ اس کے سبب انسان قسی القلب، محرومِ طمانیت وسعادت اور اہلِ نار بن جاتا ہے۔

موت کی یاد انسان کو جُرم وگناہ، کبر وغرور، ظلم واستحصال اور فتنہ وفساد سے باز رکھنے میں نہایت اہم اور مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اس کو عاقبت اندیش، اہلِ آرزو، خاشع اور متقی بناتی ہے۔ جہاں تک صلوٰۃ بالحق کا تعلق ہے، وہ اس بارے میں نہایت مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ اہلِ آرزو نمازیوں میں موت کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے، دوسرے اس میں ان کے قلوب میں اثرات کو انمٹ بنانے اور ان میں جا لیاتی۔ نفسیاتی لمحہ پیدا کرنے کی تاثیر بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کے کلمات کا ورد کرتے ہوئے حجّاج میدانِ عرفات میں اپنے

ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حضور جمع ہوتے ہیں تو عرفات محشرِ ارضی بن جاتا ہے۔ یہ حشر انسان میں اس حقیقت کا شعور و ایمان زندہ و مُحکم کرتا ہے کہ اس نے قیامت کے روز میدانِ حشر میں اپنے ربِّ جلیل کے حضور اپنے اعمال کا حساب دینے حاضر ہونا ہے جس کے مالکِ یوم الدین ہونے کا وہ روزانہ اقرار کرتا اور مانتا ہے۔ عرفات کے حشر کی غایت یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے ربِّ رحمٰن و رحیم سے رجا و خوف کے ساتھ رو رو کر اپنے جرم و گناہ، ظلم و جہل اور فساد و شر کی معافی مانگیں، توبہ کریں، نیز دُنیوی و اُخروی حَسَنہ کی عطا اور عذاب النّار سے بچنے کی دُعا مانگیں۔ محشرِ عرفات بندوں کی دعا مستجاب اور ان کی مغفرت کرنے، نیز ان پر رحمت ارزانی کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے اس ارشادِ نبوی ؐ کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں حجِّ مبرور سے انسان اپنے گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے بطنِ مادر سے نکلتے وقت ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے قیامت کے دن میدانِ حشر میں اجابتِ دُعا کا دروازہ بند ہو گا اور افرادِ نسلِ انسانی کے عقائد و اعمال کا محاسبہ اور فیصلہ المیزان یا قانونِ عدل کے مطابق ہو گا۔ نفوسِ مطمئنّہ یا اولیاء اللہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کے مہمان بن کر اس طرح اس کی جنّت میں جائیں گے کہ ان کا نور ان کے دائیں اور آگے آگے دوڑتا ہو گا؛ ملائکہ ان پر درود و سلام بھیجتے ہوں گے اور ان کا استقبال کریں گے؛ نیز خود ربِّ کریم اپنے ان مہمانوں کو فرداً فرداً مخاطب کر کے ان کو اپنی جنّت میں داخل ہونے اور اپنے بندوں کی رفاقت میں رہنے کی دعوت دے گا (الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔

میدانِ عرفات اگر عالمی محشرِ ارضی ہے تو مسجد ایک محدود پیمانے پر محشرِ ارضی ہے۔ اس میں اہلِ ایمان اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور دست بستہ کھڑے ہو کر، سر جھکا کر، سربسجود ہو کر اور دو زانو بیٹھ کر اس کی حمد و ثناء، تسبیح و تقدیس کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اس کی رحمت و مغفرت اور دُنیوی و اُخروی حَسَنہ کی عطا کی، نیز عذاب النّار سے محفوظ رہنے

کی دعا مانگتے ہیں۔ اس طرح صلوٰۃ بالحق نمازیوں میں اللہ تعالیٰ، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل، موت کی یاد اور اپنے انجام کی یاد تازہ کرتی ہے اور اس طرح ان کو فحشآء و منکر سے محفوظ رکھنے اور متقی و صالح اور شہید و صدیق بنانے میں از بس اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یاد دہانی کی خاطر صلوٰۃ بالحق یا حسنِ صلوٰۃ کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ اس سے مراد ایسی صلوٰۃ ہے جو ریاکاری، غیر اللہ کے ذکر اور رنگِ شرک سے منزّہ ہو، بلکہ محض اپنے الٰہ و ربّ کے ذکر کے لیے احسن و اکمل طریقے سے اوقاتِ معیّنہ پر مسجد میں باجماعت علی الدوام قائم کی جائے؛ اور اس کے فرائض، حقوق اور تقاضے باحسن وجوہ پورے کیے جائیں؛ نیز کتاب و سنّت کے مطابق اس کا نظام قائم ہو۔ یہ یاد رہے کہ صلوٰۃ اور دیگر تین نظام (زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر)، جو اس کے اجزائے لاینفک ہیں، ان کا اسلامی حکومت کے زیرِ اہتمام اسوۂ حسنہ کے مطابق چلنا، لازمی ہے۔

قبلے کی اہمیّت

جملہ مسلم اقوام کیوں بیت اللہ یا کعبے کی طرف منہ کر کے صلوٰۃ قائم کرتی ہیں؟ کیا قبلے کی نظامِ صلوٰۃ میں کوئی اہمیت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ یہ سوال ہیں جن کی اب تشریح کی جاتی ہے۔

قبلے کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اسے نظامِ صلوٰۃ ہی میں نہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ اور نظامِ زندگی کے ہر گوشے میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فرمانِ الٰہی کی تعمیل اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مسلمانوں نے بیت اللہ کو اپنا قبلہ بنایا تو ان کو اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ سے الگ اپنا تشخّص اور انفرادیت یعنی منفرد حیثیت حاصل ہو گئی؛ نیز ان میں اجتماعیت و یک جہتی کے ساتھ

اس حقیقت کا بھی شعور بیدار ہو گیا کہ ان کی انفرادی، اجتماعی اور دُنیوی و باطنی زندگی کی منزلِ مقصود صرف ایک ربّ کعبہ ہے اور وہی ان کے فکر و عمل کا مرکز بھی ہے۔

بیت اللہ یا خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کر کے صلوٰۃ قائم کرنے میں یہ حکیمانہ نکتہ مضمر ہے کہ جملہ اہلِ ایمان کا قبلہ ایک ہونا چاہیے اور بیت اللہ علامت ہے ذاتِ الٰہی کی۔ چنانچہ بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے صلوٰۃ قائم کرنے میں یہ اصلِ عظیم پنہاں ہے کہ حسّی، قلبی، نفسی کوئی نظام ہو، اس سے کام لیتے وقت اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجّہ رکھنا اور رجوع کرنا چاہیے۔ اہلِ ایمان کو ہر کام اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اور اسے نظر میں رکھ کر کرنا چاہیے، دوسرے ان کا ہر قول و فعل اس کے احکام کے مطابق اور اس کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ تیسرے، سفرِ زندگی میں ان کی جہت اور منزلِ مقصود صرف ذاتِ الٰہی ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کاروانِ انسانی کی جہت غلط ہو جائے تو اس کا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ شرک عبارت ہے سفرِ زندگی کی جہت غلط و معکوس ہونے سے، لہٰذا مشرک کا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا محال ہوا۔ اس سے اس حقیقتِ کبریٰ کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے شرک کو ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم قرار دیا ہے (النسآء ۴: ۱۱۶؛ لقمٰن ۳۱: ۱۳)۔

یہ انتہائی حوصلہ شکن اور عبرتناک واقعیت ہے کہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کا الٰہ و ربّ ایک، رسولؐ و کتاب ایک اور قبلہ ایک ہونے کے باوجود ان میں وحدتِ فکر و نظر، اخوّت و مساوات، اِتحاد و اتفاق اور خالص توحید کا قریب قریب فقدان ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے اِس المیہ کے چار بنیادی عوامل و محرّکات ہیں: اوّل، اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کے بجائے فرعونی ادارے کی حاکمیتِ اعلیٰ اور ہامانی و قارونی اور آزری اداروں کی عملداری۔ دوم، خالص توحید کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ میں شرک و اصنام پرستی کی آمیزش۔ سوم، صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظاموں کا فقدان، اور چہارم، قرآنِ حکیم سے دُوری و مہجوری۔

کاروانِ زندگی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ ہر دم رواں دواں ہے، اور وہ اپنے قبلے کی سمت گامزن رہنے کی طلب و جستجو رکھتا ہے، لیکن جس قوم کے افراد کی اکثریت کا ایمان بالحق کمزور و مضمحل یا مُردہ ہو جاتا ہے اور اعمال صالحہ نہیں رہتے، تو اس کے کاروانِ زندگی کی جہت نہ تو صالحہ اور نہ قبلہ درست ہی رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قوم اپنی راہ و منزل سے دور ہوتی جاتی ہے اور مکافاتِ عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جسے "تاریخی عمل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخی عمل سے قوم آتشِ خوف و حزن کی اذیتوں میں مبتلا ہو کر زندگی سے فرار کی مختلف راہوں پر چل نکلتی ہے۔ یہ راہیں عموماً منشیات، لہو و لعب، فحشاء و منکر، شرک و بت پرستی، فتنہ و فساد، جرم و ظلم، گناہ و شر اور جنگ و جدال کی ہوتی ہیں، جو حقیقت میں ضلالت و شقاوت، تشتت و افتراق، ہلاک و بربادی، خوف و حزن اور ناکامی و نامرادی کی بھول بھلیاں ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں قوم کے فکر و عمل کا قبلہ ایک نہیں رہتا، بلکہ بہت ہو جاتے ہیں، اور اس میں اتنی ہی تعداد میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں، نیز وہ طبقاتی، قبائلی، علاقائی، لسانی اور الوانی عصبیت کی شکار ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال سے تاریخی عمل کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اس سے اس کی انقلاب انگیز قوت میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ انقلاب شُدنی ہو جاتا ہے۔ اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے باوجود اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ اپنی رحمتِ بے پایاں سے قوم کو اپنا قبلہ درست کرنے کا بار بار موقع دیتا، اور اس مقصد کی خاطر اس میں مُصلحین پیدا کرتا رہتا ہے تاکہ ان کی تنذیر و تبشیر سے ان کی خواہشات بدل جائیں اور ان میں الحسنٰی، دُنیوی و اُخروی حسنہ، مادّی و جالیاتی ارتقاء، حق و صداقت، حُسنِ حیات، حُسنِ انقلاب اور حُسنِ المآب کی آرزو زندہ و حرکی ہو جائے؛ اور اس کے نتیجے میں وہ متحد و متفق ہو کر اپنی فکر و نظر اور عمل کی جہت صالحہ اور قبلہ درست اور ایک کر لیں۔

اگر قوم میں کسی سچے مُصلح کی آوازِ حق اثر کر جائے اور اس میں حُسنِ حیات و انقلاب کی آرزو زندہ و فعّال ہو جائے تو قدرت ۱۲ کی آرزو پوری کر دیتی ہے اور معاشرتی انقلاب

آجاتا ہے۔ بر خلاف اس کے اگر قوم بہری، گونگی اور اندھی ہی رہے اور اس میں حیاتِ طیّبہ و حسنِ انقلاب کی آرزو کا احیار نہ ہو تو اس کا انجام ضلالت و شقاوت، ذلّت و مسکنت، محکومی و غلامی اور ہلاکت و بربادی ہوا کرتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ آرزوئے انقلاب پیش شرط ہے معاشرتی انقلاب کی۔ وجہ یہ ہے کہ قدرت کو اپنے قانونِ احترامِ آرزو کا پاس ہے، جو انسان کی آزادیٔ فکر و عمل کی ضمانت فراہم کرتا ہے، جسے انسان کی خواہش پر قدرت نے خود اسے عطا کی ہے۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ہر زمان و مکان کے عظیم ترین داعیٔ انقلاب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا آفاقی و ہمہ گیر حسنِ انقلاب لانے سے پہلے اپنے ہم وطن اہلِ عرب میں حسنِ انقلاب کی آرزو پیدا کرنے کی عہد آفرین جدوجہد کرکے اہلِ آرزو کی ایک جماعت قائم کی تھی۔ آپؐ کی تحریکِ حسنِ انقلاب کی ایک امتیازی خوبی یہ تھی کہ جب تک آپؐ دنیا میں رہے، اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ لوگوں میں الحسن والحق، دنیوی و اخروی حسنہ، حسنِ حیات، حسنِ انقلاب، جمالیاتی ارتقاء اور حسن مآب کی آرزو کا احیاء کرنے میں مصروفِ عمل رہے اور آپؐ کے بعد بھی صحابہ کرامؓ اس تحریکِ حسنِ انقلاب کو ہمہ گیر و عالمگیر بنانے میں کوشاں رہے۔ تحریک چلتی رہے تو زندہ و فعّال و حرکی رہتی ہے اور اس میں توانائی تولید (GENERATE) کرنے کی صلاحیت رہتی ہے، ورنہ بصورتِ دیگر اس میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

پاکستان میں تحزّب و تفرقہ، فساد و انتشار اور صوبائی و طبقاتی عصبیّت و کشمکش کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی جہت درست و صالحہ نہ رہی اور نہ قبلہ ایک رہا۔ اس کے نتیجے میں کاروانِ قوم منتشر اور گمراہ ہو کر مختلف سمتوں میں چل نکلا اور تحریکِ پاکستان میں جمود و تعطّل پیدا ہو گیا، اور قوم ترقّی کرنے کے بجائے رجعتِ قہقری کرنے لگی۔ پاکستانی قوم کے فکر و عمل کا قبلہ ایک نہ رہنے کے ذمّہ دار سرطانی ادارے اور معاشرتی سرطان ہیں۔ چنانچہ برِّصغیر پاک و ہند میں تحریکِ آزادی کے ساتھ تحریکِ حسنِ انقلاب بھی کامیاب ہو گئی اور پاکستان معرضِ وجود

میں آگیا تو سرطانی اداروں نے، جو دورِ غلامی کی پیداوار تھے اور ورثے میں ملے تھے، ملک کی سیاست، معاشیات، ثقافت، تعلیمات، مذہبیات اور خاص طور سے ملکی وسائلِ پیداوار اور قومی دولت پر قبضہ جما لیا۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنی بقا و سلامتی، سیادت و حکمرانی، ہر قسم کے محنت کشوں (مثلاً مزارعوں، مزدوروں، ہنروروں، ملازموں، اہلِ قلم وفن وغیرہ وغیرہ)، اہلِ احتیاج اور رعایا کے استحصال و جلبِ منفعت؛ نیز سرمایہ و اقتدار اور مناصبِ جلیلہ و مراعاتِ عالیہ حاصل کرنے کے لیے کیا۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے متعدد اقدامات کیے اور معاشرتی سرطان ہونے کے باعث وہ ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے تحریکِ حسنِ انقلاب کو ختم کر دیا جس کا مطلب لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه تھا۔ اس اقدام میں ان کی اور ان کے اداروں کی بقا و ترقی اور ملک و قوم کی پس ماندگی و ضعیفی، دست نگری و محتاجی اور رجعتِ قہقری کا راز مضمر تھا اور ہے۔ دوسرے، انہوں نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے بجائے سیکولر یا غیر قرآنی رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ قائم نہ ہونے دینے کی خاطر آئینِ قرآنی یا احکامِ الٰہیہ نافذ نہیں ہونے دیے۔ تیسرے، انہوں نے فرمانِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، اہلِ ایمان کے شعار کے برعکس صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام قائم نہیں ہونے دیے (دیکھیے الحج ۲۲: ۴۱)۔ اس ظلمِ عظیم کا نتیجہ ہے کہ قوم صلوٰۃ و زکوٰۃ کے دنیوی و اخروی فوائد سے محروم اور ان کے تقاضوں سے نابلد ہے۔ بخلاف اس کے، معاشرتی سرطانوں نے دورِ غلامی میں جو فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری ادارے قائم تھے، ان کا استیصال کرنے کے بجائے ان کی بنیادوں کو عسکری وغیرہ قوانین کے ذریعے اور مضبوط بنا دیا۔ اس پر مزید ظلم یہ کیا کہ تاویل بالباطل، تسمیہ بالباطل اور تشہیر بالباطل کے ذریعے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری کو جائز قرار دے دیا۔ اس کے نتیجے میں رعایا کو اس کے حقوق سے محروم کر دیا۔ علاوہ بریں، انہوں نے قوم کی فکر و عمل کی وحدت ختم کر دی اور ان کا رخ ایک قبلے کے بجائے مختلف قبلوں کی طرف موڑ دیا۔ قبلہ ایک نہ

رہے تو قوم اپنے تشخص و وحدت اور قوت و توانائی سے محروم ہو جاتی ہے۔

اذان

اذان نظامِ صلوٰۃ کو مستلزم ہے۔ یہ اہلِ ایمان کو دعوتِ صلوٰۃ بھی ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کے وقت کی اطلاع بھی ہے۔ اس کے ساتھ ان کو صلوٰۃ کی حقیقت و اہمیت اور غایت سے آگاہ کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، اذان کے انتہائی حسین و بلیغ بول اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی کبریائی اور توحید و رسالت کے اقرار و شہادت کے مظہر بھی ہیں۔ ان پر حکیمانہ انداز میں غور کرنے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صلوٰۃ اگر دین و ایمان کی روح اور اس کا اکمل و احسن اظہار ہے تو اذان فلسفۂ صلوٰۃ کی تفسیر ہے، جو انتہائی مجمل ہونے کے باوجود جامع و مانع ہے۔ اس کا ہر مختصر بول گنجینۂ معانی ہے؛ لیکن بہت کم مسلمان ہیں جو اذان کے فکر انگیز و ایمان افروز کلماتِ طیبہ کے معانی اور اہمیت و مقصدیت پر غور و فکر کرتے اور انہیں سمجھتے ہیں۔

(۱) اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۵ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۵ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۵ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۵

اللہ سب سے بڑا اور انتہائی عظیم و کبریا ہے۔ (چاروں کلماتِ طیبہ کا یہی معنیٰ ہے)۔

(۲) اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۵ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۵

میں (زبان و قلب سے) شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ (ہم معلوم کر چکے ہیں کہ اِلٰہ قرآنِ مجید کی بنیادی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے: (ا) معبود و محبوب، مطلوب و مقصود (ب) حاکمیتِ اعلیٰ کا مالک اور (ج) معروضِ حسن و عشق۔

(۳) اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۵ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۵

میں (زبان وقلب سے) گواہی دیتا ہوں کہ محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اللہ کے رسول ہیں (دوبار)۔

(۴) حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ہ

آؤ صلوٰۃ یا مسجد کی طرف (دوبار) ؛ صلوٰۃ یہاں ظرفِ مکان کے طور پر استعمال ہوا ہے، لہٰذا اس کے معنی ہوں گے، اقامتِ صلوٰۃ کے لیے مسجد میں آؤ (سوال ہوسکتا ہے، کیوں؟) جواب ہے:

(۵) حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ ہ حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ ہ

آؤ فلاح کی طرف (دوبار) ؛ یعنی نشوونما پانے، دُنیوی واُخروی کامیابی حاصل کرنے؛ نیز مادّی ترقّی اور روحانی اِرتقاء کرنے کے لیے مسجد میں آؤ، جو اس کے لیے موزوں ترین جگہ ہے، اس لیے کہ یہ اللہ جَلّ شانُہٗ کا گھر اور توبہ وانابت کرنے اور قبولیتِ دُعا کا محشرِ ارضی ہے۔

(۶) اَللّٰہُ اَکْبَرُ ہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ہ (۷) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ آخری کلمۂ توحید میں لَا کلمۂ نفی ہے؛ جو اللہ تعالیٰ کے سوا جملہ معبودانِ باطلہ کی نفی وابطال پر اور اِلّا جو کلمہ اثبات ہے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی وحاکمیتِ اعلیٰ اور معبودیت پر دلالت کرتا ہے۔

فجر کی اذان میں حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ کے بعد اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ہ کا اِضافہ کریں: اس کے معنی ہیں: صلوٰۃ نیند سے بہتر ہے (اس لیے کہ یہ وسیلۂ فلاح ہے)۔

اقامت کی تکبیر میں حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ کے بعد یہ کلمہ دوبارہ پڑھیں: قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ ہ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ ہ اس کے معنی ہیں صلوٰۃ قائم ہوگئی۔ اس سے مقصود دراصل مسجد کے اندر نمازیوں کو اطلاع دینا ہے۔

اذان وتکبیر کو گوشِ حق نیوش اور خشوع وخضوع کے ساتھ سُننا اور ہر بول پر غور کرنا

چاہیے، ساتھ ساتھ ان کلمات کو دہرانا بھی چاہیے۔ البتہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے جواب میں سننے والا کہے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اور قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ کے جواب میں اَقَامَھَا اللّٰہُ وَ اَدَامَھَا کہنا چاہیے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کے جواب میں صَدَقْتَ وَ بَرَرْتَ کہتے ہیں۔

حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ گرامی کی رُو سے اِس اذان کے بول اِلہامی و مستند ہیں (المشکوٰۃ، کتاب الصَّلٰوۃ، بَابُ الْاَذَانِ)۔

فلسفۂ اذان

جو مؤمن اذان کے کلمات کو سچا مانتا ہے اور یہ حقیقت دل و جان سے تسلیم کرتا ہے کہ فقط اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہی اکبر و متکبّر اور عالی و متعال ہے اور اُسی کو کبریائی و سروری زیب دیتی ہے تو وہ اپنے کو یا غیر اللہ کو "بڑا" نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا وہ معاشرتی سرطانوں وغیرہ کی طرح اپنے آپ کو دوسرے اِنسانوں سے بڑا اور ان کو اپنے سے چھوٹا اور حقیر نہیں سمجھتا۔ بالفاظِ دیگر، وہ تکبّر نہیں کر سکتا اور نہ غیر اللہ کی کبریائی کو تسلیم ہی کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ظُلمِ عظیم یا شرک ہے، جو ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے۔ اگر انسان یہ حقیقت تسلیم کرے کہ کبریائی و حاکمیتِ اعلیٰ کا سزاوار اور اوامر و نواہی نافذ کرنے کا مجاز صرف اللہ تعالیٰ ہے تو وہ خود فرعون و ہامان اور قارون و آذر بن سکتا ہے نہ دوسروں کی فرعونیّت و ہامانیّت اور قارونیّت و آذریّت کو تسلیم ہی کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی و حاکمیتِ اعلیٰ کو دل سے تسلیم کر کے انسان متکبّر و مغرور نہیں بن سکتا۔ تکبّر و غرور سرطانی بیماریاں ہیں، جن سے محفوظ رکھنے کی اذان میں تاثیر پائی جاتی ہے، لہٰذا اذان کو سُننا اور اس پر تفکّر بالحق کرنا اور اس کی معنویت کو صمیمِ قلب سے تسلیم کرنا اہلِ ایمان کے لیے

بالخصوص غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا کلمہ اذان کی شروعات میں چار مرتبہ اور آخر میں دو مرتبہ دُہرایا جاتا ہے۔

اذان کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے، اور یادِ الٰہی وجہِ طمانیتِ قلب ہے۔ یادِ الٰہی یا ذکرِ الٰہی کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ قُرآنِ حکیم کی رُو سے اطمینانِ قلب کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے "ذِکْرُ اللّٰہ" (الرّعد ۱۳ : ۲۸)۔ اس لحاظ سے ذکرِ الٰہی انتہائی عظیم و اعلیٰ شے ہے (العنکبوت ۲۹ : ۴۵)۔ دلیل یہ ہے کہ طمانیتِ قلب بہائے جنّت ہے اور صرف نفسِ مطمئنّہ ہی جنّت میں جائے گا (الفجر ۸۹ : ۲۷)۔ یادِ الٰہی کی سلبی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا اور اس کی یاد سے غافل رہتا ہے، اس کا نُور سلب ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں قلب اندھا ہو جاتا ہے اور قدرت کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ قلب کا اندھا قیامت کے دن چشم و قلب دونوں سے محروم ہوگا، لہٰذا وہ قلب و چشم دونوں کا اندھا ہوگا (طٰہٰ ۲۰ : ۱۲۵)۔

اذان کا دوسرا بول کلمۂ توحید ہے، جو فطرتِ انسانی کی آواز ہے۔ اس کلمے میں فلسفۂ توحید کا دفتر پنہاں ہے۔ اس کلمے کی حقیقت اور اس کے مضمرات اور نتائج و عواقب کو سب سے پہلے عرب میں جنہوں نے سمجھا تھا، وہ قریش تھے، وہ جانتے تھے کہ اس کلمے پر ایمان لانے کا مطلب جملہ سرطانی و استحصالی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کے استیصال اور تکریمِ انسانی، اخوّت و مساوات اور حریّت و عدل و احسان اور انسانی حقوق کو تسلیم کرنا ہے۔ اس صورتِ حال کو قبول کرنا تو کُجا؟ وہ تو اس کے تصوّر سے بھی کانپ اُٹھتے تھے۔ فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری چھوڑنا جان دینے سے بھی دشوار تر ہوتا ہے۔ پاکستان سمیت قریب قریب جملہ مُسلم اقوام پر سرطانی اداروں کی حکومت و سیادت اور رعایا کی ذلّت و مسکنت اور پس ماندگی و ناخواندگی، نیز ان میں الحسن و حسنہ اور حُسنِ انقلاب و حُسنُ المآب کی

آرزو کے فقدان کا حقیقی سبب یہ ہے کہ وہ کلمۂ توحید سے پوری طرح آگاہ ہیں نہ اس کے مطابق زندگی ہی کرتے ہیں؛ بلکہ ان کو یہ کلمہ اپنانے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا دماغ ہے نہ حوصلہ، نیز نہ طلب و جستجو ہے نہ ہمت۔

تیسرا کلمۂ شہادت حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی تصدیق و شہادت باللسان ہے۔ اس کے بین السطور میں ختمِ نبوّت و رسالت کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ غور کریں تو اِثباتِ رسالت پیش شرط ہے اِثباتِ توحید کی۔ اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالتِ آخر کا اثبات دو حقائق پر دلالت کرتا ہے: اولاً، رسالتِ کُلّی یا آپؐ سے پہلے جملہ انبیاءؑ و رُسُل کی نبوّت و رسالت کے اِثبات پر۔ ثانیاً، ختمِ نبوّت و رسالت کے اِثبات پر۔

اذان کا چوتھا بول جو دعوتِ صلوٰۃ با جماعت ہے، مسجد اور اس میں صلوٰۃ باجماعت قائم کرنے کی غیر معمولی اہمیّت پر دلالت کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں مسجد محور کی حیثیت رکھتی ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کی زندگی اس کے گرد گھومنی چاہیے۔ یہ اُمّتِ مُسلمہ میں شعورِ اِجتماعیت زندہ و بیدار کرتی اور ان کے قبلے کو درست رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، کاروانِ قوم و اُمّت کی جہت درست و صالح رکھنے اور ان میں اِتّحاد و ائتلاف قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اذان مسلمانوں کو اس حقیقت کی یاد دلاتی اور انھیں اپنے اِلٰہ و ربّ کے ذکر کے لیے ایک ساتھ اور بر وقت صلوٰۃ قائم کرنے کے لیے بلاتی ہے۔

اس کا پانچواں بول ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتا ہے کہ صلوٰۃ ذریعۂ فلاح اور کلیدِ جنّت ہے؛ "دوست" کے قُرب و حضوری اور احسان کے مقام شاہدیّت پر متمکّن ہونے کا احسن و اکمل وسیلہ ہے۔ آخر میں پھر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی کبریائی و یکتائی اور اس کی اُلوہیّت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

فلسفۂ وضو

وضو پیش شرط ہے صلوٰۃ کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ط (المائدۃ ۵: ۶): اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب صلوٰۃ قائم کرنے لگو تو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں کا مسح کر لیا کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔

تیمّم

انسان بیماری یا سفر کی حالت میں ہو، یا حوائج ضروریہ اور جنسی اختلاط کے بعد پانی میسّر نہ آئے تو اُسے پاک مٹی سے کام لینا چاہیے اور اس پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینا چاہیے (المائدہ ۵: ۶)۔

وضو سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو پاک کرے اور اپنی نعمت ان پر تمام کر دے، شاید وہ شکر گزار بن جائیں (موضوع مذکور)۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو سبحان و صمد اور طاہر و قدوس ہے، طہارت و نظافت کو پسند کرتا اور پاک و صاف اور پاکباز انسانوں سے محبت کرتا ہے (البقرہ ۲: ۲۲۲)؛ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خصوصاً اہلِ ایمان پاک و صاف اور پاکباز رہیں اور حیاتِ طیبہ بسر کریں۔

اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور، جو الحسن، قدوس و سبوح اور سبحان و صمد ہے، اپنی

عبودیت کے اظہار اور اس کی اُلوہیت و ربوبیت کا اعتراف کرنے؛ اس کے سامنے ناصیہ سائی کرنے، الحاح و زاری اور خشوع و خضوع سے توبۃ النصوح کرنے اور دعا مانگنے؛ نیز اس کا کلام طیب و مطہر پڑھنے اور سننے کے لیے نمازیوں کا مطہر ہونا، ناگزیر ہے۔ اس سے وضو کی فرضیت کی توجیہہ ہو جاتی ہے۔ وضو سے جسم کے بعض اعضاء و جوارح ہی پاک و صاف نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا حسی، قلبی، نفسی نظام بھی پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ انسان کی کسلمندی و کاہلی دور ہو جاتی ہے اور وہ عبادت کرنے کے لیے چوق و چوبند ہو جاتا ہے۔ وضو کا پانی تاثیر میں آبِ حیات ہوتا ہے؛ اس سے قلب زندہ و فعال ہو جاتا ہے، جس کی بدولت نمازی حضوریِ قلب کے ساتھ صلوٰۃ قائم کرنے کے قابل بنتا ہے۔

وضو نہ صرف صلوٰۃ کو سچی، مؤثر اور زندگی کو طیب، عقل و فکر کو فعال و حرکی بنائے بلکہ افکار و تصورات میں رفعت و وسعت، جذبات و تمنیات اور جمالیاتی ذوق میں نظافت و لطافت پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وضو بھی صلوٰۃ کا جزو لاینفک ہے، لہٰذا وضو یا تیمم نہ ہو تو صلوٰۃ زندہ و مؤثر نہیں ہوتی۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ وضو غیظ و غضب، آشفتہ سری و پریشانی اور کسلمندی و بیزاری کو دور کرنے کا مؤثر علاج ہے۔

مسجد

مسجد ہمارے الٰہ و ربّ کا گھر ہے؛ اس لیے اس کی بنیاد تقویٰ پر ہونی چاہیے (التوبہ ۹: ۱۰۷ تا ۱۰۸)؛ نیز اس میں ذکرِ کثیر ہونا چاہیے (الحج ۲۲: ۴۰)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسجد کی بنیاد تقویٰ پر استوار کرنے کی بجائے اُسے صلوٰۃ کے نظام اور اس کے مقاصد کو نقصان پہنچانے، اور اس سے انکار کرنے، نیز مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے، اور مذہبی

عصبیت کی بنا پر تعمیر کریں، اس میں صلوٰۃ قائم کرنا ممنوع و حرام ہے۔ چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی مسجد ضرار کو گرا دیا تھا۔

یہ فرمانِ الٰہی اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لیے وعید کا حکم رکھتے ہیں کہ وہ اُمّتِ واحدہ ہیں اور ان کے دین کی بنیاد توحید ہے، لہٰذا فرقہ سازی حرام و شرک ہے۔

یہ ہمارا تاریخی المیہ ہے کہ مسلم ممالک میں سرطانی اداروں کی حکومت و سیادت کی وجہ سے ایک تو نظامِ صلوٰۃ اور اس کے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ملحق نظام قائم نہیں؛ دوسرے اُمّتِ مسلمہ ستر سے زائد فرقوں میں منقسم ہے اور ہر فرقہ دوسرے فرقوں سے بیزار، انہیں ملحد بلکہ کئی فرقوں کو کافر تک سمجھتا ہے اور صرف اپنے فرقہ کو حق پر، ناجی اور سچا مؤمن خیال کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مختلف فرقوں کے پیرو اپنی اپنی علیحدہ مساجد بناتے، انہیں اپنے فرقوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں، اور دوسرے فرقوں کی مساجد میں صلوٰۃ ادا کرنا پسند نہیں کرتے؛ بلکہ آپس میں تعصب و بغض رکھتے اور اکثر دست و گریباں اور برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ایسی مساجد جو تقویٰ کے بجائے مذہبی عصبیت کی بنا پر تعمیر کی جائیں، اور ان میں ایک اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ معبودانِ باطلہ کا بھی ذکر کیا جائے، قرآنِ عظیم اور احادیثِ طیبہ کی رُو سے مساجدِ ضرار ہیں، اور ان کی تعمیر کارِ ثواب کے بجائے موجبِ عذاب ہے، لہٰذا ایمان و توحید کا تقاضا بھی ہے اور اسلامی حکومت و معاشرہ کی مشترکہ ذمّے داری بھی کہ وہ مذہبی عصبیت اور فرقہ وارانہ بنیاد پر کسی مسجد کی تعمیر کی شرعًا یا قانونًا اجازت نہ دے۔ فرقہ واریت و مذہبی عصبیت دراصل منفی تاریخی عمل سے پیدا ہوتی ہے، جس کے ذمّے دار سرطانی ادارے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سرطانی مرض ہے، جو مسلم اقوام میں وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ان میں اتحاد و اتفاق، اخوّت و مساوات اور یگانگت و یک جہتی کے فقدان کی یہی بنیادی وجہ ہے۔ اس سرطانی ملّی مرض کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے :

حُسنِ انقلاب کے ذریعے سرطانی یعنی فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری اداروں کا استیصال۔
مسجد اجتماعی عبادت کے لیے ہوتی ہے، اس لیے اس میں صلوٰۃِ پنجگانہ کے قیام کا احسن انتظام ہونا چاہیے، مثلاً طہارتِ جسمانی کے لیے صاف ستھرے غسل خانوں کا، وضو کے لیے نلوں کا؛ بجلی، ہوا، پنکھوں اور سردی سے بچاؤ کا، نیز پاکیزگی و صفائی کا معقول انتظام کرنا، حکومت و معاشرے کی مشترکہ ذمّے داری ہے۔ اللہ تعالیٰ صفائی و پاکیزگی، نیز صاف ستھرے، پاکیزہ اور پاکباز لوگوں یا اصلاحِ قرآنی میں "مُطّہرین" سے محبت کرتا ہے (البقرۃ ۲:۲۲۲)، لہٰذا مسجد جو ہمارے معروضِ حُسن وعشق اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کا حُسنِ خانہ اور اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، جمال وجلال، نُور و نُو اور طہارت و نظافت کا مظہر ہونا چاہیے۔

اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ﴿الاحزاب ۳۳:۲۱﴾:
حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ (کی سیرتِ طیبہ) میں حسین نمونہ ہے؛ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (اپنے الٰہ و ربّ کی لقاء) اور یومِ آخر (روزِ جزا) کی توقع رکھتا ہے، اور کثرت سے اللہ (اپنے معروضِ حُسن وعشق اور پروردگار و مالک) کو (دل سے) یاد کرتا ہے۔

اس ارشادِ ربانی کی رُو سے مدینۂ منوّرہ میں مسجدِ نبویؐ ہمارے لیے احسن و اکمل نمونہ ہے۔ تاریخ و سیرتِ طیبہ شاہد ہیں کہ مسجدِ نبویؐ عبادت گاہ کے علاوہ اسلامی ثقافت کا مرکز تھی۔ معلّمِ نوعِ انسانی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فوراً ہی اسے اقامتی یونیورسٹی بنا دیا؛ حالانکہ اقتصادی، سیاسی، عسکری ہر لحاظ سے حالات نامساعد تھے۔ اس پہلی اسلامی یونیورسٹی کی ایک امتیازی و اہم ترین خصوصیت کی طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ مسلم اقوام اسے فراموش کرچکی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں نصابِ قرآن کے مطابق تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ طلباء کو سچے تلامیذ القرآن بنایا جاتا تھا؛ ان کے حِسّی، قلبی، نفسی

نظام کو زندہ کر کے حرکی و منیر بنایا جاتا تھا اور اس میں مضمر جواہرِ قابل (POTENTIALS) کو قوت سے فعل میں لایا جاتا تھا۔ ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی جاتی تھی۔ ان کو عالم و حکیم، مفکر و مجتہد، موحد و آزاد اور صاحبِ ذوق و نظر، نیز مجاہد اور خوگرِ محنت و مشقت بنایا جاتا تھا۔ علاوہ بریں، ان کو خدا آگاہ و خود آگاہ اور مخلوقات کے لیے رحمت بنایا جاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے دلوں میں اُن کے اِلٰہ و ربّ کی شمعِ عشق فروزاں کی جاتی تھی؛ اس کے نتیجے میں وہ ان کے قلوب سعید بن جاتے تھے، جن سے اخوت و مساوات، عدل و احسان، محبت و مودّت، آزادی و تکریمِ انسانی اور ایثار و قربانی سے چشمے اُبلنے لگتے اور زندگی کو سرسبز و شاداب کر دیتے۔

اقامتی یونیورسٹی کے علاوہ مسجدِ نبویؐ عدلیہ، انتظامیہ، عسکری صدر مقام، نیز سفارتی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھی۔ اس کی اِمامت پہلے نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم، پھر آپؐ کے خلفائے راشدہ، بعد میں والی کرتے تھے۔ یہ ہے مثالی مسجد، جس کے نمونے میں جملہ مسلم اقوام کی مساجد ہونی چاہئیں۔ ایسی مثالی مسجد ہی میں ہماری صلوٰۃ مثالی بن سکتی ہے، اور نمازیوں کو مثالی تلامیذ القرآن، اہلِ آرزو، مجاہدین، مجتہدین، علماء و حکماء، صالحین، شہداء اور صدّیقین اور نفوسِ مطمئنہ یا اہلِ حسن و سرور بنا سکتی ہے۔

دُعا

دین کا جوہر صلوٰۃ اور صلوٰۃ کا جوہر دُعا ہے، اور فلسفۂ دُعا کا آئینہ سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر صلوٰۃ اور اس کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا فرض ہے، ورنہ صلوٰۃ نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید آئینۂ حسن و حق ہے اور سورۂ فاتحہ آئینۂ قرآنِ عظیم ہے۔

سورۂ فاتحہ نفسِ مطمئنّہ کی آرزو و دعا بھی ہے اور دعا مانگنے کا احسن و اکمل طریقہ بھی، نیز یہ فلسفۂ حیات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دعا اس حقیقت کا اظہار و اعتراف ہے کہ انسان فطرۃً جانتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اس کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (الٰہ یا معروضِ حُسن و عشق) اور نشو و نما دینے والا آقا و مالک (ربّ) ہے جو الحُسن، رحمٰن و رحیم اور مالکِ یوم الدّین ہے۔ لہٰذا حمد و ثنا اسی کے لیے ہے، اور اسی کی عبادت (اس کے قرآنِ حکیم کو پڑھنا، سمجھنا اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنی) چاہیئے۔ پھر صرف اس کی عبادت کرنے کے بعد فقط اس سے اس کی نصرت و فتح، رحمت و مغفرت، نیز دنیوی و اُخروی حَسنہ کی آرزو و التجا کرنی چاہیے۔ اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ دُعا عبارت ہے سچّی آرزو سے۔ سچّی آرزو کا مطلب انگریزی میں ہے : (FIRST DESERVE THEN DESIRE) "پہلے مستحق بنو، پھر آرزو کرو"۔ ظاہر ہے کسی چیز کے حصول یا فتح و کامیابی کا مستحق بننے کے لیے محنت و مشقّت اور سعی و جہد ناگزیر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ربِّ کریم سے استمداد و استعانت کے لیے پہلے اس کے قوانین و اصولوں کی پابندی لابدی ہے۔ مثلاً امتحان میں کامیابی مقصود ہے تو طالبِ علم پر لازم ہے کہ وہ نصاب کے مطابق امتحان کی تیاری کرے، کُتب کا مطالعہ بالحق کرے، احسن و اکمل طریقے سے جواب دینے کے لیے لکھنے کی مشق و مزاولت کرے اور اعزاز حاصل کرنے کی خاطر غیر نصابی کتب کا بھی مطالعہ کرے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح زندگی کا کوئی گوشہ ہو اس میں نمایاں فتح و کامیابی حاصل کرنے یا عظیم انسان بننے کے لیے اُس قدر محنت و مشقّت اور مشق و مزاولت کرنا ضروری ہے جس قدر نوامیسِ قدرت کے مطابق لازم ہیں۔ چنانچہ حقِ سعی و جہد ادا کرنے کے بعد انسان کو اپنے رَبِّ عزیز و قدیر سے دُعا مانگنا اور اس پر توکّل کرنا زیب دیتا ہے۔ الغرض، قدرت کا قانونِ دُعا یہ ہے کہ

پہلے عبادت کرو اور پھر ربِ رحمٰن سے اس کی مدد طلب کرو!

یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ ہماری کُل زندگی (انفرادی ہو اجتماعی) قدرت کے اس قانونِ دُعا کی مستوجب ہے۔ بالفاظِ دیگر،

مطلوبہ محنت ومشقت اور سعی وجُہد کے بعد ربِّ رحمٰن سے اس کی نصرت ومدد کی آرزو و دُعا کرنی چاہیے

فصل دوم

صلوٰۃ کی افادی و جمالیاتی اقدار

صلوٰۃ وسیلۂ اِستمداد و استعانت ہے!

ربّ ذوالجلال والاکرام بلاشبہ جملہ افرادِ انسانی کا مولیٰ و نصیر، حافظ و ناصر، کارساز و حاجت روا، مُنعم و محسن، وہّاب و کریم اور مستجیب الدّعوات ہے اور اس بارے میں حسیب یعنی کافی ہے، اس لیے انسان کو اس کے سوا کسی اور ہستی کی مدد کی حاجت ہے اور نہ اس سے مدد مانگنی ہی چاہیے۔ علاوہ بریں، اللہ جلّ شانہ، کے سوا کسی اور ہستی میں چاہے وہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، کسی کی مدد کرنے یا اسے نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتی (المائدۃ ۵: ۷۶؛ الرّعد ۱۳: ۱۶ و بمواضع کثیرہ)۔ یہ حقیقت انسان فطرۃً جانتا ہے اور روزِ الست اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا اقرار کیا اور شہادت دی تھی (الاعراف ۷: ۱۷۲)، لہٰذا اپنے ربِّ رحمٰن کی عبادت کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا اس کی فطرت کا خاصہ ہے؛ اور اس کی ترجمانی قرآنِ حکیم نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرح کی ہے:

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ (الفاتحہ ۱: ۵) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور فقط تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

ربّ العالمین کو، جو رحمٰن و رحیم اور مالکِ یوم الدّین ہے، چھوڑ کر اس کے کسی بندے یا بندوں سے مدد مانگنا، جو اس کے فقیر و سائل ہیں، ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کی نظر میں یہ شرک ہے، جو ناقابلِ معافی ظلمِ عظیم ہے (النسآء ۴: ۱۱۶؛ لقمٰن ۳۱: ۱۳)۔ یہ اس کی رحمتِ بے پایاں ہے کہ اُس نے ہمیں فہمائش کی ہے کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ (البقرۃ ۲: ۴۳): اور صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور جو لوگ میرے آگے جُھک رہے ہیں، اُن کے ساتھ تم بھی جُھک جاؤ۔

یہ ہوئی عبادت۔ اب تمہارے لیے یہ حُکم ہے کہ:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ (البقرہ ۲: ۴۵): اس سے صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد طلب کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ربِّ کریم سے استمداد و استعانت کا طریقہ صلوٰۃ بالصّبر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صلوٰۃ جو عبادت کی احسن و اکمل صورت ہے، علی الدّوام قائم کی جائے؛ اس کا نظام قائم ہو؛ اور اس کے فرائض و واجبات اور تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کیا جائے؛ نیز اس راہ میں جو مشکلات و شدائد پیش آئیں، انہیں حوصلہ و پامردی سے برداشت کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ صلوٰۃ کے لیے علی الصّبح نیند سے بیدار ہونا اور اُٹھنا، موسم سرما یا سرد علاقوں میں سرد پانی سے وضو کرنا، مسجد میں باجماعت صلوٰۃ ادا کرنا؛ یا دوسری نمازوں میں کاروبار یا دیگر مشاغل و مصروفیات کو معطل کر کے صلوٰۃ قائم کرنا صبر آزما ہوتا ہے، لیکن سب سے کٹھن بلکہ شکیب رُبا مرحلہ صلوٰۃ کے تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرنا ہے۔ صلوٰۃ کے تقاضوں سے بالتفصیل بحث آخری باب میں کی گئی ہے۔ بہرحال، قرآنِ حکیم کی رُو سے حُسنِ صلوٰۃ کو قائم اور اس کے تقاضوں کو پُورا وہ اہلِ ایمان و آرزو کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کا شعور و خوف رکھتے ہیں اور اس باعث وہ سعید و فرماں بردار ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ٥ (البقرہ ۲: ۴۵: ۴۶)۔
صلوٰۃ بے شک کٹھن کام ہے، مگر ان کے لیے نہیں، جو سعید و فرمانبردار ہوتے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ انھیں آخرِ کار اپنے رب سے ملنا (اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے) اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

صلوٰۃ وسیلۂ استمداد و استعانت بھی ہے اور وسیلۂ تقربِ الٰہی بھی ہے، جیسا کہ اِس ارشادِ الٰہی سے ثابت ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ٥ (العلق ۹۶ : ۱۹): اور سجدہ کرو اور (اپنے اِلٰہ و ربّ کا) قُرب حاصل کرو۔ مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ میں "وسیلہ" سے حُسنِ صلوٰۃ ہی مراد ہے:

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (المائدۃ ۵ : ۳۵): اے مسلمانو! اللہ کا تقویٰ کرو (خوف و طمع کے ساتھ اس کی طلب و جستجو کرو) اور اس کے قرب کا وسیلہ چاہو اور اس کی راہ میں سعی و جُہد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

حُسنِ صلوٰۃ خاص کر اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور سجدہ ہی اس کے قرب و حضور اور رضوان کا حقیقی ذریعہ یا وسیلہ ہے؛ لہٰذا وہ لوگ مشرک و ظالم و جاہل ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے بندوں کو قُربِ الٰہی کا وسیلہ مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ ..... كَانَ مَحْذُوْرًا ٥ (بنی اسرائیل ۱۷ : ۵۶ – ۵۷):
(اے نبیؐ!) ان لوگوں سے کہہ دو "تم نے اپنے خیال میں اللہ کے سوا جن ہستیوں کو (اپنا معبود و ربّ) سمجھ رکھا ہے، اُنھیں (اپنی مشکلات و حاجات میں) پکار دیکھو۔ وہ نہ تو اس کی طاقت رکھتے ہیں کہ تمھارا کوئی دُکھ دُور کر دیں اور نہ تمھاری حالت ہی بدل سکتے ہیں۔ یہ لوگ جن ہستیوں کو پکارتے ہیں اور اللہ کے حضور اُنھیں وسیلۂ تقرب سمجھتے ہیں، وہ تو

خود اپنے ربّ کے حضور (حُسنِ عبادت خصوصاً حُسنِ صلوٰۃ و سجدہ کا) وسیلہ ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے؛ نیز وہ اس کی رحمت کی اُمید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تیرے ربّ کا عذاب بڑے ڈرنے کی چیز ہے۔

یہ آیۂ جمیلہ "وسیلہ" کے متنازع مسئلے پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اس باطل عقیدے کا واضح اور بلیغ انداز میں بُطلان کر دیا گیا ہے کہ "تقرّبِ الٰہی کا وسیلہ معبودانِ باطلہ" ہو سکتے ہیں"، کیونکہ وہ تو خود تقرّبِ الٰہی کی طلب و جستجو میں رہتے ہیں؛ دوسروں کو کیسے اللہ تعالیٰ کے قریب کر سکتے ہیں؛ نیز وہ تو کسی شخص کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ علاوہ بریں، اللہ تعالیٰ نے سرطانی اداروں اور سرمایہ داروں کے اس نظریۂ باطل کی بھی تردید کر دی ہے کہ ان کا مال و دولت اور اولاد وغیرہ ان کو مقرّبِ الٰہی بنا دینے کا وسیلہ ہیں۔ اس کے نزدیک ایمان و عملِ صالح ہی تقرّبِ الٰہی کا وسیلہ ہے (سبا ۳۴ : ۳۷) سورۂ زُمر میں اُس نے مشرکوں اور بُت پرستوں (= اکابر پرستوں، قبر پرستوں وغیرہ) کے اس باطل عقیدے کا بھی اِبطال کر دیا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت تقرّبِ الٰہی کا ذریعہ یا وسیلہ ہے (۳۹ : ۳)۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ حُسنِ صلوٰۃ بالصّبر اللہ تعالیٰ کی استمداد و استعانت اور تقرّب کا وسیلہ ہے، لہٰذا ہمیں اس وسیلے کے علاوہ غیر اللہ کو وسیلہ نہیں بنانا چاہیے؛ کیونکہ یہ فعل عبث و لایعنی بھی ہے اور کفر و شرک بھی اور شرک ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی ہے۔

جمالیاتی ذوق

صلوٰۃ کی ایک افادی، جمالیاتی قدر یہ ہے کہ اس سے جمالیاتی حس AESTHETIC SENSE فعّال و حرکی بنتی اور جمالیاتی ذوق AESTHETIC TASTE کا نشو و ارتقاء ہوتا

ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان حُسن اور اس کی صفات سے محبّت کرتا اور جمالیاتی حظ اُٹھاتا اور جمالیاتی ثروت حاصل کرتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے اہلِ ذوق کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

حُسن کی صفات یا جمالیاتی اقدار AESTHETIC VALUES میں اہم ترین یہ ہیں: جمال و جلال، طہارت و نظافت، حیا و معصومیت، عدل و احسان، موزونی و اعتدال، رنگ و بُو، نور و نضارت، زیبائی و خوبصورتی، نفاست و شائستگی، حُسنِ خُلق و حِلم، صدق و صفا، وغیرہ وغیرہ۔

صاحبِ خُلقِ عظیم (القلم ۶۸: ۴)، صاحبِ جمال و جلال اور صاحبِ حُسن و سُرور حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: اَللّٰہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ، یعنی اللہ جمیل یعنی حسین ہے اور جمال یا حُسن سے محبّت رکھتا ہے۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کے ذوقِ حُسن (= جمالیاتی ذوق) کے پیشِ نظر صلوٰۃ نمازیوں کو اہلِ ذوق بنانے کی خاطر انھیں فحشآء و مُنکر، نجاست و غلاظت وغیرہ ہر اُس عمل اور چیز سے روکتی ہے، جو جمالیاتی ذوق پر گراں گزرے اور اہلِ ذوق اس سے نفرت کرتے ہوں۔ بخلاف اس کے، وہ نمازیوں کو غسل و وضو کرنے (یعنی دانتوں، ناک، آنکھ، چہرے، ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کو دھونے اور صاف کرنے) کا حکم دیتی ہے؛ نیز وہ جسم و قلب کے ساتھ لباس، جائے صلوٰۃ وغیرہ کو بھی پاک و صاف رکھنے کی تاکید کرتی ہے۔ علاوہ بریں، وہ نمازیوں کے خُلق کی تہذیب و تحسین اور ان کے جمالیاتی ذوق کا نشو و ارتقاء کرنے کی خاطر ان کا تزکیہ کرتی ہے۔

صلوٰۃ کے حوالے سے تزکیہ ہماری زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے انسان میں بالقوہ مضمر استعدادیں قوّت سے فعل میں آتی ہیں؛ جمالیاتی اِرتقاء ہوتا ہے؛ جمالیاتی حِس حرکی بنتی اور جمالیاتی ذوق کا نشو و اِرتقاء ہوتا ہے؛ نیز انسان میں الحُسن، جو اس کا معروضِ حُسن و عشق ہے، اس کی محبّت کی شمع فروزاں ہوتی ہے؛ اور اس کے نتیجے میں اس میں دُنیوی و اُخروی حَسنہ، موضوعی و معروضی حُسن، حُسنِ انقلاب، حُسنِ حیات اور حُسنِ مآب کی آرزو زندہ و فعّال ہو جاتی ہے۔

جمالیاتی ذوق کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو صاحبِ حُسن و سرور، پاکباز و خوش خُلق، سعید و اہلِ محبّت، فیاض و ایثار شعار، رحیم و صالح اور شہید و صدّیق بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ صلوٰۃ جہاں نمازیوں کو اہلِ ذوق بنانے کا خاصّہ رکھتی ہے، وہاں وہ انھیں اہلِ ذوق بننے کی تاکید بھی کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صاحبِ حُسن و سُرور بننے کے لیے مؤمن و نمازی کا اہلِ ذوق ہونا لازم ہے۔

جنسی پاکیزگی

ہر دین و مذہب نے جنسی پاکیزگی (SEX PURITY) کو فرض قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جنسی پاکیزگی صالح اولاد و افراد اور صالح معاشرے کی پیش شرط ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس واقعیّت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اشتراکی و اشتمالی اقوام جو اللہ تعالیٰ کو مانتی ہیں نہ دین و ایمان کو، بلکہ ان کی دشمن ہیں، جنسی پاکیزگی کی قائل ہیں اور ان کو قانوناً تسلیم کرتی ہیں۔ جنسی پاکیزگی کے سب سے بڑے دشمن اور جنسی ناپاکی و بے رہروی کے سب سے بڑے نقیب و علمبردار تین شیاطینِ انسانی ہوئے ہیں اور وہ ہیں: فرائڈ، سارتر اور برٹرانڈ رسل۔ یہ فلاسفر نکاح یا ادارۂ مناکحت کو انسانی آزادی کے حق کو غصب کرنے کا ادارہ سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مغربی ممالک میں جہاں ادارۂ نکاح قائم ہے، جنسی آزادی نے معاشروں کو نجس و ناپاک اور متعفّن بنا دیا ہے۔ مرد و زن جنسی پاکیزگی اور صنفِ جمیلہ دوشیزگی و حیا اور حجاب و پردہ داری کی اہمیّت کا شعور تک نہیں رکھتے۔ جنسی بدکرداری، عُریانی، جنسی نمائش اور جنسی اختلاط و عمل کا کھُلے بندوں یا وڈیو فلموں وغیرہ کے ذریعے مظاہروں کو حقوقِ انسانی میں سے خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے منفی نتائج و عواقب میں سے چند ایک کی نشاندہی کر دی جاتی ہے:

۱۔ خاندان کی تعمیر اور تخریب زیادہ ہو رہی ہے اور اس سے قوم کی سالمیّت کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

۲۔ خاندان سے قوم کی تشکیل ہوتی ہے؛ خاندان نہ رہے تو قوم کی سالمیّت بھی مفقود ہو جائے گی۔

۳۔ افراد دوشیزگی کی لذّت سے آشنا نہیں رہے اور نہ اس زیاں کاری کا انہیں احساس و شعور ہی ہے۔

۴۔ جنسی آزادی کی وجہ سے میاں بیوی میں باہمی اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور طلاق کا تناسب بڑھ رہا ہے۔

۵۔ وفاداری بشرطِ استواری اگر اسلام میں اصلِ ایمان ہے تو مغربی معاشرے میں بیوفائی معمولاتِ زندگی میں سے ہے اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔

۶۔ حیاتیاتی حرام زادوں، بے نکاحی ماؤں، جنس فروش اصنافِ جمیلہ اور ہم جنسی کے عادی افراد کی تعداد روزافزوں ہو رہی ہے؛ اس کے نتیجے میں خطرناک جنسی بیماریاں وبا کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

۷۔ طلاقوں کی کثرت اور خاندانوں کی تخریب کی وجہ سے نئی نسل منشیات کی عادی جرائم پیشہ اور جنسی بے رہرو ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مغربی اقوام احساسِ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہیں اور وہ بے خوابی، مالیخولیا، جنون اور طرح طرح کی اعصابی امراض کا شکار ہیں۔

۸۔ جنسی قرد یّت نے ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی، چچی، ممانی، ساس، سالی اور دیگر مقدّس رشتوں کے تقدّس کو پامال کر دیا ہے۔

۹۔ مغربی اقوام پاکیزگی کے تصور سے روز بروز کم آگاہ ہوتی جا رہی ہیں۔

۱۰۔ لواطت وغیرہ کے سبب مغربی معاشرہ میں ایڈز ایسی مُہلک بیماریاں پھیل رہی ہیں اور

قومِ لُوطؑ کی طرح ان کی مرگِ مفاجات یقینی ہو گئی ہے۔

مغربی معاشرے کی یہ بھیانک اور ہلاکت انگیز احوال و ظروف دیکھ کر اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں صلوٰۃ دین کا ستون ہے۔ اس لیے کہ وہ جنسی آزادی و نجاست اور اس کے انسانیت سوز و ہلاکت آفرین نتائج و عواقب سے نمازیوں کو محفوظ و مصئون رکھنے کا احسن و اکمل ذریعہ ہے۔ اپنے اس موقف کے ثبوت میں مندرجۂ ذیل آیۂ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط (العنکبوت ۲۹: ۴۵)؛ بلاشبہ صلوٰۃ جنسی بد عملیوں یا فحاشی اور غیر فطری یا بدی کے کاموں سے روکتی ہے۔

فحاشی اور جنسی بے راہروی کی ہلاکت آفرینیوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے ربِ رحمٰن اہلِ ایمان کو بالخصوص ان سے منع کرتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج (الانعام ۶: ۱۵۱)؛ جنسی بے حیائی کے نظّاروں اور باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

ایک طرف ربِ رحمٰن انسان کو مخش باتوں اور نظّاروں سے منع کرتا ہے اور دوسری جانب شیطان اُسے ایسی بے حیائی باتوں کی اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے ترغیب دیتا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرۃ ۲: ۲۶۸)؛ شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور جنس نمائی اور جنس فروشی اور دیگر بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔

قرآنِ مجید کا فیصلہ ہے کہ اہلِ ایمان ہی فلاح پائیں گے اور فلاح کا ایک ذریعہ صلوٰۃ و جنسی پاکیزگی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ .... وَالَّذِیْنَ

ھُمۡ لِفُرُوۡجِھِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۝ (المؤمنون ۲۳: ۱، ۲، ۵ بعد) : یقیناً مؤمن فلاح پائیں گے، جو اپنی صلوٰۃ میں خشوع یعنی عجز و انکساری کرنے والے ہیں..... اور جو اپنے جنسی اعضاء و جوارح (یعنی شرم گاہوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

محوّلۂ بالا آیاتِ جلیلہ سے مستنبط ہوا کہ جنسی پاکیزگی بھی ایمان کے تقاضوں میں ایک تقاضا ہے اور یہ فلاح پانے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ فلسفۂ حیات پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شکمی اِشتہا، جنسی اِشتہا اور جاپاتی اِشتہا، فطری مقتضیاتِ ثلاثہ ہیں، جن کو ہماری زندگی میں بنیادی اہمیّت حاصل ہے اور ان کو پورا کرنے کے لیے زندگی کے ہنگامے پرورش پا رہے ہیں۔ شکمی اِشتہا کی سیری، متنفّس کی بقا و نشو و نما اور قوّت و توانائی کے لیے ناگزیر ہے؛ اور اس کے لیے ربّ العالمین نے دُنیا کو پانی، اناج، ترکاریوں، پھلوں اور گوشت کے لیے طرح طرح کے مرغ و ماہی اور چوپاؤں وغیرہ وغیرہ سے معمور کر دیا ہے۔ اپنی ان نعمتوں کے سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کی خاطر اُس نے ایک طرف زمین میں قوّتِ نامیہ ودیعت کر دی تاکہ وہ مخلوقات کے لیے غذا پیدا کرتی رہے، اور دوسری طرف اس نے ہر نوعِ ہستی میں جنسی اِشتہا ودیعت کر دی تاکہ وہ اپنی افزائشِ نسل کرتی رہے، اور نسل کی صورت میں زندہ و پائندہ رہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی جاپاتی تزویجی تخلیقی فعلیت کا شہکار ہے اور اُسے خلافتِ ارضی عطا ہوئی ہے؛ نیز جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع یا استفادے کے لیے احسن الخالقین نے پیداوار کے جملہ وسائل پیدا کیے ہیں، اور پیداوار کی منصفانہ تقسیم کی ذمّے داری زمین کے خلیفہ یا انسان کو تفویض ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اُس کو ارادہ و اِختیار کی آزادی بھی امانت کے طور پر ودیعت کر دی ہے۔

جہاں تک انسان کی حیاتیاتی مخلوق ہونے کا تعلّق ہے، اس کو بھی شکمی و جنسی اِشتہا ودیعت ہوئی ہے؛ لیکن اس کو خلافتِ ارضی عطا ہوئی تھی، جس کی ذمّے داریوں کا بارِ گراں صبر آزما تھا، اور قدم قدم پر لغزش و خطا کا امکان تھا، لہٰذا ربّ العالمین نے اسے اپنی خلافتی

قومِ لوطؑ کی طرح ان کی مرگِ مفاجات یقینی ہو گئی ہے۔

مغربی معاشرے کی یہ بھیانک اور ہلاکت انگیز احوال و ظروف دیکھ کر اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں صلوٰۃ دین کا ستون ہے۔ اس لیے کہ وہ جنسی آزادی و نجاست اور اس کے انسانیت سوز و ہلاکت آفرین نتائج و عواقب سے نمازیوں کو محفوظ و مصئون رکھنے کا احسن و اکمل ذریعہ ہے۔ اپنے اس موقف کے ثبوت میں مندرجۂ ذیل آیۂ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط (العنکبوت ۲۹: ۴۵): بلاشبہ صلوٰۃ جنسی بدعملیوں یا فحاشی اور غیر فطری یا بدی کے کاموں سے روکتی ہے۔

فحاشی اور جنسی بے رہروی کی ہلاکت آفرینیوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے ربِ رحمٰن اہلِ ایمان کو بالخصوص ان سے منع کرتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ ج (الانعام ۶: ۱۵۱): جنسی بے حیائی کے نظّاروں اور باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

ایک طرف ربِ رحمٰن انسان کو فحش باتوں اور نظّاروں سے منع کرتا ہے اور دوسری جانب شیطان اُسے ایسی بے حیائی باتوں کی اپنی وسوسہ اندازی اور جا لیاتی فریب کاری کے ذریعے ترغیب دیتا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرۃ ۲: ۲۶۸): شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور جنس نمائی اور جنس فروشی اور دیگر بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔

قرآنِ مجید کا فیصلہ ہے کہ اہلِ ایمان ہی فلاح پائیں گے اور فلاح کا ایک ذریعہ صلوٰۃ و جنسی پاکیزگی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ o .... وَالَّذِیْنَ

هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ہ (المؤمنون ۲۳: ۱، ۲، ۵ ببعد) : یقیناً مؤمن فلاح پائیں گے، جو اپنی صلوٰۃ میں خشوع یعنی عجز و انکساری کرنے والے ہیں..... اور جو اپنے جنسی اعضاء و جوارح (= شرم گاہوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ سے مستنبط ہوا کہ جنسی پاکیزگی بھی ایمان کے تقاضوں میں ایک تقاضا ہے اور یہ فلاح پانے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ فلسفۂ حیات پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شکمی اِشتہا، جنسی اِشتہا اور جمالیاتی اِشتہا، فطری مقتضیاتِ ثلاثہ ہیں، جن کو ہماری زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور ان کو پورا کرنے کے لیے زندگی کے ہنگامے پرورش پا رہے ہیں۔ شکمی اِشتہا کی سیری، متنفّس کی بقاو نشوونما اور قوّت و توانائی کے لیے ناگزیر ہے؛ اور اس کے لیے ربّ العالمین نے دُنیا کو پانی، اناج، ترکاریوں، پھلوں اور گوشت کے لیے طرح طرح کے مرغ و ماہی اور چوپاؤں وغیرہ وغیرہ سے معمور کر دیا ہے۔ اپنی ان نعمتوں کے سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کی خاطر اُس نے ایک طرف زمین میں قوّتِ نامیہ ودیعت کر دی تاکہ وہ مخلوقات کے لیے غذا پیدا کرتی رہے، اور دوسری طرف اس نے ہر نوعِ ہستی میں جنسی اِشتہا ودیعت کر دی تاکہ وہ اپنی افزائشِ نسل کرتی رہے، اور نسل کی صورت میں زندہ و پایندہ رہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی تزویجی تخلیقی فعلیت کا شہکار ہے اور اُسے خلافتِ ارضی عطا ہوئی ہے؛ نیز جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع یا استفادے کے لیے احسن الخالقین نے پیداوار کے جملہ وسائل پیدا کیے ہیں، اور پیداوار کی منصفانہ تقسیم کی ذمّے داری زمین کے خلیفہ یا انسان کو تفویض ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اُس کو ارادہ و اختیار کی آزادی بھی امانت کے طور پر ودیعت کر دی ہے۔

جہاں تک انسان کی حیاتیاتی مخلوق ہونے کا تعلق ہے، اس کو بھی شکمی و جنسی اِشتہا ودیعت ہوئی ہے؛ لیکن اس کو خلافتِ ارضی عطا ہوئی تھی، جس کی ذمّے داریوں کا بارِ گراں صبر آزما تھا، اور قدم قدم پر لغزش و خطا کا امکان تھا، لہٰذا ربّ العالمین نے اسے اپنی خلافتی

ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے خاص طور سے جمالیاتی اِشتہا بھی ودیعت کردی۔ جمالیاتی اِشتہا کی سیری دو قسم کے اعمالِ صالحہ سے ہوتی ہے: ایک تقسیم پیداوار اصولِ عدل واحسان کے مطابق کی جائے تاکہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی کی شکمی و جنسی اشتہا کی تسکین ہوجائے اور کوئی شخص بھی اپنے ربِّ کریم کی نعمتوں میں سے اپنے حصّے یا حق سے محروم نہ رہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ ان میں معاشرتی سرطان اور سرطانی ادارے نہ پیدا ہوجائیں، جو قوّت وحاکمیّت اور ابلیسی حربوں سے وسائل دولت پر قبضہ نہ کرلیں اور اس کے نتیجے میں ربّ العالمین کے بندوں کو اُن کے حصّے یا حقِ معلوم سے محروم نہ کردیں، اور وہ شکمی اِشتہا کو مٹانے کی خاطر جنس فروشی یا جنسی بے راہروی پر مجبور نہ ہوجائیں؛ نیز معاشرتی سرطان قوّت و دولت کی فراوانی کے بل پر کمزور و دست نگر مفلوک الحال و محتاج اصنافِ جمیلہ کو عصمت فروشی اور ان کی جنسی اِشتہا کی تسکین کرنے پر مجبور نہ کردیں۔ علاوہ ازیں، فحشاء و منکر کی کھُلی چھٹی دے کر جنسی پاکیزگی و تقدّس کو پامال نہ کردیں۔

جنسی پاکیزگی نہ رہے تو انسان کا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام اپنے حُسن و نور سے محروم ہوجاتا ہے، اس کا نور ہی بجھ جائے اور قلب اندھا ہوجائے تو اس کے نور کے اِتمام یا جمالیاتی اِرتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجے میں بشر جنسی لحاظ سے بندر و سؤر اور اسفلِ سافلین بن جاتا ہے۔ معاشرہ پاک نہ رہے تو صالح بھی نہیں رہتا۔ ایسا معاشرہ اسلامی تو کیا؟ انسانی بھی کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنسی پاکیزگی پر بہت زیادہ زور دیا ہے، حتّٰی کہ اس نے زنا کے قریب تک جانے سے منع کیا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ○ (الاسراء، ۱۷: ۳۲): زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یہ بلاشبہ بڑی ہی بے حیائی کا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ۔

اس آیۂ جمیلہ کے بین السطور میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ جنسی اِشتہا کی ناجائز طریقے سے تشفّی کرنا اصنافِ جمیلہ و جلیلہ کو بے حیا بنا دیتا ہے؛ نیز وہ بے حیا ہوں تو یہ بدکاری کرتے

ہیں جو بدی و ضلالت کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چل نکلنے کا مطلب راہِ مستقیم سے بھٹک کر جرم و گناہ اور ناکامی و نامرادی کی راہ پر چل نکلنا ہے۔ علاوہ ازیں، زنا معاشرتی فساد و امراض کے بنیادی عوامل و محرکات میں سے ہے۔ صنفِ جمیلہ حصارِ حیا سے باہر نکلتی ہے تو شیطان کے دامِ تزویر میں پھنس کر زنا ایسے گھناؤنے اور دور رس نتائج کے حامل جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔ اگر وہ توبۃ النصوح نہ کرے تو اس کی جنسی اشتہا اُسے جنس فروش و زناکار بنا دیتی ہے۔

جنسی پاکیزگی حیا پر دلالت کرتی ہے اور حیا صنفِ جمیلہ کے پاسِ ناموس و عزتِ نفس، غیرت، والدین اور شوہر وغیرہ کی محبت و پاسداری اور ان سے مہجوری و دوری، نیز معاشرے میں بدنامی و رسوائی اور قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خوف یا خشیتِ الٰہی؛ اور سب سے بڑھ کر اپنے اِلٰہ و ربّ کی محبت و رحمت اور مغفرت و کرم نوازی سے محرومی کے ڈر پر دلالت کرتی ہے۔ بخلاف اس کے جنسی ناپاکی یا زناکاری متذکرۂ بالا چیزوں کے خوف کے فقدان اور صنفِ جمیلہ کی سرکشی و بے غیرتی اور بے حمیتی و عدوان کی مظہر ہوتی ہے۔ اس بحث سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ جنسی پاکیزگی ہماری انفرادی و اجتماعی، نیز ظاہری و باطنی زندگی میں ازبس اہمیت رکھتی ہے اور اصنافِ جمیلہ و جلیلہ کو جنسی لحاظ سے پاکیزہ رکھنے اور جنسی آلودگیوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے صلوٰۃِ پنجگانہ فرض کی ہے۔ جیسا کہ کئی بار پہلے بھی اس نکتے پر زور دیا گیا ہے، صلوٰۃ اس وقت اپنا اثر رکھتی ہے جب نمازی اس کے حقوق اور تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ اس کے چار بڑے اور اہم ترین تقاضے یہ ہیں کہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام اسلامی حکومت کے زیرِ اہتمام قائم ہوں اور احسن طریق سے اپنے وظائف سرانجام دیتے ہوں۔

حیا و حجاب

اپنے جمال و جلال، جمالیاتی حِس، جنس (SEX)، جنسی اعضاء و جوارح، عزّتِ نفس، عفت و عصمت اور پاکیزگیِ جسم و قلب، نیز خاندانی عزّت و ناموس کے تحفّظ اور محبّت و رضوانِ الٰہی کی آرزو عبارت ہے حیا سے۔ حیا مکارمِ اخلاق میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، اور اسلامی ثقافت کی امتیازی خوبی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل حدیثِ طیبہ سے ثابت ہے:
حضرت زید بن طلحہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَّ خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ: یعنی ہر دین کی ایک امتیازی صفت ہوتی ہے اور اسلام کی امتیازی صفت "حیا" ہے (المشکوٰۃ، باب الحیاء)۔ چنانچہ حاملِ خُلقِ عظیم کا ارشاد ہے کہ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ: حیا ایمان میں سے ہے؛ یعنی اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "باحیا باایمان اور بے حیا بے ایمان" ہوتا ہے۔

صلوٰۃ ایمان کو افزوں کرتی اور مُحکم بناتی ہے اور اس سے مستنبط ہوا کہ صلوٰۃ ایمان کے ساتھ حیا کو بھی مُحکم و مضبوط بناتی اور انسان کو اس کے حصنِ حصین سے باہر نکلنے سے باز رکھتی ہے۔ محبّت کی شدّت سے خشیّت پیدا ہوتی ہے۔ صلوٰۃ محبّتِ الٰہی کی مظہر ہوتی ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے جو اس کا حقیقی معروضِ حُسن و عشق ہے، دیگر سب ہستیوں اور چیزوں سے بہت زیادہ محبّت یا عشق کرے (البقرۃ ۲:۱۶۵)۔
انسان جب اللہ تعالیٰ کو اپنا معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہ) بنا لیتا ہے تو وہ پھر عشقِ الٰہی کی وجہ سے کسی غیر اللہ کو نہ اپنا اِلٰہ بناتا ہے اور نہ فحشآء و منکر کا ارتکاب ہی کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُسے ایسا کرنے سے اپنے اِلٰہ و ربّ سے حیا آتی ہے، جس کے حضور وہ فجر سے عشاء تک کم سے کم پانچ وقت اپنی عبودیّت و محبّت کے اظہار و اعتراف کی خاطر

حاضری دیتا، اور قیام ورکوع اور سجدہ کرتا ہے۔

فحشاء و منکر اور جنسیت کے حوالے سے صلوٰۃ و حیا میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں انسان کو ان اخلاقی و ثقافتی اور معاشرتی برائیوں سے باز رکھنے میں ازبس اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ صلوٰۃ بالحق اپنے سچے نمازیوں کو معاشرے میں معزز و مکرم اور باحیا بناتی ہے اور عزت و مکرمت اور حیا انسان کو فحاشی، جرم و گناہ اور بُخل و بے حیائی سے باز رکھتی ہیں۔ انسان خاص کر صنفِ جمیلہ جب تک حیا کے حصنِ حصین میں رہتی ہے، شیطان کی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے محفوظ و مصئون رہتی ہے۔ جونہی وہ اپنے حصارِ حیا سے باہر نکلتی ہے، شیطان کے دامِ ہمہ رنگِ زمین میں اس کے پھنس جانے کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ اس فلسفۂ حیا کو پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایجاز و بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے: "گزشتہ نبوّت کے کلام میں جو بات لوگوں نے پائی ہے (یعنی ایسی بات جس میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوا ہے اور اس کا حکم باقی ہے) وہ یہ ہے کہ جب تو نے شرم و حیا کو اٹھا کر رکھ دیا تو اب جو تیرا دل چاہے کر" (بخاری و مسلم، در المشکوٰۃ کتاب الآداب، ح ۴۸۴۹)۔

یہ حیا ہے جو حدود اللہ سے تجاوز کرنے اور اپنی دُنیا سے نکلنے میں مانع آتی ہے۔ بخلاف اس کے، یہ معروضی نفسی شیطان ہے جو صنفِ جلیلہ ہو یا صنفِ جمیلہ اس کی خواہش کو اپنی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری سے حسین و دلکش بنا کر دکھاتا اور اُسے اس کا اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق بنا کر انسان کو حدود اللہ اور اپنی دُنیا سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ انسان کا حدود اللہ سے تجاوز کرنے کا مطلب اس کی پناہ سے نکلنا اور مردود و گمراہ ہونا ہے۔ اسی طرح اس کے اپنی دُنیا سے باہر نکلنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے ناقابلِ تسخیر قلعے سے باہر نکل کر اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دے۔

اللہ تعالیٰ حیا کا نگہبان اور باحیا شخص کا محافظ ہوتا ہے، نیز اس کی ودیعت کردہ قوتیں

(مثلاً حسن، تحفظِ ذات وعزتِ نفس کی جبلت یا داعیہ، ضمیر، عقل وشعور، فکر ووجدان اور نفسِ لوّامہ، نیز علم وحکمت اور سب سے بڑھ کر عشقِ الٰہی اور اس کی ضمنی پیداوار خشیتِ الٰہی یا تقویٰ) بھی اس کی حفاظت ونگہبانی کرتی ہیں۔ چنانچہ جو شخص حیا کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی بناء اور اس کے عطا کردہ متذکرہ بالا محافظوں کی نگرانی سے باہر نکل آتا ہے تو پھر شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس قدر بے باک وعاقبت نااندیش، بے شرم و بے حیا، ظالم وجاہل اور غافل وگمراہ بلکہ اسفلِ سافلین بن جاتا ہے کہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ جسم وجاں، عزت وناموس، عصمت ودوشیزگی، ایمان وآگہی، حسنِ زندگی وحسنِ مآب سب کا سودا کرنے میں وہ کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

بے حیائی انسان کو بخیل وحریص، گدا وکاذب اور منافق وبیباک بنا دیتی ہے۔ یہ رہزنِ تمکین وہوش اور غارتگرِ ایمان وتقویٰ ہے۔ غور کریں تو سرطانی برائیاں بھی بے حیائی سے پیدا ہوتی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی سرطان بالعموم بے حیا ہوتے ہیں۔ بے حیائی سے انفرادی واجتماعی زندگی ناپاک ہو جاتی ہے، لہٰذا اسے دُور کرنے اور جنسی پاکیزگی، حیاتِ طیبہ، طمانیتِ قلب اور صالحیتِ معاشرہ کی ضمانت فراہم کرنے کی خاطر ربِ رحمٰن نے اہلِ ایمان کو صلوٰۃ قرۃ العین ایسی نعمتِ عظمیٰ عطا کی ہے۔ اس نعمتِ عظمیٰ کی کماحقہٗ قدر کرنے سے اہلِ ایمان اپنے معاشرے کو سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں سے پاک وصاف کرکے اس میں اسلامی صلوٰۃ وزکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے چار اہم ادارے قائم کر سکتے ہیں؛ جو معاشرے کو خوف وحزن، بھوک، پیاس، بے گھری، مفلسی، احتیاج، ناخواندگی، ظلم واستحصال، شرک واصنام پرستی اور دیگر سرطانی بیماریوں سے پاک ومنزہ کرکے امن وسلامتی، جنسی پاکیزگی وحیاتِ طیبہ، اخوت ومساوات اور حریت ومحبت اور خوشحالی وترقی اور حیاتیاتی ارتقاء کی جنت بنا سکتے ہیں۔

اللہ جلّ شانہٗ کا یہ ارشاد بلاشبہ سچا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ

وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹ : ۴۵، یقیناً صلوٰۃ جنسی آلودگیوں یا فحاشی اور اعمالِ قبیحہ سے باز رکھتی ہے)، لیکن صلوٰۃ کو مؤثر، زندہ اور قوی بنانے کے لیے اہلِ ایمان کے لیے اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ناگزیر ہے۔

حیا کا خاصّہ حجاب ہے، اور یہ دل کا پردہ بھی ہے جسے قرآن مجید نے لباسِ تقویٰ سے تعبیر کیا ہے (الاعراف ۷ : ۲۶)۔ جس طرح صنفِ جمیلہ کو اپنے جنسی جمال و اعضاء اور آراستگی و تزئین کو صنفِ جلیلہ کی نظروں سے چھپانے کے لیے لباس کی حاجت ہوتی ہے، اُسی طرح اُسے اپنے قلب کو شیطانی نظروں سے چھپانے اور محفوظ رکھنے کے لیے لباسِ تقویٰ یا حجابِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر میں اپنی کتاب "اسلامی ثقافت" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

"دل، آنکھ اور حیا کے تعلّق کی نوعیّت میرے نزدیک یہ ہے کہ اَلْقَلْبُ مَدِيْنَةُ الْحَيَاءِ وَالْعَيْنُ بَابُهَا: یعنی دل حیا کا شہر اور آنکھ اس کا دروازہ ہے۔ جب تک یہ دروازہ بند رہتا ہے، شہرِ حیا محفوظ و مصئون رہتا ہے؛ لیکن جب دروازہ کھل جاتا ہے تو یہ شہر بھی غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال شرم و حیا کے رہزنوں کے لیے صلائے عام ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، شرم و حیا کا دروازہ ایک بار کھل جائے تو اسے بند کرنا از بس دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو بالخصوص باب الحیاء یا آنکھ کے دروازے کی حفاظت کی سخت تاکید کرتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ (النور ۲۴ : ۳۰): مؤمن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں (یعنی اعضاء و جوارح) کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی (اور تزکیہ) کی بات ہے۔ جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس سے خبردار ہے۔

حفاظتِ قلب و نظر مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ..... (النور ۲۴:۳۱) : اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں، اور اپنی شرمگاہوں (یعنی جنسی اعضاء و جوارح) کی حفاظت کیا کریں؛ [اور اپنا بناؤ سنگھار یا فیشن نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں، اور اپنا بناؤ سنگھار یا فیشن ظاہر نہ کریں]۔

محولۂ بالا آیات میں ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ حیا، نظر، جنس اور پاکیزگیِ دل کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ حیا اور پاکیزگیِ دل کا تقاضا ہے کہ متضاد جنسوں (یعنی صنفِ جمیلہ اور صنفِ جلیلہ) کی نظریں لڑنے نہ پائیں، کیونکہ اس سے فواحش کا دروازہ کھل جانے کا امکان رہتا ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ نظروں کے تصادم سے "نفسیاتی لمحے" کے پیدا ہو جانے کا زبردست امکان ہوتا ہے؛ اور یہ نفسیاتی لمحہ انسان کے قلب و نظر کی کایا پلٹ دیتا ہے اور اسے گناہ اپنی تمام قباحتوں کے باوجود حسین نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان ابلیس کے جمالیاتی فریب کا شکار ہو کر گناہگار و زیاں کار ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جنسی پاکیزگی کے لیے نظروں کی حفاظت ایک ناگزیر پیش شرط ہے (اسلامی ثقافت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ص ۳۳۱-۳۳۲)۔

حقیقت یہ ہے کہ جنسی پاکیزگی کے چار محافظ ہیں: حیا، حجاب، لباسِ تقویٰ اور سب سے بڑا محافظ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ نمازیوں میں تقویٰ پیدا کرتی ہے اور تقویٰ انسان کو فحشاء و منکر سے بچانے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

اِمتناعِ فحشآء و مُنکر

فحشآء و منکر ایسی سرطانی بیماریاں ہیں، جو پاکستان سمیت دُنیا کے قریب قریب ہر مُلک میں وبا کی صورت اختیار کر چکی ہیں اور لا علاج سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقوام عالم کو اس کا صحیح علاج معلوم نہیں۔ مُسلم اقوام کو اس کا علاج معلوم ہے لیکن انھیں اس کے کرنے کا دماغ ہے نہ فکر۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے ظلم و جہل کے باعث

جانتی ہیں پر مانتی نہیں

مغربی اقوام بالخصوص ان سرطانی بیماریوں میں بری طرح مبتلا ہیں، لیکن نہ ان کی تشخیص اور نہ ان کا علاج ہی دریافت کر سکی ہیں۔ قرآنِ حکیم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے ان بیماریوں کا اکسیر مؤثر و مجرّب علاج بتایا ہے اور وہ ہے اقامتِ صلوٰۃ۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹: ۴۵)؛ یعنی اے نبیؐ! تلاوت کرتے رہو اس کتاب (= قرآن) کی جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے، اور صلوٰۃ کو قائم رکھو؛ یقیناً صلوٰۃ فحش اور ہر قسم کے برُے کاموں سے روکتی ہے؛ اور اللہ کا ذکر اس سے بہت بڑی چیز ہے؛ نیز اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اس اہم موضوع سے بحث کرنے سے پہلے فحشآء و مُنکر کی اصطلاحات کی تشریح کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

(ا) **اَلْفَحْشَآء**: مادہ ف ح ش۔ اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَآءُ وَالْفَاحِشَةُ؛ اس قول

یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ قرآنِ مجید میں ہے:

قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف ۷: ۲۸): ان سے کہہ دو کہ اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

(ب) اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۹۰): اللہ عدل و انصاف، حُسنِ سلوک اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی و بخل، شر و سیئہ، ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔

فاحش متشدّد سے بُخل میں حد سے بڑھا ہوا شخص مراد ہے۔ بہت زیادہ فُحش کام کرنے والے کو "مُتفحِش" کہا جاتا ہے (المفردات، بذیلِ مادّہ)

اَلْفُحْشُ؛ حد سے بڑھ جانا، زیادتی کر بیٹھنا؛ کسی بات کا حد سے زیادہ تجاوز کر جانا۔ اَلفاحِشُ؛ حد سے تجاوز کر جانے والا (تاج العروس)۔ قرآنِ مجید میں فَحشآء عدل کے مقابلے میں آیا ہے (النحل ۱۶: ۹۰)، اور قسط کے مقابلے میں بھی (الاعراف ۷: ۲۸-۲۹)۔ سورۂ احزاب میں یہ لفظ قَنَت کے مقابلے میں آیا ہے (الاحزاب ۳۳: ۳۰-۳۱)۔ قَنَت کے معنی قوانینِ الٰہی کی اطاعت ہیں (مادّہ ق ن ت)؛ اس لیے فُحش کے معنی حدودِ الٰہی سے تجاوز اور سرکشی ہیں؛ یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی فحش میں داخل ہے یا کوئی ذلیل و شرمناک حرکت (آلِ عمران ۳: ۱۳۵)۔ ابنِ فارس کے نزدیک اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں برائی یا شناعت کے ہیں۔

فَحشآء کے معنی بُخل ہیں۔ بخیل کو "فاحِش" کہتے ہیں (تاج العروس)۔ اَفْحَشَ کے معنی اس نے بُخل کیا (محیط)۔ ان معنوں میں لفظ قرآنِ عظیم میں فضل کے مقابلے آیا ہے (البقرۃ ۲: ۲۶۸)۔ فضل کے معنی ہیں رزق کی کشائش و وسعت؛ لٰہذا فُحش کے معنی ہوں گے رزق کی تنگی و کمی، یا اس کے خرچ میں ہاتھ روک لینا؛ اسی کو بُخل کہتے ہیں۔ سورۂ بقرۃ کی

آیہ ۲۶۸ میں فَحْشَآءُ کے معنی ہیں، ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا، زنا یا جنس فروشی کو فَاحِشَۃٌ میں شمار کیا گیا ہے (الاسراء ۱۷: ۳۲)؛ اور لواطت کو بھی (الاعراف ۷: ۸۱)۔

(ب) اَلْمُنْکَرُ (مادّہ ن ک ر) ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقولِ سلیمہ قبیح خیال کریں یا عقل کو اس کے حُسن و قُبح میں توقف ہو، مگر شریعت نے اس کے قبیح ہونے کا حکم دیا ہو (المفردات)۔ اس کی ضد و نقیض معروف ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبۃ ۹: ۷۱)؛ مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و کارساز ہیں، معروف (= خیر و حسنہ، عدل و احسان وغیرہ) کا حکم دیتے ہیں اور منکر (= سیئہ و شر، ظلم و نا انصافی) سے روکتے ہیں، صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

ربِ کریم نے انسان کو معروف و منکر میں امتیاز کرنے کے لیے ایک تو اُسے باطنی ہدایت ودیعت کی ہے، جو عبارت ہے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام سے۔ اس باطنی ہدایت کے نظام میں جمالیاتی حس، حسنِ فطرت، ضمیر، عقلِ سلیم، نفسِ لوّامہ خاص طور سے زندہ و صحیح کار صیرفیِ معروف و منکر ہیں۔ اس نظام کے لیے ہم جمالیاتی۔ باطنی کمپیوٹر کی سائنسی اصطلاح بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ خارجی ہدایت سے مراد وحی و تنزیل یا قرآنِ حکیم اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ باطنی و خارجی یا موضوعی و معروضی نظامِ ہدایت بلاشبہ زندہ و درست کار اور معتبر ہیں، لیکن یہ اور بات ہے کہ انسان اپنے ظلم و جہل کے سبب ان کی آواز نہ سُنے، یا اس کے فیصلے

پر کان نہ دھرے، نہ دیکھے؛ اور اگر سُنے، پڑھے یا دیکھے تو فیصلے کو قبول نہ کرے۔ یہ اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح آزری۔ سرطانی شیطان خارجی نظامِ ہدایت قرآنِ حکیم اور سُنّتِ حسنہ کی تاویل یا باطل سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، اسی طرح نفسی۔ ابلیسی شیطان اپنی وسوسہ اندازی اور جاپاتی فریب کاری کے ذریعے لوگوں کی خواہشوں کو ان کا الٰہ بنا دیتا ہے؛ اس کے نتیجے میں وہ اپنے اس باطل اِلٰہ کا حکم تو مانتے ہیں، لیکن اپنے جاپاتی۔ باطنی کمپیوٹر کا فیصلہ سنتے ہیں نہ مانتے ہیں۔

اس ارشادِ ربّانی کی صحت سے تو مسلمانوں کو انکار نہیں کہ صلوٰۃ فحشآء و منکر سے منع کرتی ہے، لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ نمازی ہونے کے باوجود اکثر مسلمان کیوں فحش اور برے کام کرتے ہیں اور باز نہیں آتے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں ایک بھی اسلامی معاشرہ نہیں، یعنی کسی مسلم معاشرے میں صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم نہیں، لہٰذا مسلمان نہ تو صلوٰۃ کے تقاضے پورے کرتے ہیں اور نہ ان کی صلوٰۃ مؤثر ہی ہوتی ہے۔ دوسرے، مسلم ممالک میں سرطانی اداروں کی سیادت و حکومت ہے۔ تیسرے، یہ سچّی صلوٰۃ ہے جو نمازیوں کو فحشآء و منکرات سے روکنے میں کامیاب ہوتی ہے، چوتھے، سچّی صلوٰۃ کے لیے مثالی نظامِ صلوٰۃ کا ہونا ضروری ہے، جس کی وضاحت کردی جاتی ہے۔

مثالی نظامِ صلوٰۃ کی متعدد خصوصیات میں سے جو دراصل اس کی مقتضیات ہیں، چند ایک یہ ہیں: اوّل، مسجد کی تاسیس تقویٰ پر ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مساجد تعمیر کرانے والے مسلمان سچّے مؤمن و متقی ہوں۔ تقویٰ شدّتِ محبت و خشیتِ الٰہی پر دلالت کرتا ہے۔ خشیت شدّتِ محبت سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے قانونِ احترامِ آرزو کا خوف ہے؛ نیز تقویٰ میں راہِ زندگی میں دو رویہ کفر و عدوان، شرک و بت پرستی، جرم و گناہ اور ظلم و معصیت کی

پُرخار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچا کر نکلنے اور اپنے اِلٰہ و ربّ کے قرب و حضور، دید و رضوان کی طلب و جستجو کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، تقویٰ میں طلبِ حق کے حوالے سے قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم و تربیت کے مطابق آیاتِ الٰہیہ کے سُننے، دیکھنے اور سمجھنے، نیز اپنا تزکیہ کرنے (یعنی اپنے حسّی، قلبی، نفسی نظام کی تطہیر کر کے اس کو زندہ و حرکی کرنے، اس میں بالقوہ موجود جواہرِ قابل (POTENTIAL) کو قوّت سے فعل میں لانے، اپنی چشمِ قلب کو بینا اور اپنے نورِ باطنی کے اِتمام یا جالیاتی اِرتقاء کرنے) علم و قرآن، حکمت اور علوم جدیدہ حاصل کرنے کی طلب و جستجو کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ دوسرے، متقی سوچ سمجھ کر صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور وہ جو کچھ اس میں پڑھتے ہیں، اس کے معانی و مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں۔ تیسرے، صلوٰۃ کو "چٹی" یا بیگار سمجھ کر تساہل و بیدلی سے ادا نہیں کرتے، بلکہ اس سے قرۃ العین یا جالیاتی ثروت حاصل کرنے اور اپنے نور کا اِتمام یا جالیاتی اِرتقاء کرنے کی خاطر اُسے قائم کرتے ہیں۔ چوتھے، صلوٰۃ کو کلیدِ جنّت اور معراجِ انسانی سمجھ کر اور مقامِ احسان پر متمکن ہونے کی خاطر قائم کرتے ہیں۔ پانچویں، صلوٰۃ کے آداب و حقوق اور تقاضوں کا شعور رکھتے اور انہیں پورا کرتے ہیں۔ چھٹے، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تواصی بالحق، تواصی بالصبر اور تواصی بالرحمۃ نمازیوں کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ ساتویں، نہ صرف اقامتِ صلوٰۃ کے دوران، بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں ان کی فکر و نظر اور عمل کا قبلہ صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ آٹھویں، صرف مسجد میں اقامتِ صلوٰۃ کے وقت ہی نہیں، بلکہ اس کے باہر بھی زندگی کے ہر شعبے اور گوشے میں نظم و ضبط، سمع و اطاعت، حق گوئی و حلم، اخوّت و مساوات اور تکریمِ انسانی و حُسنِ خُلق کا مظاہرہ کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ نویں، مثالی نظامِ صلوٰۃ میں نمازی موحّد و صالح اور شہید و صدّیق ہوتے ہیں؛ معاشرے میں صرف احکامِ الٰہیہ نافذ ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت کسی فرد یا ادارے کو فرعونی، ہامانی، قارونی یا آزری کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ دسویں، ایسے نظامِ صلوٰۃ میں ایک تو نمازی

صلوٰۃ کی تاثیرِ تزکیہ کے سبب مادّی ترقّی اور جا لیاتی اِرتقاء کرتے ہیں؛ دوسرے، عدل سب کو مفت اور بلا تاخیر ملتا ہے؛ تیسرے، احکامِ اِلٰہیہ پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا ہے؛ چوتھے، اس میں کفالتِ اجتماعیہ کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نمازی فحشآء و منکر کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایسے احوال و ظروف میں صلوٰۃ نمازیوں کو فواحش و بے حیائی، ظلم و شر، جرم و گناہ اور بخل و اکتناز سے روکنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ بلا شبہ صلوٰۃ میں فحشآء و منکر سے روکنے اور بچانے کی تاثیر پائی جاتی ہے، لیکن نمازیوں کو ان کاموں سے پرہیز بھی لازم ہے جو اس کی تاثیر زائل کرنے والے ہیں۔ مثال کے طور سے ہر موزوں دوا اپنی تاثیر و شفا رکھتی ہے، بشرطیکہ مریض وہ دوا استعمال کرنے کے ساتھ ان چیزوں سے پرہیز بھی کرے، جو اس کی تاثیر زائل کرنے والی ہوں۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ پاکستان سمیت کسی بھی مُسلم ملک یا معاشرے میں وہ نظامِ صلوٰۃ قائم نہیں جو عہدِ نبوی ؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں تھا۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں مسلمان صلوٰۃ قائم کرنے کے باوجود فحشآء و مُنکر یعنی بے حیائی و بخل، جنسی بے راہروی و بدکاری، استحصال و تذلیلِ انسانی، بددیانتی و لوٹ مار بازی، فتنہ و فساد، جرم و گناہ، ظلم و ناانصافی اور شرک و اصنام پرستی سے، نیز اربابِ حکومت و اقتدار، سرمایہ دار و جاگیردار اور علمائے سوء اور مشائخِ باطل فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری سے باز نہیں آتے۔

صلوٰۃ میں یقیناً اہلِ ایمان کے دلوں میں حسنِ انقلاب لانے، ان میں محبتِ الٰہی کی شمع فروزاں کرنے ان کے باطنی نور کا اِتمام یا جمالیاتی اِرتقاء کرنے؛ نیز انہیں بے حیائی و جنسی بدکاری، اقتصادی بدکرداری اور ظلم و جرم اور گناہ و عصیاں سے روکنے کی تاثیر پائی جاتی ہے، لیکن یہ معاشرتی سرطانیت ہے، جو اس کی تاثیر زائل کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں نمازی بھی صلوٰۃ کے تقاضے پورے نہیں کرتے اور نہ ان میں صلوٰۃ کے فیوض و فوائد سے متمتع ہونے کی آرزو ہی

زندہ و فعّال رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سرطانی ادارے اور معاشرتی سرطان ہیں جو نہ تو اُسوۂ حسنہ کے مطابق صلوٰۃ کا مثالی نظام قائم کرتے ہیں اور نہ کرنے ہی دیتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں صلوٰۃ اپنی تاثیرِ حسن آفرینی سے محروم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ کو مؤثر بنانے اور اس کا مثالی نظام قائم کرنے، اس کے تقاضے پورے کرنے اور اس کے دُنیوی و اُخروی فوائد و فیوض اور جمالیاتی ثروت حاصل کرنے، نیز خوف و حزن کے عذاب النّار سے محفوظ و مصئون رہنے کے لیے سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا استیصال ناگزیر ہے۔ اکثر اہلِ علم و نظر کے نزدیک سرطانی اداروں کے استیصال کا کوئی "اِمکان" دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کو "اِمکان" دکھائی دے یا نہ دے، اس کی وقوع پذیری سے مایوس ہونا، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے انکار کے مترادف ہے۔ اصل یہ ہے کہ احوال و ظروف بظاہر کتنے ہی نامساعد و مایوس کُن کیوں نہ ہوں، ان میں "اِمکان" مضمر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر آن "اِمکان" پیدا کرتے رہنا، شیوۂ کردگار ہے، جسے قرآنِ مجید سُنّت اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

ان بھیانک اور انسانیت سوز حالات میں ہمارا کردار مثبت، حسین اور انقلاب آفرین ہونا چاہیئے، لہٰذا مسلمانوں سمیت جملہ افرادِ انسانی میں سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کے ظُلم و استحصال کا اور انسانی حقوق سے محرومی، ذلّت و مسکنت اور خوف و حزن کی آگ کا احساس و شعور پیدا کرنا؛ نیز اپنے اور ان کے دلوں میں اپنے اِلٰہ و ربّ کی محبّت اور اس کے حوالے سے تمام افرادِ نسلِ انسانی، بلکہ دیگر مخلوقات کی محبّت کی شمع فروزاں کرنا، اُن میں دُنیوی و اُخروی حَسَنہ، عزتِ نفس، حسنِ زندگی، حسنِ انقلاب، حسنُ المآب کی؛ نیز خوف و حزن کے کرب اور جہنّم کے عذاب النّار سے محفوظ و مصئون رہنے کی آرزو کا اِحیا کرنے کے لیے جہاد بالقرآن کرنا ہمارا شعارِ زندگی ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں، اس سلسلے میں اپنے اور دوسروں کے دلوں میں تقویٰ پیدا اور فحشاء و منکر کا سدِّباب کرنے کی خاطر جان و مال، قوّت و حکومت اور اقتدار و منصب وغیرہ وغیرہ کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ آخر میں اس حقیقت پر زور

دینا لے جانا ہو گا کہ صلوٰۃ اسی صورت میں نمازیوں کو فحشاء و منکر سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے، اگر اس کا نظام قائم ہو اور نمازی اس کے فرائض اور تقاضوں کا شعور رکھتے اور انہیں پورا کرتے ہوں۔

تقرّبِ الٰہی

دین کی مقصدیت عبادت، خصوصاً صلوٰۃ کی غایت اور حیاتِ انسانی کی غایت الغایات کیا ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو انسان کے دل میں تیرِ نیمکش کی طرح پیوست ہیں۔ وہ ان کی کسک محسوس بھی کرتا اور تسکینِ دل کے لیے ان کا جواب بھی چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ہماری زندگی میں غایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سوالوں کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے "تقرّبِ الٰہی"۔ تقربِ الٰہی کا مطلب اہلِ آرزو کا اپنے اِلٰہ و ربّ کے جوارِ رحمت میں جگہ پانا، اس کا بندہ و مقرب اور دوست و منظورِ نظر ہونا، لذّتِ حسنِ حیات سے آشنا ہونا، اس کی دید و رضا کی رحیقِ مختوم کی لذّت و مسرّتِ جانفزا سے سرشار رہنا اور نفسِ مطمئنہ و وارثِ جنّت بن جانا ہے۔ اللہ سبحانہ، وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس جملہ صفاتِ حسنہ یا شیونِ حسن کا سرچشمہ ہے، جس کی بنا پر اس کے لیے "الحُسن" کی تعبیر اختیار کی ہے؛ دوسرے وہ انسان کا اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق ہے؛ لہٰذا وہ اس کے قرب یا صوفیانہ اصطلاح میں وصال کی آرزو رکھتا ہے۔

الحُسن الاوّل و آخر اور الظاہر والباطن (الحدید ۵۷: ۳) ہے۔ وہ قدیم ہے، اور اس کی ذات میں عشق مضمر ہے جو اس کی جالیاتی۔ تزوکیی تخلیقی فعلیت کا محرکِ حقیقی ہے۔ حسن و عشق لازم و ملزوم ہیں؛ نیز وہ طالب و مطلوب، مؤثر و اثر اور علّت و معلول ہیں۔ حسنِ صلوٰۃ کی بدولت الحُسن کا قُرب حاصل ہوتا ہے تو اس کے اثر سے اہلِ جذب و شوق کے دل

میں محبّتِ الٰہی کی چنگاری شعلہ فگن ہو کر شمعِ فروزاں بن جاتی ہے، جسے "عشق" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حسن اگر عشق کو چاہتا ہے تو عشق بھی حسن کی طلب و جستجو رکھتا ہے، اور یہ دونوں یعنی حسن و عشق جو دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، حیات و ممات، زمان و مکان اور الحیوان وغیرہ وغیرہ کے حقیقی محرّکات ہیں۔ چنانچہ یہ خود الحسن ہے جس نے اہلِ آرزو کو خاص طور سے اس راز سے آگاہ کیا ہے کہ "میرے قرب و رضوان کی طلب و جستجو ہے تو میری بارگاہ میں سراپا عجز و نیاز، پیکرِ جذب و شوق اور صورتِ عرض و تمنا بن کر آؤ۔ مجھے ملنا اور میرے قریب رہنا ہے تو زمان و مکان سے ماوراء اس ارفع و اعلیٰ حسن المقام پر متمکن ہونا ہوگا جو عبد کی معراج ہے؛ اور اس کا ذریعہ سجدہ ہے" (العلق ۹۶:۱۹)۔ سجدہ کیا ہے؟ اپنے الٰہِ جمیل و کریم اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حضور جبہ سائی کرنا، ناک رگڑنا، اپنے نفس کو عجز و انکسار کی انتہاہ گہرائیوں میں گرا دینا، خشوع و خضوع اور گریہ و زاری سے اپنے جرم و گناہ کا اعتراف اور توبۃ النصوح کرنا؛ اپنی بے بسی و بیچارگی اور فقر و گدائی کا اظہار اور اس کی عظمت و کبریائی، قدّسی و قہّاری، سبحانی و صمدیّت اور عزّت و قدرت کا اقرار کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا ہے۔ اس سجدے سے انسان کو اپنے مقامِ عبدیّت اور اپنے الٰہ و ربّ کے مقامِ اُلوہیّت و ربوبیّت سے آگاہی ہوتی ہے اور وہ اس سجدے کے طفیل فرعونی اور قارونی و آزری سرطانوں اور سرطانی اداروں، نیز اپنے اصنامِ خواہش، مجسّموں، مورتیوں، شبیہوں، قبروں، آستانوں، دیوتاؤں دیولیوں، اکابر و ابطال، سورج، آگ، پانی، شجر و حجر، ناگ، بندر، اجرامِ فلکی وغیرہ وغیرہ کو سجدہ کرنے سے باز رہتا ہے۔ علاوہ بریں، اس سجدے میں بندہ اپنے الٰہِ اکبر و اعظم کے حضور اپنے آپ کو اپنی نظر میں انتہاہ گہرائیوں میں گرا دیتا ہے، لیکن اُس کی نظرِ حسن و کرم میں اپنے بندے کی یہ شعوری و ارادی اُفتادو ناصیہ فرسائی ایسی حسین ادائے عاشقانہ ہے کہ وہ اس کے نفس کو کبر و غرور، ہوا و ہوس اور خوف و حزن کی انتہاہ پستیوں سے نکال کر اپنے جوارِ جمال و رحمت

میں لے آتا ہے، جو محبوبیت و عاشق کا حُسنُ المقام ہے، جسے امام العاشقین و رحمۃٌ للعالمین اور محبوبِ یکتائے الٰہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے "احسان" سے تعبیر فرمایا (المشکوٰۃ، کتاب الایمان، ح ۱)۔ قرآنِ حکیم کی زبان میں یہی "قربِ الٰہی" ہے، جو سجدے کا حسنِ اثر ہے؛ اور یہی معنی ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ (العلق ۹۶: ۱۹) کا۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قربِ الٰہی کا مکان یا فاصلے سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس وقت بھی اپنی ذات میں موجود تھا، جب اُس نے ابھی تک زمین و آسمان یا زمان و مکان (TIME AND SPACE) تخلیق نہیں کیے تھے۔ وہ تو زمان و مکان سے وراء الورا ہے، اگرچہ انسان کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہے۔ معرفتِ الٰہی کے لیے اس کی صفاتِ حسنہ کا ادراک ناگزیر ہے، خصوصاً ان صفات کا ادراک بحدِ ایقان کہ وہ زندہ بالذّات و قائم بالذّات بھی ہے اور کائنات کو اُس نے قائم کر رکھا ہے؛ نیز وہ علیم و حکیم، عزیز و قدیر اور سبحان و صمد ہے۔ اُس کا قُرب دراصل بندے کا اس کی نظرِ لطف و کرم میں آنے کا اور اپنے نورِ حُسنِ باطنی کے اِتمام کا نام ہے۔ اس کی نظر میں آنے کا مطلب اس کا منظورِ نظر بننا ہے، جبکہ اِتمامِ نور سے مراد "احسان" کے مقامِ شاہدیت پر متمکن ہونا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹؛ وہ ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ افروز ہوتا ہے) کے حوالے سے اتمامِ نور انسان کے حسنِ قلب کے نور کی درجہ بدرجہ ترقی یا جمالیاتی اِرتقاء سے عبارت ہے؛ اور قربِ الٰہِ جمیل کے حسنِ نظر میں زیادہ سے زیادہ آنے اور رہنے، نیز اس کی ہم نظری و ہمکلامی کے امتداد اور محبت و رضائے باہمی کی افزونی پر دلالت کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قربِ الٰہی کے درجات بھی لامتناہی ہیں اور انسان کے جمالیاتی اِرتقاء کا سلسلہ بھی غیر مختتم ہے، اور یہ سِرّالاسرار ہے اس آیۂ جمیلہ کا: إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (التین ۹۵: ۶): [وہ لوگ جو اپنے حسنِ فطرت پر قائم رہتے ہیں اور ان کا

حسّی، قلبی، نفسی نُور درجہ بدرجہ ترقّی کرتا رہتا ہے، نیز وہ حیوانیت کی طرف رجعت قہقری کرنے سے محفوظ رہتے ہیں] جو ایمان لاتے اور صالح عمل کرتے ہیں، لہٰذا ان کا اجر ختم ہونے والا نہیں۔

اہلِ حسُن وعشق ہی یہ راز جانتے ہیں کہ ایمان وحُسنِ عمل کا صلہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے معروضِ حسُن وعشق کے قلب ونگاہ کے قریب سے قریب تر ہوتے جائیں۔ الحسُن کو بھی اپنے اہلِ آرزو سے جو محبّت ہے وہ اس کی رحمت کی طرح بیکراں ہے؛ لہٰذا وہ ہر زماں اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت کی شانِ ارفع واعلیٰ میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہے گا اور اس کے ساتھ اہلِ آرزو کے نورِ قلب ونگاہ کو بھی اسی نسبت سے تیز تر کرتا رہے گا۔ اس طرح ان کے نُور کی تکمیل بھی ہوتی رہے گی اور ہر کمال کے بعد کمالِ نُور کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔ یہ ہے ایمان وحُسنِ عمل کا نہ ختم ہونے والا اجر، اُن کے لیے جو اپنے الٰہ جمیل وکریم کی ہم نظری وہمکلامی اور قُرب ورضوان کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس رحیقِ مختوم کی لذّت وسرخوشی اور حیرت ومستی آمیزشِ خُمار سے منزّہ ہوگی اور یہ اہلِ آرزو کو حسُن کے جلوۂ نو بنو میں ملتی رہے گی اور ان کی آرزو پوری ہوتی رہے گی۔ اس رحیقِ بے مثال کی ایک صفت یہ ہو گی کہ اس سے ذوق کی تشفّی برنگِ اشتہا ہوتی رہے گی اور اس کے نتیجے میں زندگی اپنے حسُن کی شانِ نو بنو میں سفر کرتی رہے گی۔

فلسفۂ قُربِ الٰہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ بندے کا اپنے الٰہ ورب سے عشق وعبودیّت کا رابطہ لاینفک ہو اور کسی حال میں بھی منقطع نہ ہونے پائے؛ نیز الحسُن دل میں جانِ آرزو، آنکھوں میں معروضِ حسُن اور ذہن میں مطلوب ومقصودِ فکر وعمل بن کر رہے، اور جسم کے اعضاء وجوارح اس کی مرضی ومشیّت کے مطابق حرکت وعمل کریں۔ علاوہ بریں، "مَیں" بندۂ تسلیم ورضا اور پیکرِ عشق ووفا بن جائے اور

"وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے"

اس کا عقیدہ و کردار ہو جائے۔ معروضِ حسن و عشق قلب میں ہو اور جسم کا ایک ایک عضو دل و دماغ کے ساتھ اس کی تصدیق کرے تو اسے تصدیق بالقلب کہتے ہیں، اور یہی اصل میں کلمۂ شہادت ہے۔ ایمان بالحق کے مطابق حسنِ عمل ہو تو وہ زندہ و محکم اور سچا ایمان ہوتا ہے؛ ورنہ زبان سے کلمۂ شہادت پڑھ لینے سے آدمی شرعاً مسلمان تو کہلا سکتا ہے؛ لیکن حقیقت میں مؤمن ہوتا ہے نہ مُسلم۔

قُرب تعلقِ خاطر و عمل چاہتا ہے اور محبت و وفا پر دلالت کرتا ہے۔ جادۂ عشق و وفا پُرخار بھی ہے اور دشوار گزار و صبر آزما بھی؛ یہ دراصل زندگی کا پُل صراط ہے، جس کے نیچے دوزخ اور دوسرے کنارے جنّتِ "دوست" ہے۔ اس پر سلامتی سے گزرنے کا ایک ہی طریقہ اور وسیلہ ہے اور وہ ہے حبلُ اللہ (یا اللہ کی رسّی) یعنی قرآن حکیم جس کو مضبوطی سے تھام کر چلنا ناگزیر ہے۔ قرآنِ حکیم حقیقت میں نور و ہدایت ہے، جس میں زندگی کرنا "تمسّک بالقرآن" سے عبارت ہے۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ عظیم کے رہبرانہ اصول و تعلیمات اور اوامر و نواہی کے مطابق زندگی کرنا "تمسّک بالقرآن" ہے، اور یہی اصل میں قربِ الٰہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں "الحُسن" کی جو الحیّ و القیّوم ہے، "روح" ہوتی ہے: حُسن آفرین و سُرور انگیز اور منیر و جان آفرین روح۔ تمسّک بالقرآن سے اس کی "روح" کا رابطہ قلب و جان سے اُستوار ہو جاتا ہے، جسے قُربِ الٰہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس روحِ قرآنی سے ایک تو اہلِ آرزو کا حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام مسلسل نور و توانائی حاصل کرتا، حرکی و ارتقائی بنتا اور اپنی تکمیل کرتا ہے؛ جسے جمالیاتی اِرتقاء سے تعبیر کر سکتے ہیں؛ دوسرے، موضوعی یا معروضی شیطان مطیع و فرماں بردار یا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک میں "مسلمان" بن جاتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ تیسرے نفس میں صفاتِ الٰہی نشو و ارتقاء کرنے لگتی ہیں۔ چوتھے، زندگی حسین و طیبہ اور انسان

صاحبِ حسن دسرور بن جاتا ہے۔ ایسے ہی انسان کو اللہ سُبحانہ، وتعالیٰ اپنا مقرب بندہ بنا لیتا ہے۔

اللہ سُبحانہ، وتعالیٰ زمان ومکان سے وراء الورا ہے وجہ یہ ہے کہ زمان ومکان تو اس نے پیدا کیے ہیں اور وہ ان کی تخلیق سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے قُرب کا یہ عالم ہے کہ وہ انسان کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہے (قٓ ۵۰ : ۱۶)؛ اور جہاں تین اشخاص سرگوشیاں کرتے ہوں چوتھا وہ ہوتا ہے، اور چار ہوں تو پانچواں وہ ہوتا ہے، علیٰ ہذا القیاس؛ نیز جہاں کہیں بھی لوگ ہوں، وہ ان میں موجود ہوتا ہے (المجادلۃ ۵۸ : ۷)۔ اس کی قربت ماورائے ادراک ہی سہی، لیکن ہے تو سہی۔ چنانچہ سجدے میں اہلِ آرزو ہو تو اس کے قُرب کے اثرات اس قدر حسن آفرین ہوتے ہیں کہ حیاتِ انسانی رنگِ الٰہی یا صفاتِ الٰہی سے مزین ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ سُبحانہ، وتعالیٰ کے قُرب سے اس کے بندے میں اس کے ظرف کے مطابق اس کی صفاتِ حسنہ کا پیدا ہو جانا قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ یہی مفہوم ہے اس حدیثِ قدسی کا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کے ہاتھ پاؤں اللہ سُبحانہ، وتعالیٰ کے ہاتھ پاؤں بن جاتے ہیں۔ اس کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں اس طرح کی ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں، کار کُشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز (بالِ جبریل، ص ۱۳۲)

قُربِ الٰہی سے متعلق "توسّل وتزلّف" کے عالمگیر مشرکانہ عقیدے کی قرآنِ حکیم کی رُو سے تردید کر دینا موضوع سے انصاف کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بندے کا بلا واسطہ رشتے اور براہِ راست اس کی عبادت کا عقیدہ دینِ توحید یا

دینِ خالص کا اصل الاصول ہے۔ یہی ازلی و ابدی دینِ حنیف ہے؛ لیکن ابلیس کی جا بیاتی فریب کاری سے اَزری ادارے معرضِ ظہور میں آئے تو انھوں نے اپنی سیادت و سطوت، جلبِ منفعت اور مذہبی پیشوائیت کی خاطر تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے طاغوتی فنون کے ذریعے تزلّف و توسّل یا "وسیلۂ غیر اللہ" کا عقیدہ ایجاد کر لیا اور دین میں باطل کی آمیزش کر کے اسے ناخالص بنا دیا۔ اس بدعتِ مشرکانہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان براہِ راست یا بلاواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ کا قرب و رضوان حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی مرادیں بر لانے، حاجت روائی و مشکل کشائی اور اس تک پہنچنے کے لیے انسان کو پہلے بتوں (= زندہ و فوت شدہ برگزیدہ ہستیوں، دیوی دیوتاؤں، آستانوں، شبیہوں، مورتیوں، قبروں، مجسّموں وغیرہ وغیرہ) کا پکڑنا اور ان کی عبادت کرنا، ناگزیر ہے۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک توحید کی نفی اور شرک ہے، جو ناقابلِ معافی ظلمِ عظیم ہے۔ اس کے نزدیک دینِ خالص صرف دینِ توحید ہے جس کی رُو سے بندے اور اس کے اِلٰہ و ربّ کے درمیان تعلق بلاواسطہ اور براہِ راست ہے، اس میں کسی اور ہستی کو وسیلہ بنانا یا شریک کرنا ظلم و جہل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تو ربُّ العالمین ہے اور اس کی رحمتِ بیکراں ہر چیز کو محیط ہے؛ دوسرے، وہ اپنے بندے کی رگِ جاں سے بھی قریب تر ہے اور اس کی ہر دُعا کو سُنتا اور قبول کرتا ہے، اس کی رحمت و کرم نوازی اور بندہ پروری کی انتہا یہ ہے کہ اس کی اجابت اپنے بندوں کی دُعاؤں کی منتظر رہتی ہے۔ تیسرے، بندہ ایک قدم اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ دس قدم اس کی طرف لپک کر آتا ہے۔ چوتھے، وہ اور صرف وہی جملہ افرادِ نسلِ انسانی کا رازق و پروردگار، مالک و آقا اور اُن کا حسیب و وکیل اور مولیٰ و نصیر ہے؛ نیز وہ اور صرف وہی مجیب الدعوات و حاجت روا ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ اس پر قرآنِ حکیم شاہد ہے تو پھر کسی بندے کا توسّل و تزلّف کے عقیدے کو ماننا، ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ ظہورِ اسلام کے وقت یہ مشرکانہ عقیدہ اہلِ عرب بشمیت قریب قریب تمام اقوامِ عالم میں پایا جاتا

تھا۔ چونکہ اسلام کی دعوت، دعوتِ توحید ہے، لہٰذا اس نے اس باطل و مشرکانہ عقیدے کی تردید نہایت بلیغ و ایمان افروز انداز میں کی ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ فرماتا ہے:

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ ..... مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ○

(الزمر ۳۹: ۱تا۳)۔ یہ کتاب (= قرآنِ عظیم) اللہ کی طرف سے جو زبردست و زور آور اور حکمت والا ہے، نازل ہوئی ہے۔ (اے پیغمبرِ اعظم و آخر[۲]) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی ہے، جو حقیقی مقصدیت و غایت اور صداقت رکھتی ہے۔ لہٰذا (اس کی روشنی میں) اللہ ہی کی عبادت کرو (مگر اس طرح کہ) دین کو اس کے لیے (ہر باطل و مشرکانہ عقیدہ و رسم سے) خالص یعنی پاک و منزّہ کرتے ہوئے۔ یاد رکھو! اللہ کا دین تو خالص (یعنی کفر و شرک اور باطل کے رنگ سے منزّہ) ہے؛ اور وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا اولیاء یا سرپرست بنا رکھے ہیں (اپنے اس مشرکانہ عقیدہ و فعل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش و بندگی (= عبادت) اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں اور اس تک ہماری رسائی کرادیں۔ بلاشبہ اللہ ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ یقیناً اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو۔

محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ سے یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ شرک و بت پرستی کے عوامل و محرکات میں توسّل و تزلّف کا عقیدہ اساسی حیثیت رکھتا اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے عقیدۂ توحید کی نفی و تکذیب کرتا ہے۔ توحید ہی تو دین کی اساس ہے اور عقیدۂ توسّل و تزلّف اس کا استیصال کرتا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی اور امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ "خالص" توحید کا نقیب و علمبردار ہے۔ توحید دین کا محور ہے، جس کے گرد حیاتِ انسانی گردش کرے تو اس میں توازن رہتا ہے، لیکن اس کا رابطہ محور سے کٹ جائے تو اس کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے گوشے گوشے میں فساد رونما ہوجاتا ہے۔

عصرِ حاضر میں حیاتِ انسانی اپنے محورِ توحید سے کنارہ کش ہو گئی ہے، لہٰذا اصطلاحِ قرآنی میں بحر و بر میں فساد ظہور پذیر ہے۔

اصل یہ ہے کہ الحسن کے قرب سے زندگی میں توازن قائم رہتا ہے اور قربِ توحید کا مرہونِ منت ہے اور توحید حیاتِ اجتماعیہ میں توازن یعنی موزونی و اعتدال، ہم آہنگی، وحدت اور ائتلاف و اتحاد پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہے، بشرطیکہ اس کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کے مطابق زندگی کی جائے، اور اس کے لیے معاشرے میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظاموں کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ یہ یاد رہے کہ جس طرح انسان کے باطنی نظام میں قلب مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ان چار نظاموں میں نظامِ صلوٰۃ محور کی حیثیت رکھتا ہے، نیز نظامِ صلوٰۃ اس اعتبار سے کُل زندگی کو محیط ہے کہ یہ اپنی تکمیل کے لیے بقیہ تینوں نظاموں کے قیام کو چاہتا ہے۔ علاوہ بریں، تعلیم و تربیت، معاشیات، عمرانیات، الٰہیات، ثقافت، عدلیہ، انتظامیہ، کفالتِ اجتماعیہ، اجتہاد و جہاد وغیرہ وغیرہ کے نظام اصل میں نظامِ صلوٰۃ کے ذیلی ادارے ہیں، جو اس کے اجزائے لاینفک ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہو، نمازی اہلِ آرزو ہوں اور صلوٰۃ کے جملہ فرائض اور تقاضے پورا کرنا ان کا شعارِ زندگی ہو تو ان کی صلوٰۃ وسیلۂ قربِ الٰہی بنتی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح عبادت کی روح حسنِ صلوٰۃ ہے، اسی طرح حسنِ صلوٰۃ کی روح سجدہ ہے، اور یہ سجدہ ہے جو تقربِ الٰہی کا بہترین وسیلہ ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ سجدہ ہے جو معراجِ انسانی، مشیتِ ایزدی اور غایتِ دین ہے۔

علاجِ خوف و حُزن

خوف و حُزن کو نفس کی سرطانی امراض کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان سے قلب وجاں کو آگ لگ جاتی ہے اور زندگی اپنے حُسن و سُرور سے محروم ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں، ان سے متعدّد قسم کی نفسیاتی و اعصابی بیماریاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں، ان کی اہمیّت اس سے بہت زیادہ ہے، جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ فلسفۂ حیات صحیح طور سے سمجھنے کے لیے فلسفۂ خوف و حزن کا ادراک لازمی ہے اور اس ادراک کے لیے ان قرآنی اصطلاحات کی تشریح کر دی جاتی ہے۔

اِمام راغب اِصفہانی رح کے نزدیک خوف کے معنی ہیں، قرائن و شواہد سے کسی آنے والے خطرے کا اندیشہ کرنا جیسا کہ رجَاء اور طمَع کا لفظ قرائن و شواہد کی بنا پر کسی فائدے کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن ہے اور یہ امورِ دُنیوی و اُخروی دونوں سے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (۱۷: ۵۷): یعنی اس کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں (المفردات، بذیل مادہ خ و ف)۔

آگے بڑھنے سے پہلے مُستشرقین کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی خاطر کہ نقلِ کُفر کُفر نباشد مسلمانوں کا خُدا (توبہ نعوذ باللہ) ظالم و بے رحم ہے، جبکہ مسیحوں کا خُدا، جو ان کے نزدیک اقانیم ثلاثہ (= خُدا، مسیح اور رُوح القدُس) پر مشتمل ہے رحیم ہے، اس از بس اہم حقیقت کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبّہ کی رُو سے اللہ تعالیٰ ربّ العالمین اور رحمٰن و رحیم ہے (الفاتحہ ۱: ۱تا۳)؛ اس نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے (الانعام ۶: ۱۲، ۵۴)، اور اس کی رحمت ہر شے کو محیط ہے (غافر ۴۰: ۷)؛ نیز نہایت رؤف و ودود

اور رحیم و کریم ہے؛ لہٰذا وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں (البقرۃ ۲: ۵۷؛ آلِ عمران ۳: ۱۱۷ و بمواضع کثیرہ)۔ کسی پر ظلم کرنا ربِ رحمٰن کی شانِ سبحانیت و ربوبیت اور صفاتِ عدل و قسط سے بعید ہے، لہٰذا جب وہ کسی قوم کی گمراہی، تعذیب اور ہلاکت و بربادی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اس سے مراد اس کی ذات نہیں، بلکہ اس کا "قانونِ مکافاتِ عمل" ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی مادّی و غیر مادّی چیز تخلیق کی ہے، اس کی تاثیر و صورت ہے، نیز انسان جو عمل بھی کرتا ہے، وہ بھی اثر و صورت رکھتا ہے۔ چنانچہ حسین اعمال کے حسین اور قبیح اعمال کے قبیح اثرات انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ حسین اثرات کی متعدد صورتیں اور نام ہیں، جمالیاتی لذت و حظ، طمانیت و سکینت، قرۃ الاعین و راحت، نور و سرور، کیف و مستی، وجد و حال، جمالیاتی درد و سوز وغیرہ وغیرہ۔ ان حسین اثرات کے لیے تلمیذ القرآن نے "جمالیاتی ثروت" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ قبیح اثرات کے لیے قرآنِ حکیم نے خوف و حزن کی تعبیر اختیار کی ہے۔ خوف و حزن کی کئی صورتیں اور نام ہیں، مثلاً اندیشہ ہائے گوناگوں، مصائب و خطرات کی تشویش، اعصابی دباؤ، اضمحلال، بے خوابی، ذہنی انتشار، پریشانی و بے قراری، حسرت و یاس، ندامت و تاسف، حسد و بغض، احساسِ تنہائی و عدمِ تحفظ، اکتاہٹ، گھبراہٹ، عصبیت و عداوت، احساسِ محرومی و نامرادی، بیخوابی، تنگیٔ زیست اور قلب کی بے بصری، گوناگوں تفکرات وغیرہ وغیرہ۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ قدرت کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے جس کے باعث حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام پر اعمال کی نوعیت کے مطابق حسین یا قبیح اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ صدیقین، شہدآء اور صالحین کو جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔ اس کے برعکس کافروں، مشرکوں، تکذیبِ حق کرنے والوں، جاہلوں، سود خوروں، مفسدوں، معاشرتی سرطانوں (یعنی فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں) مجرموں، ظالموں، گناہگاروں اور زیاں کاروں کو ان کے

قبیح اعمال کی پاداش میں آتشِ خوف و حزن کا عذاب ملتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان کو اس کے اعمال کے حُسن و قبح کے مطابق جزا و سزا ملتی رہتی ہے اور ہر آن اس کے لیے آنِ حساب ہوتی ہے۔ جزا و سزا کی آنات کا سلسلہ انسان کے دمِ واپسیں تک چلتا رہتا ہے۔ لیکن عمر بھر کے کُل اعمال کے حساب اور جزا و سزا کے فیصلے کا ایک "قیامت" کا دن مُعین بھی ہے، جسے قرآنِ مجید "یَوْمِ الدِّیْن" کہتا ہے۔ روزِ قیامت جزا و سزا کا معیار "المیزان" ہو گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ قارعۃ میں فرماتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ؕ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ؕ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِیَهْ ؕ نَارٌ حَامِیَةٌ (القارعۃ ۱۰۱: ۶ تا ۱۱): یعنی (قیامت کے دن) جس شخص کے اعمالِ حسنہ یا حسنات کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ دل پسند عیش و عشرت میں ہو گا، اور جس کے پلڑے (حسنات یا اعمالِ حسنہ کے) ہلکے ہوں گے۔ اس کے لیے ہاویہ آغوشِ مادر ہو گی۔ تجھے کیا خبر کہ وہ کیا ہے؟ وہ آتشِ شعلہ زن ہے۔

سورۂ ہمزہ میں ہے کہ یہ شعلہ زن آگ دلوں کو بھی محیط ہو جائے گی اور اس سے چھٹکارا پانا محال ہو جائے گا (الہمزۃ ۱۰۴: ۴ تا ۱۰)۔

یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ ربِّ رحمٰن و رحیم ہے اور رحمت اس کی صفتِ عینِ ذات ہے؛ لیکن رحمت کا تقاضا احسان کے ساتھ عدل کرنا بھی ہے؛ اور اس کا قانونِ مکافاتِ عمل دراصل اس کی صفتِ عدل پر دلالت کرتا ہے۔ عدل بھی احسان کی طرح رحمت کا خاصہ اور تقاضا ہے۔ فلسفۂ عدل پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں، لہٰذا اس سے اِجمال و اختصار سے گفتگو کی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے ربّ العالمین نے یہ دُنیا انسان کے لیے دارالامتحان اور آخرت دارالجزاء بنائی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اُس نے دُنیا اور اُس کی نعمتوں کو جملہ بنی نوعِ انسان کے تمتع کے لیے بنایا ہے (البقرۃ ۲: ۳۶ و بمواضعِ کثیرہ)۔ متاع یا تمتع قرآنِ حکیم کی بڑی ہی

فکر انگیز و اہم اصطلاح ہے اور اس کے فلسفۂ معیشت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے معانی میں معاشیات کا یہ اصل الاصول مضمر ہے کہ انسان (فرد، جماعت، قوم ہر حیثیت سے) رب العالمین کی نعمتوں سے بمقتضائے حسنِ ضرورت استفادہ کرنے کا تو مجاز ہے، لیکن ضرورت سے زائد مال و دولت، اراضی و دیگر منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو اپنی ملکیت سمجھ کر نہ تو جمع کر سکتا اور نہ دوسروں کو ان سے تمتع یا استفادہ کرنے سے منع ہی کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ اکتناز ناانصافی اور ظلم ہے اور اس کی عبرتناک سزا کا قرآنِ مجید نے اس طرح ذکر کیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا ...... مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ○ (التوبہ ۹: ۳۴: ۳۵):

اے لوگو جو ایمان لائے ہو یعنی مسلمانو! اکثر علماء اور مشائخ یا درویشوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کا مال و دولت باطل طریقوں (مثلاً نذر و نیاز، نذرانوں، چڑھاوں، تعویذوں وغیرہ کے ذریعے آیاتِ قرآنی کو بیچ کر، نیز چندے، بیگار اور اپنی زیارت و دعا وغیرہ وغیرہ کے معاوضے کے طور پر) کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (توحید) سے روکتے ہیں (جو اس کی راہِ مستقیم ہے جس پر گامزن رہ کر اس کے موحد و صالح بندے اپنے الٰہ و رب تک پہنچتے ہیں، جو ان کی منزلِ مقصود ہے)؛ نیز وہ لوگ سونا اور چاندی یعنی مال و دولت، چاہے سرکاری کرنسی، نوٹ، سکّے، تمسکات، حصص، بانڈز وغیرہ وغیرہ کی صورت میں ہو) جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی اس کے ضرورت مند بندوں کی حاجات کو پورا کرنے پر) خرچ نہیں کرتے، ان کو المناک عذاب کی خوشخبری دو۔ یہ گفتگو چونکہ صلوٰۃ کے حوالے سے ہو رہی ہے، اس لیے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا صلوٰۃ کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ صلوٰۃ کسی مسلمان کو "العفو" یعنی حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو جمع کر کے رکھنے اور اس کے نتیجے میں اہلِ احتیاج وغیرہ کو ان کے رب کی نعمتوں سے محروم رکھنے، نیز اکتسابِ حرام، اکلِ حرام اور اکتناز و احتکار کی اجازت

نہیں دیتی (دیکھیے ہود ۱۱: ۸۷ اور "العفو" کے لیے ۲: ۲۱۹)۔

بات فلسفۂ خوف و حزن کی ہو رہی تھی، جس کا لبِّ لباب یہ ہے کہ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی چاہے کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، اِلٰہ و ربّ ہے نہ ہو ہی سکتی ہے؛ نیز اس میں کسی کو نفع و نقصان پہنچانے، دُعا سُننے، اُسے قبول کرنے، کسی کی حاجت پوری کرنے اور کسی کو اولاد اور رزق وغیرہ دینے کی خدائی طاقت ہوتی ہے نہ ہو ہی سکتی ہے (دیکھیے المائدہ ۵: ۷۶، الاعراف ۷: ۱۸۸؛ سبا ۳۴: ۲۲ اور بمواضع کثیرہ)؛ لہٰذا غیر اللہ سے ڈرنا جہل بھی ہے اور شرک بھی (الانعام ۶: ۸۸ و بمواضع کثیرہ)۔ انسان اگر اپنے نفس میں غور اور اس کا محاسبہ کرے تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ، پروردہ، بندۂ ناتواں اور محتاج و سائل ہے؛ نیز اس کا علم قلیل، قوّت محدود، عقل و فکر نارسا ہے؛ علاوہ بریں، انسان جو خود اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں اور اپنی احتیاجات و خواہشات کو خود پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، دوسروں کی مرادیں کیسے بر لا سکتا اور ان کی حاجات کیسے پورا کر سکتا ہے؟ یہ تو قادرِ مطلق کا کام ہے، لہٰذا ایسا سوچنا اور عقیدہ رکھنا جہل، ظُلم عظیم اور شرک ہے۔ تاریخ، اِلہامی کتب اور تاریخی عمل میں تفکّر بالحق کرنے سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ ابتداء میں بنی نوعِ انسان اُمّتِ واحدہ تھے اور ان کا دین ایک اور وہ دینِ توحید تھا جس معاشرے کا دین توحید ہو اور افراد مؤمن و موحِّد ہوں اور اس میں حُکم اللہ تعالیٰ کا چلتا ہو، وہاں سرطانی یعنی فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری ادارے قائم نہیں ہو سکتے۔ شیطان، جو اولادِ آدم کا ازلی دشمن ہے، اُس نے اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے انسان کو اس کے اِلٰہ و ربّ سے دُور و مہجور کرنے اور اس کے بجائے معاشرتی سرطانوں اور دیگر مخلوق ہستیوں کا غلام و محکوم اور پرستار و بندہ بنانے کی خاطر پہلے فرعونی سرطانی ادارہ قائم کیا، پھر اس کے نتیجے میں ہامانی، قارونی اور آزری ایسے سرطانی ادارے قائم ہو گئے۔

آزری اداروں نے جلبِ منفعت و سطوت، سیادت و پیشوائیت اور قوّت و اقتدار حاصل کرنے؛ نیز لوگوں کا استحصال کرنے، اُن سے دین کے نام پر بیگار، نذرانے اور چڑھاوے لینے اور ان کے پاس تعویذوں وغیرہ کی صورت میں آیاتِ الٰہیہ بیچنے کی خاطر الہامی تعلیمات و احکام کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون ایجاد کیے اور ان کے ذریعے وہ لوگوں میں مشرکانہ عقائد پھیلانے اور دین میں تشتّت و افتراق پیدا کرنے اور فرقے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے جمالیاتی تخلیقی شہکار انسان کو اس غارت گرِ ایمان و تقویٰ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے اور شرک ایسے ناقابلِ عفو گناہِ کبیرہ و ظُلمِ عظیم سے محفوظ رکھنے کی خاطر ربِّ رحمٰن و رحیم نے ایک تو دُنیا میں نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ شروع کر دیا اور دوسرے، بنی نوعِ انسان کو انفس و آفاق میں تفکّر بالحق کرنے کا حکم دیا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ اور کائنات سے اپنے رشتے کی نوعیّت کا ادراک و ایقان ہو جائے تو دُنیا میں شرک و بُت پرستی اور کفر و عدوان کے انسانیّت سوز ہنگامے رہیں نہ خونِ آشام و حریفِ آدم سرطانی ادارے۔ اس کے نتیجے میں دُنیا امن و سلامتی کی جنّت اور انسان نفسِ مطمئنّہ بن جائے۔ نفسِ مطمئنّہ ہی قرآنِ حکیم کا مثالی انسان ہے، اس لیے کہ وہ وارثِ جنّت ہے؛ نیز وُہ اپنے ربّ کا مقرّب و منظورِ نظر اور بندۂ تسلیم و رضا ہوتا ہے۔ فلسفۂ طمانیّت سے بحث گزر چکی ہے۔ سورۂ حجر کی آخری چار آیات فلسفۂ طمانیّت پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خوف کے بعد اب حزن کی تشریح کی جاتی ہے:

اَلحُزْنُ وَالحَزَنُ کے معنی ہیں، زمین کی سختی؛ تیز غم کی وجہ سے طبیعت میں جو بیقراری پیدا ہوتی ہے، اُسے بھی حُزن یا حزَن کہتے ہیں (المفردات، بذیل مادّہ)۔ قرآنِ مجید کی رُو سے کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے یا مصیبت پڑنے سے جو

غم و اندوہ ہوتا ہے، اُسے حزن سے تعبیر کر سکتے ہیں (آلِ عمران ۳ : ۱۵۳)۔ صالح انسانوں کو جو مصائب و تکالیف پہنچتیں اور رنج و اندوہ ہوتا ہے، ان میں حکمتِ الٰہی کار فرما ہوتی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو غم کرنے سے منع کرتا ہے (آلِ عمران ۳ : ۱۳۹)۔ ساتھ ہی انہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیتا ہے کہ اُس کے دوست (= اولیآء) خوف کھاتے ہیں نہ غم" (یونس ۱۰ : ۶۲)۔ وجہ یہ ہے کہ وہ صابر اور اہلِ تسلیم و رضا ہوتے ہیں؛ اور ان کے قلوب میں طمانیّت کی ایسی جمالیاتی ٹھنڈک ہوتی ہے جو خوف و حزن کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

خوف و حزن کا مرض اُمّ الامراض ہے۔ اس سے دل کو آگ لگ جاتی ہے، جس کا عذاب واقعی عذاب النّار ہے۔ یہ آگ دُود آمیز ہوتی ہے، جس میں باطنی نُور کو بجھانے اور قلب کو اندھا کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ مرض انسان کے ظُلم و جہل، کفر و شرک اور جرم و گناہ، نیز اللہ تعالیٰ سے دُوری و مہجوری اور اس کے ذکر سے تغافُل پر دلالت کرتا ہے۔ خوف و حزن سے بہت سی نفسیاتی و اعصابی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ قُرآنِ مجید کی رُو سے نفسیاتی بیماریاں دراصل قلب کی بیماریاں ہیں۔ میری کتاب جمالیات (قُرآنِ حکیم کی روشنی میں) میں قلب کے امراضِ عشرہ سے بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ اس وقت ان کی نشاندہی کیے دیتا ہوں: (۱) عام بیماری (۲) قساوت (۳) کجّی (۴) زنگ آلودگی (۵) حجاب (۶) غفلت و جہالت (۷) اندھاپن (۸) تقفّل (۹) طبع اور (۱۰) ختم۔ (پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد)۔

مختصر یہ کہ خوف و حزن سے امراضِ قلب پیدا ہوتے ہیں، جن سے حواس و نفس بھی منفی انداز میں متاثّر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے، اگر قلب صالح ہو اور اپنا کام صحیح طور پر کرتا ہو تو حواس و نفس بھی صحیح کام کرتے ہیں۔ نفسیاتی یا قلبی بیماریوں کے عوامل تو خوف و حزن ہیں؛ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو خوف و حزن پیدا کرتے ہیں؟ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے تین بنیادی عوامل ہیں، جن سے دو داخلی اور ایک خارجی ہے۔ داخلی عوامل خُدا ناشناسی اور خود ناشناسی ہیں۔ خُدا ناشناسی کا مطلب اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ سے

ناشناسی، کم شناسی یا غلط شناسی اور بے یقینی ہے؛ اور خود ناشناسی کے معانی ہیں: انسان کی اپنے نفس کی سچّی آرزوؤں، تقاضوں، آخری تمنّا اور مقصدیّتِ حیات سے، نیز اللہ تعالیٰ اور اس کی جملہ مخلوقات سے اپنے رشتے کی نوعیت و اہمیّت سے ناآشنائی یا کم آشنائی اور بے یقینی ہو۔

خارجی عوامل میں "معاشرتی سرطانیت" بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ معاشرتی سرطانی یا فرعونی، ہامانی اور قارونی و آزری ادارے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنے بندے بنانے اور ان کا الٰہ و ربّ، مالک و حاکم اور مطاع و ممدوح بننے کی خاطر ان کو ان کے انسانی حقوق سے محروم رکھتے، ان کا استحصال کرتے، ان پر اپنا حکم چلاتے، ان کی تذلیل و تحقیر کرتے، ان کو اپنا محتاج و دست نگر بناتے اور ان پر مظالم توڑتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان سے خوفزدہ رہیں اور اپنی محرومیوں، حسرتوں، دکھوں اور خطرات و آلام کی آگ میں جلتے رہیں۔ بالغرض، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور جمالیاتی ثروت سے محرومی ہی خوف و حزن کے عذاب النّار کی اصل وجہ ہے۔

قرآنِ مجید کی رُو سے خوف و حزن کے سرطانی مرض کا ایک علاج اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب ہے کہ صلوٰۃ کو ذوق و شوق سے اور اسے اپنی قرۃ العین بنانے کی خاطر باقاعدہ اور نظم و ضبط کے ساتھ قائم کیا جائے؛ اس میں قرآنِ مجید میں سے جو کچھ پڑھا جائے اور جو دعائیں مانگی جائیں، ان کے معانی و مفہوم سے نمازی آگاہ ہوں، صلوٰۃ کے تقاضوں کا ادراک و شعور رکھتے اور ان کو پورا کرتے ہوں؛ نیز ان میں صلوٰۃ کے فیوض و برکات اور جمالیاتی ثروت کو حاصل کرنے کی سچّی آرزو بھی ہو۔ یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ صلوٰۃ سچے اور اہلِ آرزو نمازیوں کو موحّد و صالح اور آزاد و مجاہد بناتی اور ان کے دلوں سے خوف و حزن کا ہر تیرِ نیمکش نکال دیتی ہے۔

احساسِ تنہائی کا مداوا

احساسِ تنہائی عصرِ حاضر کا ایک ایسا عالمگیر نفسیاتی یہ معاشرتی مرض ہے، جس نے وبا کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس کے شکار امیر بھی ہیں اور غریب بھی، خون آشام معاشرتی سرطان بھی ہیں اور سرطان گزیدہ عوام بھی، نیز عورتیں بھی ہیں اور بچّے بھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے: کیا صلوٰۃ انسان کو احساسِ تنہائی کی اذیتوں سے نجات دلا سکتی ہے؟

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ احساسِ تنہائی ایسے کربناک مرض کو شفا دینے کی تاثیر جس قدر قیامِ صلوٰۃ میں ہے، کسی اور طریقۂ علاج میں نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ ہی ایک ایسی حسین و مؤثّر عبادت ہے، جس میں مخلص و موحدّ اور اہلِ آرزو نمازیوں کو اُن کے اِلٰہ و ربّ سے ملانے اور اس کے قرب و حضوری اور دید و رضا کی جاویاتی ثروت دلانے کی قابلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

حُسنِ عبادت کی حیثیت سے صلوٰۃ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ایک تو اس میں قرآنِ عظیم کی تلاوت کی جاتی اور قرأت سُنی جاتی ہے جس سے اس کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس میں نمازی پیش امام کی قیادت میں باجماعت اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام اور اِلٰہ جمیل و کریم کے حضور خشوع و خضوع، ادب و تعظیم اور عجز و انکساری کے ساتھ قیام و رکوع اور سجود و قعدہ کرتے؛ اس کی حمد و ثنا اور تمجید و تقدیس کرتے؛ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم پر درود و سلام بھیجتے؛ نیز اپنے اور اپنی اولاد، والدین نیز مؤمنین کے لیے دُنیوی و اُخروی حسنہ اور رحمت و مغفرت کی دُعا مانگتے ہیں۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ بلاشُبہ حُسنِ عبادت کی اکمل و احسن صورت ہے اور اس کے نتائج بھی حسین و دُور رس اور طمانیت انگیز و سرور آفرین نکلتے ہیں؛ مثال کے طور سے صلوٰۃ اہلِ آرزو کے لیے قرّۃُ العین

بنتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ انہیں جمالیاتی ثروت دیتی اور نفوسِ مطمئنّہ و اہلِ حسن و سرور بناتی ہے۔ ایسے ہی نمازی اللہ تعالیٰ کے بندے، دوست اور اس کی جنّت کے وارث ہوتے ہیں۔ دوسرے ان کے باطنی نور کا اتمام یا جمالیاتی ارتقاء کرتی اور ان کو احسان کے مقامِ شاہدیّت و مشہودیت پر متمکّن کرتی ہے، جو عبدیّت کا ارفع و اعلیٰ حسن المقام ہے۔ یہ اہلِ آرزو کے قلوب کو حسین و منوّر بناتی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ رہتا ہے، اور جہاں وہ ہو وہاں خوف و حزن ہوتا ہے نہ احساسِ تنہائی۔ وجہ یہ ہے کہ بندے کو اگر یہ احساس و یقین ہو کہ اللہ جلّ شانہٗ، جو عزیز و قدیر، جبّار و قہّار اور ربِّ ذوالجلال والاکرام اور الٰہِ جمیل و رحیم ہے، اس کا رفیق اور اس کی شہ رگ سے قریب تر ہے اور وہ اس کی نظر میں ہے، نیز "وہ" اس کا مولیٰ و نصیر، ولی و حاجت روا اور حافظ و کارساز ہے تو بندہ اپنے آپ کو لاوارث و تنہا سمجھ سکتا ہے نہ بے یار و مددگار؛ لہٰذا اسے احساسِ تنہائی ہو سکتا ہے نہ خوف و حزن۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوست نفوسِ مطمئنّہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو خوف ہوتا ہے نہ حزن و ملال (یونس ۱۰: ۶۲)، اور احساسِ تنہائی بھی خوف و حزن ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کا انسان رہینِ خوف و حزن ہے اور اس کے نتیجے میں احساسِ تنہائی کے کرب میں مبتلا، حسنِ زندگی کی لذّت سے ناآشنا، فحشآء و منکر کا دلدادہ، سنگدل، بدسرشت و اہلِ نار ہے۔ اگر اسے اس حقیقت کا عرفان و ایقان ہو جائے کہ احساسِ تنہائی اور خوف و حزن کی آگ، دل کو کفر و شرک، ظلم و جہل، خود ناشناسی و خدا ناشناسی، جرم و گناہ، فحشا و منکر اور فساد کے سبب لگتی ہے تو وہ متّقی و مومن اور موحّد و محسن بن جائے اور اس کے نتیجے میں اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی حسن و نور اور اطمینان و سرور سے معمور اور یہ دنیا اس کے لیے امن و سلامتی کی جنّت بن جائے۔ اصل یہ ہے کہ خوف و حزن کی تاثیر آتش ہے تو اس کے نقیض امن و اطمینان کی تاثیر قرۃ العین۔ چنانچہ قرآنِ مجید

کی رُو سے خوف و حزن اہلِ نار کی اور اطمینانِ نفس، اہلِ جنّت کی علامت ہے (النحل ۱۶: ۱۱۲، فصّلت ۴۱: ۳۰، الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰ و بمواضع کثیرہ)؛ اولیآ اللہ یا اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے نہ غم و ملال۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اولیآء اللہ کون ہوتے ہیں؟ ان کی قرآنِ مجید نے کیا پہچان بتائی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس میں جہاں یہ فرمادیا کہ اولیآء اللہ کو خوف و حزن نہیں ہوتا، ساتھ ہی ان کی پہچان بھی بتادی کہ وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے ہیں (جیسا کہ ایمان لانے اور تقویٰ کرنے کا حق ہے) (یونس ۱۰: ۶۲-۶۴)۔ ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے جُملہ عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو دل و جان اور قول و فعل سے تسلیم کیا جائے۔ تقویٰ بھی قرآنِ مجید کی بنیادی اور کثیر المعانی اصطلاح ہے۔ اس کے معانی میں حُسن و حق کی تلاش، قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف، نیز فحشآء و منکر، شرک و بت پرستی، کفر و نفاق، جرم و گناہ اور ظلم و عدوان سے بچنے کی سعی و جہد اور راہِ مستقیم پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچنے کی طلب و جستجو کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے فلسفۂ خوف و حزن کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر ان صفات کا سلسلہ وار ذکر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اہلِ ایمان کو احساسِ تنہائی سمیت خوف و حزن سے مصئون رکھتی ہیں؛ یعنی اسے ولی اللہ بناتی ہیں:

(۱) الھدٰی کا اتّباع:

اللہ تعالیٰ کی ہدایت یا وحی و تنزیل کی پیروی سے انسان خوف و حزن سے محفوظ رہتا اور اسے ربِّ کریم سے اجر ملتا ہے: جنّت و ولایت کی صورت میں۔ بخلاف اس کے جو لوگ الھدٰی کو ماننے سے انکار اور اس کی تکذیب کرتے ہیں، وہ اہلِ نار یا جہنمی ہوتے ہیں (البقرۃ ۲: ۳۸-۳۹)۔ یہ نکتہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ

دین کی بنیاد ایمان اور ایمان کی اساس قیامِ صلوٰۃ ہے، اور صلوٰۃ حصولِ ولایت کا ذریعہ اور کلیدِ جنت ہے۔

(۲) تسلیم و رضا اور احسان و حُسنِ عمل:

یہ اولیاء اللہ کی صفات حسنہ ہیں اور ان کا مطلب اپنے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی تعمیل کے لیے وقف کر دینا اور حُسنِ عمل کا خوگر ہو جانا اور احسان کو اپنی فطرتِ ثانیہ بنا لینا ہے۔

(۳) انفاق فی سبیل اللہ:

اولیاء اللہ کی اس صفت کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کے بندوں کو اپنا مال و دولت دینا یا ان کے لیے خرچ کرنا، پھر خرچ کر کے نہ جتانا اور نہ ان کو کسی طرح بھی دُکھ ہی دینا۔ دکھاوے کے لیے خرچ کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ ایسا انفاق لاحاصل ہوتا ہے (۲: ۲۶۴)؛ لیکن محض رضائے الٰہی کے لیے رات ہو یا دن، موقع و محل کا جیسا بھی تقاضا ہو، چھپ چھپا کر اور کھلے بندوں خرچ کرنے کی رخصت ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر ہے اور اس انفاق میں خوف و حزن سے مصئون رکھنے کی تاثیر ہے (دیکھیے البقرۃ ۲: ۲۷۴)۔ انفاق فی سبیل اللہ میں انفاق بالعفو (ضرورت سے زائد مال و دولت اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے) کا بھی مفہوم پایا جاتا ہے۔

(۴) ایمان و اعمالِ صالحہ اور اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ:

یہ اولیاء اللہ کی صفات بھی ہیں اور بنی نوعِ انسان کو ایسا بنانے کا وسیلہ بھی ہیں۔ دین کے یہ چار بنیادی ارکان اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق افرادِ نسلِ انسانی کو

خوف و حزن کے عذاب الیم سے محفوظ و مصئون رکھنے، اور ان کو اولیاء اللہ اور اہلِ جنّت بنانے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ اس بنا پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کی غیر معمولی اہمیّت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں، لہٰذا ان کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے:

(ا) ایمان:

اس کا مطلب ہے اسلام کے جملہ عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر قول و فعل اور دل و جان سے تسلیم کرنا اور ان کو اپنے اندر جذب کر کے ان کے مطابق یقینِ محکم اور اطمینانِ کامل کے ساتھ زندگی کرنا۔ قرآنِ عظیم کی رُو سے ایمان کا ایک مطلب اسلام میں پورے طور سے داخل ہو جانا بھی ہے (البقرہ ۲: ۲۰۸)۔

(ب) اعمالِ صالحہ:

اس قرآنی اصطلاح کے معانی ہیں: حُسنِ خُلق و حُسنِ کردار اور ایسے اعمالِ حسنہ جو موقع و محل کے لحاظ سے موزوں ہوں، اور ان میں زمانے اور دُنیوی و اُخروی یا مادّی و روحانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے؛ فتنہ و فساد کو دُور کرنے، احوال و ظروف کی اصلاح کرنے کی، نیز انسان (فرد ہو یا قوم) کو اس کی مادّی ترقّی اور جمالیاتی ارتقاء میں مدد دینے اور اسے صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے کی صلاحیت ہو۔ علاوہ بریں، عملِ صالح میں حسنہ و خیر، صلاح و پرہیز گاری تقوٰی و ذکرِ الٰہی، عدل و احسان، محبّت و شفقت، تکریمِ انسانی و رحمۃٌ للعالمینی، اکتسابِ علم و حکمت، تحصیلِ ٹیکنالوجی، ہمدردی و غمگساری، ایثار و قربانی، خدمتِ خلق و رفاہِ عامہ، عفو و درگزر، صبر و حلم، حق گوئی و شجاعت، جود و سخا، اجتہاد و جہاد، نیز جمالیاتی ثروت حاصل کرنے اور مادّی و جمالیاتی ارتقاء کرنے اور کسبِ حلال اور محنت و مشقّت کرنے، سب سے بڑھ کر راہِ مستقیم پر چلنے اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کی سعی و جہد کرنے

کے معانی پائے جاتے ہیں۔ الغرض، اعمالِ صالحہ سے مراد وہ حسین اعمال ہیں، جو اپنے اور دوسروں کے قلوب کو جمالیاتی طمانیت و مسرت دیں۔

(ج) اقامتِ صلوٰۃ:

اجتماعی لحاظ سے اس کا مطلب قیامِ صلوٰۃ کے لیے مساجد اور مساجد کو تعلیمی، تربیتی، ثقافتی مراکز بنانا اور ان دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنے اور صلوٰۃ کے ثمرات سے کما حقہٗ استفادہ کرنے کی خاطر اس کا نظام قائم کرنا اور احسن طریقے سے چلانا ہے۔ یہ حکومت کی اوّلین فرمہ داریوں میں سے ہے اور اس معاملے میں حکومت سے تعاون کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ انفرادی اعتبار سے اگر کوئی عذرِ شرعی نہ ہو تو ہر مسلمان مرد پر صلوٰۃِ پنجگانہ مسجد میں با جماعت ادا کرنا فرض ہے۔ عذرِ شرعی کی صورت میں گھر میں یا کسی اور جگہ صلوٰۃ با جماعت یا اکیلے میں ادا کرنا جائز ہے۔

(د) ایتائے زکوٰۃ:

انفرادی لحاظ سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زکوٰۃ دینا ہر صاحبِ نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اجتماعی اعتبار سے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زکوٰۃ وصول کرنے اور کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا اور اسے احسن طریقے سے چلانا حکومت کا بنیادی وظیفہ ہے۔ اس اعتبار سے رعایا کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا، یا اُن کے انسانی حقوق اُنہیں دینا حکومت کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ بنیادی ضروریات یا حقوقِ انسانی کا مطلب رعایا کے روزگار، کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے، تعلیم و تربیت حاصل کرنے، نیز علاج معالجے، صحت و صفائی اور جلال بازی، سیر و تفریح وغیرہ وغیرہ؛ نیز ان کے مال و جان اور عزّت و ناموس کے تحفّظ اور ان کے لیے مفت و بلاتاخیر عدل کا معقول انتظام کرنا ہے۔

(۷) توحیدِ ربوبیت پر استقامت :

قرآنِ مجید کی رُو سے اس کا مطلب ہے : اللہ تعالیٰ کو اپنا ربّ (= رازق و پروردگار، حاجت روا و کارساز، مولیٰ و نصیر اور سمیع و مستجیب الدّعوات) کہنا اور پھر اس پر ہمیشہ قائم رہنا (فصّلت ۴۱ : ۳۰ اور الاحقاف ۴۶ : ۱۳) اولیاء اللہ موحِدّ ہوتے ہیں۔ چنانچہ وُہ توحیدِ ربوبیت کے عقیدے کو حرزِ جان بنا کر اس کے مطابق زندگی کرتے ہیں۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو، چاہے کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو اور وہ بقیدِ حیات ہو یا فوت شدہ، نہ تو اپنا الٰہ و ربّ سمجھنا نہ بنانا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ موحدّ نہ تو خوف و حزن اور نہ احساسِ تنہائی کے عذاب الیم میں مبتلا ہی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ شرک ہے جو انسان کو تنہائی کے خوف و حزن میں مبتلا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام اصلاً دینِ توحید ہے اور توحید میں رحمت مضمر ہے۔ چنانچہ ایک طرف ربِّ وحدہٗ لاشریک اپنے موحدّ بندوں کو اپنی رحمت میں لے لیتا ہے تو دوسری طرف اس کے موحدّ بندے جملہ بنی نوعِ انسان سمیت اس کی کُل مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں افرادِ معاشرہ نہ تو احساسِ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ رہینِ خوف و حزن ہی ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم ہوتے ہیں۔

طمانیتِ نفس

قیامِ صلوٰۃ کا ایک نہایت حسین فائدہ یہ ہے کہ اس سے طمانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے، یہاں دو ایک اہم نکات کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اگرچہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اوّل، اکتسابِ علم و ہنر، جمالیاتی تخلیقی فکر و فعلیت، ایجاد و اختراع حسنِ عمل، حسنِ عبادت، یادِ الٰہی، جمالیاتی ارتقاء اور "احسان" کے درجاتِ شاہدیت و مشہودیت پر متمکن ہونے کے لیے طمانیتِ قلب از بس ضروری ہے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتی۔

دوسرے، طمانیتِ قلب انسان کو شرک و بُت پرستی سے، نیز اپنی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنانے سے باز رکھتی ہے۔ اگرچہ کسی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنانا بھی شرک ہے اور شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے، لیکن بہت کم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ خواہش یا مرغوباتِ خواہش، مثلاً مال و دولت، اراضی، بنگلے، جنس (SEX)، حکومت و اقتدار، شان و شوکت، شہرت و خود نمائی، طمع و خوشامد، کبر و غرور وغیرہ کو اپنا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بنا لینا بھی شرک ہے۔ تیسرے، طمانیتِ قلب انسان کو فحشاء و منکر، جرم و گناہ، ظلم و استحصال، ناانصافی اور کتمانِ حق کرنے، نیز جھوٹ بولنے، جھوٹی شہادت دینے، امانت میں خیانت کرنے اور کاروبار یا لین دین میں بددیانتی کرنے سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چوتھے، نفس مطمئن ہو تو انسان کئی قسم کی نفسیاتی اور بدنی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، مثلاً خوف و حزن کے کرب اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے مثلاً ذہنی انتشار، بےخوابی، نفسیاتی دباؤ، اعصابی اضمحلال، اندیشہ ہائے گوناگوں، کربِ احساسِ تنہائی، فشارِ دم، اضطراب و بیقراری، احساسِ محرومی، یاس و قنوطیت، پیری و مرگِ مفاجات کا خطرہ اور

ڈر، مردم بیزاری و نفرت، حسرت و پشیمانی، حسد و بغض، غیظ و غضب اور دیوانگی و غم وغیرہ وغیرہ۔ پانچویں، طمانیت مومنین کو اہلِ تسلیم و رضا بناتی ہے اور تسلیم و رضا نفس کی اس کیفیت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اپنے رازق و پروردگار اور آقا و مالک (= رب) سے جو اس کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (= اِلٰہ) بھی ہے، خوش ہے اور ہر حال میں اس سے خوش رہتا ہے، چاہے اس پر کچھ بیت جائے اور اُسے اذیت ناک و صبر آزما امتحانوں سے گزرنا کیوں نہ پڑے۔ وجہ یہ ہے کہ شیوۂ عشق، شیوۂ تسلیم و رضا ہوتا ہے۔ الغرض طمانیتِ نفس حیاتِ انسانی کو حسین و کامیاب اور عظیم بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

طمانیت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بہائے جنت بھی ہے اور اس کا معیار بھی۔ یہ معیار انسان کو بتاتا ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہے یا اصحابُ النار میں سے، بشرطیکہ وہ اپنے نفس کو ضمیر فی جنت سمجھ کر اس کو دیدۂ بینا سے دیکھے اور اس کا جائزہ لے۔ اگر اس کا نفس مطمئن ہے اور وہ اہلِ تسلیم و رضا میں سے ہے تو اس قرآنی معیار کی رو سے وہ جنتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر اس کا نفس مطمئن نہیں، بلکہ رہینِ خوف و حزن ہونے کے باعث مضطرب و بیقرار رہتا ہے اور وہ اہلِ تسلیم و رضا میں سے نہیں ہے تو سمجھ لے کہ وہ اہلِ نار یا دوزخی ہے۔

اس زندہ و خود کار معیار کی ایک امتیازی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ غیر مرئی و غیر محسوس ہونے کے باوجود "حقیقت" ہے اور قدرت کی ایسی تخلیق بالحق ہے جو محسوس و مرئی کمپیوٹر کی طرح کبھی ناکارہ و غلط کار نہیں ہوتی؛ نیز اس اصلِ عظیم پر دلالت کرتی ہے کہ حقیقت غیر مرئی و نامحسوس بھی ہوتی ہے۔ اس سے اس مکتبِ فکر کی تردید ہو جاتی ہے جو حقیقت کو صرف محسوس یا ٹھوس (CONCRETE) سمجھتا ہے اور اس بنا پر نامحسوس و مابعد الطبیعی حقائق کو تسلیم نہیں کرتا۔

سورۂ فجر کی مندرجۂ ذیل آیاتِ جملہ اس موضوع پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان

میں انسان کو اس نفسیاتی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ فقط وہی اہلِ ایمان و توحید جنّت میں جائیں گے، جن کے نفس مطمئن ہوں گے۔ قیامت کے دن جب کوئی نفسِ مطمئنّہ جنّت کے دروازے پر پہنچے گا تو ربّ ذوالجلال والاکرام نہایت محبّت آمیز انداز میں اپنے بندۂ تسلیم و رضا کی پذیرائی کرے اور اس سے مخاطب ہو گا — یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ٥ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ٥ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ٥ (فجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰) : اے مطمئن متنفّس! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے خوش وہ تجھ سے خوش ہے۔ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

دیکھنے میں یہ چار مختصر بول ہیں، لیکن بڑے ہی حسین و شیریں اور جامع و مانع، نیز محبّت آمیز و حکیمانہ نکات سے مملو ہیں۔ میں انھیں اعجازاتِ قرآن میں سے سمجھتا ہوں۔ چونکہ موقع تفصیل کا نہیں ہے، لہٰذا ان کے بعض اہم نکات کی طرف مجمل اشارے کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ امر کہ اللہ تعالیٰ اکبر و اعظم، سبحان و صمد اور ذوالجلال والاکرام ہونے کے باوجود خود اپنے بندوں کو اپنی طرف بلائے گا، ان کو خوش آمدید کہے گا، ان کو جنّت میں داخل ہونے اور اپنے بندوں کی رفاقت میں زندگی کرنے کی دعوت دے گا، نیز ان کا میزبان ہو گا، اس کی رحمتِ بے پایاں اور بے قیاس فضل و کرم پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے، ربّ جلیل و کریم اپنے مہمانوں کو فرداً فرداً نفسِ مطمئنّہ کہہ کر خطاب کرے گا اور اس میں یہ نکر انگیز و ایمان افروز نکتہ مضمر ہے کہ قیامت کے دن وہ صرف مطمئن نفوس کی پذیرائی اور ان سے کلام کرے گا، نیز انھیں اپنے بندوں میں شامل ہونے اور اپنی جنّت میں داخل ہونے کی دعوت دے گا۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جنّت میں صرف مطمئن نفوس ہی جائیں گے، دوسرے نہیں جائیں گے؛ لہٰذا طمانیتِ نفس جنّت میں جانے کی پیش شرط بھی ہوئی اور بہائے جنّت بھی۔

(۲) ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ یعنی اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ یہ ارشادِ الٰہی دو حقائق پر

دلالت کرتا ہے، ایک تو محبت و رحمتِ الٰہی پر، اور دوسرے، اس پر کہ نفسِ مطمئنہ دُنیا میں اُسی کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اولاد اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے اور ہر قسم کی حاجت روائی کے لیے والدین کی طرف رجوع کرتی ہے؛ یا علم و ہنر کی تحصیل کے لیے اپنے معلّم و اُستاد کی طرف اور مظلوم انصاف کے لیے قاضی، مُنصف یا حاکم کی طرف رجوع کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ اپنی حاجت روائی و کارکشائی، نصرت، استمداد اور رُشد و ہدایت کے لیے صرف اسی کی طرف رجوع کرتا ہے؛ اُسی کو پکارتا اور اسی سے فریاد کرتا ہے۔ اپنے ربّ کی طرف رجوع کرنے کے ارشادِ الٰہی میں اس کی رحمت و پناہ میں آنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، انسان معاشرتی بشر ہے، لہٰذا زندگی کے گوناگوں مشاغل و کاروبار وغیرہ میں منہمک ہو جانے کے باعث اپنے الٰہ و ربّ کی یاد سے وقتی طور پر غافل بھی ہو جاتا ہے، تو فراغت پاتے ہی اس طرف رجوع کرتا ہے، یعنی اُسے یاد اور استغفار کرنے لگتا اور اس کے ذکر و فکر میں مشغول ہو جاتا ہے۔

"رَبِّكِ" یا "اپنے ربّ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ مژدہ جانفزا سناتا ہے کہ "دیکھ میں تیرا ربّ ہوں، جسے تُو دُنیا کی زندگی میں بن دیکھے اپنا ربّ مانتا تھا، صرف زبان و دل سے نہیں، بلکہ عمل سے بھی۔ تُو نے توحیدِ ربوبیّت کے عقیدے کو اپنے حسّی، قلبی، نفسی نظام میں جذب کر کے اس کے مطابق زندگی کی تھی۔ تُو نے میرے سوا کسی اور ہستی کو یعنی غیر اللہ کو قولاً یا فعلاً اپنا ربّ (یعنی رازق و پروردگار، مالک و حاکم، حاجت روا و مشکل کُشا، کارساز و ضامن، حافظ و ناصر، دستگیر و شافی، اولاد وغیرہ دینے اور مراد بر لانے والا، دُعا سننے اور قبول کرنے والا یعنی مستجیب الدّعوات یا خدا) تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ اس کی خدائی یا صفتِ ربوبیّت میں غیر اللہ کو شریک ہی سمجھا

تھا۔ آج اپنے اُس ربّ کے پاس آجا جس کی تو دُنیا میں حمد و ثنا اور پرستش و اطاعت کرتا تھا۔ آج تیرے اور فقط تیرے ہی ربّ کی بادشاہت ہے اور اس میں دُنیا کی طرح کسی فرعون و ہامان یا قارون و آزر کی عملداری نہیں۔

(۳) رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (= تو مجھ سے خوش اور میں تجھ سے خوش)۔ قرآنِ حکیم کی ترکیبِ لفظی کے لیے ہم نے "ہم رضائی" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے انسان کے رشتے کی نوعیت دُہری ہے: اس کا ایک رشتہ مربوبیّت کا اور دوسرا عبودیّت کا ہے۔ رشتۂ مربوبیّت کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا ربّ ہے اور اس کی ربوبیّتِ نفسی و بدنی کرتا ہے۔ برعکس اس کے، انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ و پروردہ اور محتاج وسائل ہے۔ دوسرے رشتے کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا اِلٰہ (= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا معروضِ حُسن و عشق) ہے اور انسان اس کا عابد و پرستار اور اہلِ عشق و وفا اور بندۂ تسلیم و رضا ہے۔ بات جب بنتی ہے کہ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے خوش ہوں۔ "ہم رضائی" ایک طرف بندے کے سُرور و اطمینان اور تسلیم و رضا پر اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے رضوان پر، جو اس کی نعمتِ عظمیٰ ہے، دلالت کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "ہم رضائی" عبدیّت کی معراج اور اس کا ارفع ترین مقام اور اہلِ عشق و وفا کی آخری تمنّا ہے؛ نیز یہ اِلٰہ و ربّ کی مشیّت، اس کے دینِ فطرت اور حیاتِ انسانی کی غایت الغایات ہے۔

(۴) فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ (یعنی میرے بندوں میں شامل ہوجا) ربِّ کریم کے اس اِذن میں ایک تو پذیرائی و خوش آمدید کا اور دوسرے اس کی محبّت و شفقت اور کرم نوازی و "شکوری" کا رنگ پایا جاتا ہے۔ تیسرے، "عبادی" یا میرے بندے کہہ کر ربِّ جلیل و کریم نے ایک تو اس حقیقت کی نشاندہی کردی کہ جنّت میں صرف اس کے سچّے بندے ہی جائیں گے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یوں تو جملہ بنی نوعِ

انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، لیکن حقیقت میں اس کے بندے وہ ہیں جو مومن و فرماں بردار، اہلِ تسلیم و رضا، اہلِ حسن و سرور اور نفوسِ مطمئنّہ ہیں۔ علاوہ بریں، اللہ تعالیٰ کے بندوں کی صحبت و رفاقت ایسی نعمتِ عظمٰی ہے جو جنّت الفردوس ایسے بے مثال و قرّۃ العین جہانِ حسن و حیاتِ محض اور اس کی جملہ بے نظیر ولامتناہی نعمتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ربِّ حکیم نے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ کو وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ پر مقدّم رکھا ہے، اور یہ تقدیم بڑی ہی فکر انگیز و معنی خیز ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی، جنہیں قرآنِ مجید عبادالرحمٰن بھی کہتا ہے، رفاقت و صحبت کی افضلیت اور غیر معمولی افادیت و اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔

(۵) وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (= میری جنّت میں داخل ہو جا) : ربّ رحیم و کریم کی یہ دعوت بھی اس کی موہبت و رحمتِ بے قیاس کی آئینہ دار ہے۔ جَنَّتِیْ یا میری جنّت کہہ کر اپنے بندے کو جتلا دیا کہ "یہ جنّت تیرے ربّ کی ہے، لہٰذا تم اس کے وارث ہو، ہمیشہ اس میں رہو گے اور جو چاہو گے تمہیں ملے گا۔" اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی جنّت جمال و جلال اور بے مثال و بے قیاس نعمتوں کے لحاظ سے ایسی ہوگی، جس کا کوئی متنفّس خیال تک نہیں کر سکتا۔

ان تصریحات سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ سچی صلوٰۃ ہی سے اہلِ آرزو کو جنّتِ قرّۃ العین اور اس کی بے مثال و بے قیاس نعمتیں میسّر آئیں گی، نیز ان کی "آخری تمنّا" بھی پوری ہو جائے گی، لیکن یہ تمنّا ارتقائے مدام اور اتمامِ بے نہایت کے عالمِ جاوداں میں رہے گی۔ یہ نکتہ اربابِ ذوق و شوق اور اہلِ آرزو ہی جانتے ہیں کہ نفوسِ مطمئنّہ مفصلۂ ذیل صفاتِ حسنہ سے متّصف ہوتے ہیں۔

اوّل، نفسِ مطمئنّہ کا ربّ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ وہ غیر اللہ کو نہ تو ربّ اور نہ اسے اس کی صفتِ ربوبیّت میں شریک ہی سمجھتا ہے، چاہے وہ کتنی برگزیدہ و مقدّس

ہستی اور آستانہ کیوں نہ ہو۔ احوال و ظروف کتنے ہی نامساعد، صبر آزما اور شکیب رُبا کیوں نہ ہوں، معیشت کتنی تنگ کیوں نہ ہو جائے اور بظاہر امید کا سورج یاس کی گھٹاؤں میں چھپ کیوں نہ جائے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے اُمید باندھتا ہے نہ اسے امداد کے لیے پکارتا ہی ہے۔ وہ سب معبودانِ باطلہ سے منہ موڑ کر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی رحمت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کے قدم نہ تو ڈگمگاتے ہیں اور نہ وہ مایوس ہی ہوتا ہے۔ وہ پیکرِ صبر و توکّل بن کر اپنے ربِ رحمٰن کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھتا ہے۔ الغرض، وہ ہر حال میں اپنے اس عقیدۂ توحیدِ ربوبیّت پر قائم و دائم رہتا ہے کہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی اس کا رب یعنی رازق یا اَن داتا، حاجت روا و مشکل کشا، دستگیر و نصیر، وکیل و مولیٰ، شافی و معطی، ولی و محسن، حافظ و کارساز اور مستجیب الدّعوات ہے؛ اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اس عقیدے پر ثابت قدم رہنے کا صلہ کیا ملتا ہے، ربِ کریم کی زبان سے سُنیے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ...... جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(الاحقاف ۴۶: ۱۳-۱۴)؛ بلاشبہ جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے۔ یہی تو اہلِ جنّت ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ سورۂ حٰم السّجدۃ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے (حٰمٓ السّجدہ ۴۱: ۳۰ تا ۳۲)۔

یہ اجر اتنا عظیم ہے کہ انسان اس دُنیا میں اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ اگر اُسے جنّت کی حقیقت کا علم ہو جائے تو وہ اس کے حصول کی خاطر ہمیشہ اور ہر حال میں صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب سمجھے اور کبھی کسی کو اس کی اس صفت میں شریک نہ سمجھے، چاہے اُسے اس کے لیے جان تک کی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

دوم: نفسِ مطمئنّہ کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے رب ہی کی طرف دیکھتا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کی فکر و نظر اور عمل و کردار کا محور ذاتِ الٰہی ہی

ہوتا ہے۔ نظریات و اعتقادات کا معاملہ ہو یا اعمال و عبادات کا، انفرادی و خاندانی اور عمرانی و ملّی زندگی کا معاملہ ہو یا بین الاقوامی زندگی کا، وہ فیصلے اور احکام کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے اور جو کچھ بھی اس کے احکام ہوں انہیں برضا و رغبت قبول کر لیتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ وہ شرعی و عباداتی اختلافات کی صورت میں نہ تو غیر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہ اس کے فیصلے کو تسلیم ہی کرتا ہے۔

سوم: نفسِ مطمئنّہ کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ بندہ تسلیم و رضا اور اللہ تعالیٰ اس کا معروضِ حسن و عشق ہوتا ہے، اس لیے اس کا شکر گزار، مدّاح اور ذاکر و عابد بندہ ہوتا ہے؛ اور اس کا ربّ بھی اس سے خوش رہتا ہے۔ بندہ اپنے ربّ سے خوش ہو تو نفس کو جو طمانیّت و مسرّت ملتی ہے اس کا تجربہ نفسِ مطمئنّہ ہی کو ہوتا ہے۔

چہارم: اہلِ حسن و سُرور کی صحبت و رفاقت میں رہنا نفسِ مطمئنّہ کا شعارِ زندگی ہوتا ہے؛ لہٰذا وہ اشرار کی صحبت و رفاقت سے گریزاں و ترساں رہتا ہے۔ اس کا صلہ اُسے یہ ملتا ہے کہ حیاتِ اُخروی میں بھی اس کا ربِّ کریم اُسے اپنے اہلِ حسن و سُرور بندوں کی صحبت و رفاقت میں رکھے گا۔ اہلِ حسن و سُرور کے قرآنِ حکیم کی رُو سے چار گروہ ہیں: نبیّینؑ، صدیقین، شہدآء اور صالحین۔

یہاں یہ سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ طمانیّتِ قلب و نفس کا ذریعہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، لیکن یاد دہانی کے طور پر اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ طمانیّتِ قلب و جاں کا ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے (الرعد ۱۳: ۲۸)؛ جس کی اکمل و احسن صورت حسنِ صلوٰۃ ہے۔ ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ صلوٰۃ حسین و موثّر اس وقت بنتی ہے جب اس کا نظام قائم ہو، اور اسے حضوریِ قلب کے ساتھ قرۃ العین سمجھ کر قائم کیا جائے؛ نیز اس کے فرائض اور تقاضوں کو احسن طریق سے پورا کیا جائے۔ حسنِ صلوٰۃ کے کثیر فوائد و فیوض میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) امراضِ قلب سے شفا (۲) خوف و حزن، احساسِ تنہائی کے کرب اور عذاب النّار

سے نجات (۳) دُنیوی و اُخروی حسنہ، فلاح، قُرب و رضوانِ "دوست"، حسنِ زندگی اور جنّت کا حصول۔ (۴) نُور کی تکمیلِ مدام یا جا لیاتی اِرتقاء (۵) اطمینانِ قلب و قرارِ جاں۔

شعورِ اجتماعیّت

صلوٰۃ باجماعت کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے شعورِ اجتماعیت بیدار ہوتا اور نشو ونما پاتا ہے۔ شعورِ اجتماعیت کا مطلب وحدتِ اسلامی یا اس حقیقت کا شعور ہے کہ جملہ مُسلم افراد و اقوام اُمّتِ مُسلمہ یا اُمّتِ واحدہ ہیں؛ اور ان کا دین ایک ہے، یعنی اس میں وحدت پائی جاتی ہے۔ اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کا دین، اِسلام یا دینِ توحید ہے؛ لہٰذا اس کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ میں وحدت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جملہ مُسلم افراد و اقوام کا اِلٰہ و ربّ ایک ہے اور وہ تنہا اللہ تعالیٰ ہے؛ ان کا رسول ایک ہے اور خاتم النبیّین و رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں؛ ان کی الہامی یا سماوی کتاب بھی ایک ہے اور وہ زندہ و لافانی قرآنِ عظیم ہے؛ نیز ان کا قبلہ ایک ہے، جو بیت اللہ یا حرم شریف ہے۔ علاوہ بریں، مسلمان جملہ انبیاء و رسل علیہم السّلام اور ان کے سماوی صحائف و کتب؛ نیز ملائکہ، آخرت یعنی یوم الدّین اور جنّت و دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کی وحدت کا، نیز باہمی اخوّت و محبّت، اِتّحاد و یکجہتی، وحدتِ اُمّت یا اجتماعیّت کا شعور بیدار کرنے میں صلوٰۃ باجماعت کا قیام از بس اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس جگہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل و محرّکات ہیں، جن کے باعث اس وقت دُنیا میں مُسلم افراد و اقوام میں شعورِ اجتماعیّت کا قریب قریب فُقدان ہے، حالانکہ ان میں صلوٰۃ باجماعت قائم کرنے والوں کی بہت زیادہ کمی بھی نہیں؟ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں شعورِ اجتماعیّت کے فُقدان کے اسباب وہی ہیں جو اُن میں نظم و ضبط اور سمع و اطاعت کے

فُقدان کے ہیں اور وہ زیرِ بحث بھی آ چکے ہیں، لہٰذا ان کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہو گا۔ البتہ نفسیاتِ انسانی کا یہ اصل الاصول دُہرائے بغیر دل نہیں مانتا کہ معاشرہ سرطان گزیدہ ہو جائے تو مومنین و صالحین کی قلیل تعداد کے سوا افراد کی اکثریت کو اپنے معروضِ حُسن و عشق، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حسنِ زندگی، مادّی و جمالیاتی اِرتقاء، حُسنُ المآب اور حسنِ انقلاب کی آرزو نہیں رہتی۔ چونکہ مُسلم معاشرے سرطان گزیدہ ہیں، لہٰذا ایک تو مسلمان صلوٰۃ کی حقیقت اور اس کی غیر معمولی افادیت و اہمیت سے کم آشنا ہیں، اور دوسرے انہیں اس کی افادی و جمالیاتی اقدار سے مستفیض ہونے کا دماغ ہے نہ آرزو۔ اس کے نتیجے میں صلوٰۃ نہ تو ان کے لیے قُرّۃُ العین ہے نہ مادّی و جمالیاتی ارتقاء کا ذریعہ؛ نیز ان کو شعورِ اجتماعیت بھی نہیں ہے۔ علاوہ بریں، مُسلم اقوام میں ملکی، قومی، لسانی، مذہبی، قبائلی اور علاقائی عصبیّت کا پایا جانا اور اس بنا پر متخاصم و متخالف اور برسرِ پیکار ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں اِجتماعیت اور اس کی غیر معمولی اہمیت و افادیت کے شعور کا فُقدان ہے۔

تاریخی عمل پر غور و خوض اور تفکّر فی القُرآن کرنے کی بدولت اہلِ نظر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستانی قوم سمیت جملہ مُسلم اقوام کے اس ایک مرضِ کہنہ کا کیا، جملہ نفسیاتی معاشرتی سرطانی امراض کا علاج فقط ایک ہے اور وہ ہے: اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے ذریعے حسنِ انقلاب لانا، معاشرتی سرطانوں اور سرطانی اداروں کا اِستیصالِ کُلّی کرنا اور پھر پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق مسلم معاشروں کی تشکیل و تعمیرِ نو کرنا۔ یہ یاد رہے کہ حسنِ انقلاب کی ایک پیش شرط ہے اور وہ ہے حُسنِ آرزو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت اس قوم، ملک اور معاشرے میں انقلاب لاتی ہے، جس کے افراد میں اس کی زندہ و جلیل اور حُر کی آرزو ہوتی ہے۔ اسے سچّی آرزو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ آرزو ہمیشہ حُسنِ عملِ پیہم، اور اجتہاد و جہاد سے معتبر یا سچّی بنتی ہے۔ یہ حسنِ انقلاب کا اصل الاصول ہے، جسے تلمیذ القرآن قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

فلاسفہ کے نزدیک انقلاب دو قسم کا ہوتا ہے: تدریجی یا ارتقائی، جسے انگریزی میں (EVOLUTION) اور دوسرا مفاجاتی انقلاب جسے انگریزی میں (REVOLUTION) کہتے ہیں۔ اس نظریے میں ایک سُقم ہے، جسے فلسفے کی زبان میں منطقی التباس یا مغالطہ اور انگریزی میں (LOGICAL FALLACY) کہتے ہیں۔

انقلاب کا اصل الاُصول یہ ہے کہ پہلے دلوں میں اس کی آرزو کا بیج پڑتا ہے۔ اگر اس تخمِ آرزو کا تغذیہ ہوتا رہے تو یہ نشوو ارتقاء کرتے کرتے تناور و بار آور شجر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ وقت قدرت کی نظر میں اِتمامِ آرزو کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا قانونِ احترامِ آرزو حرکت میں آجاتا ہے۔ اس اعتبار سے انقلاب تدریجی یا اِرتقائی بھی ہوتا ہے اور مفاجاتی بھی؛ لہٰذا انقلاب ارتقائی۔ مفاجاتی ہوتا ہے۔ جہاں تک صلوٰۃ کا تعلق ہے وہ حسنِ انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، بشرطیکہ اس کا نظام ہو اور وہ سچی ہو، یعنی نمازی اس کی حقیقت، نیز اس کے فرائض اور تقاضوں کا شعور رکھتے، اور انھیں پورا کرتے ہوں۔

مسجد میں پانچ وقت اہلِ ایمان کا اجتماع ہوتا ہے؛ نیز وہ ان کی تعلیمی، معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے، لہٰذا ان کے ایک ساتھ صلوٰۃ قائم کرنے کی بدولت ان میں شعورِ اجتماعیت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، بشرطیکہ معاشرے میں اسلامی حکومت کے زیرِ اہتمام نظامِ صلوٰۃ قائم ہو اور احسن طریقے سے اپنے وظائف سر انجام دیتا ہو۔

اخوّت ومساوات اور آزادی

غور کریں تو صلوٰۃ کی ہیئتِ ترکیبی میں اخوّت ومساوات اور آزادی کی صورتیں مضمر ہیں۔ تمام نمازی ایک ہی پیش امام کے پیچھے بلا امتیاز کھوے سے کھوا ملائے بیک وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور قیام وقعدہ اور رکوع وسجود کرتے ہیں تو ان کی یہ حرکات وسکنات ان کی اخوّت ومساوات اور حُریّت کی مظہر ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مظہر اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی صرف ربّ العالمین کے جمالیاتی تخلیقی شہکار، عیال و پروردہ، محتاج وسائل اور بندے ہیں، لہٰذا صرف اُسی کے حُکم کے مُکلف، عابد اور پرستار ہیں، نیز جہاں تک غیر اللہ کا تعلّق ہے وہ آزاد ہیں اور آزادی ان کا انسانی حق ہے۔ چنانچہ کوئی فرد، جماعت، قبیلہ یا قوم انہیں اپنا محکوم وغلام نہیں بنا سکتی اور نہ ان پر اپنا حُکم چلا سکتی اور نہ انہیں اپنی بندگی پر مجبور ہی کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ مصلّین یا نمازیوں میں اس حقیقت کا شعور ویقین پیدا کرتی ہے کہ وہ سب برابر، بھائی اور آزاد ہیں، لہٰذا انہیں صرف مسجد ہی میں نہیں، بلکہ اس کے باہر معاشرتی زندگی کے ہر گوشے میں بھی اخوّت ومساوات اور آزادی کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ صلوٰۃ کا یہ از بس اہم تقاضا ہے، جسے پورا کرنے کے جُملہ اہلِ ایمان خصوصاً مصلّین یا نمازی مُکلّف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان صلوٰۃ قائم کرنے کے باوجود اخوّت ومساوات اور حریّت کا مظاہرہ نہیں کرتے، یعنی دوسروں کو اپنا بھائی، اپنے جیسا اور آزاد نہیں سمجھتے؛ نہ ان کے ساتھ بھائیوں ایسا مساویانہ سلوک کرتے اور نہ ان کی عزّت وناموس اور آزادی کا پاس و احترام ہی کرتے ہیں، وہ صلوٰۃ کا یہ تقاضا پورا نہیں کرتے؛ لہٰذا ان کی صلوٰۃ سچّی ہوتی ہے نہ وہ خود سچے مصلّین ومؤمنین ہی ہوتے ہیں۔ یہ کتنی عبرتناک واقعیت ہے کہ پاکستان سمیت

کسی مسلم ملک میں اخوت و مساوات اور آزادی کے مظاہر دکھائی نہیں دیتے۔ یہ دیکھ کر دو سوال پیدا ہوتے ہیں: اوّلاً، عصرِ حاضر کی مُسلم اقوام صلوٰۃ کا یہ ازبس اہم تقاضا کیوں پورا نہیں کرتیں؟ ثانیاً، آیا عالمِ اسلام میں کوئی دور ایسا بھی گزرا ہے جس میں اخوت و مساوات اور حریت مسلمانوں کا شعارِ زندگی رہا ہو؟ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں مُسلم اقوام پر سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا تسلّط ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بالخصوص اخوت و مساوات اور آزادی مسلمانوں کا شعارِ زندگی تھا۔ اس واقعیت پر تاریخ، احادیثِ طیبہ اور آثار سے استشہاد کر سکتے ہیں۔ ان کی بنیادی وجہ جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ تھی کہ ان زرّیں ادوار میں اسلامی مملکت میں سرطانی اداروں کا فقدان تھا، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم تھے۔

قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کے اسلامی معاشرے میں مواخاۃ یا کفالتِ اجتماعیہ، مساوات، آزادی، تکریم انسانی اور مفت و بلا تاخیر عدل ایسے حقوقِ انسانی اس لیے سب کو میسّر تھے کہ اس میں اسلام کے متذکرۂ بالا چاروں اساسی نظام قائم تھے اور اپنے وظائف احسن طریق سے سرانجام دیتے تھے۔

نظم وضبط

یہ بڑی عبرت انگیز واقعیت ہے کہ آج کا عام مسلمان اوّل تو یہ حقیقت جانتا ہی نہیں، اور اگر جانتا بھی ہے تو عملاً مانتا نہیں کہ صلوٰۃِ پنجگانہ کے باجماعت قیام کا ایک اذبس اہم فائدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ نمازیوں کو نظم وضبط (DISCIPLINE) سکھاتی، ان میں اس کی غیر معمولی افادیت واہمیت کا احساس وشعور پیدا کرتی اور اس کی عملی تربیت دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلم اقوام میں، جن میں آج بھی صلوٰۃ باجماعت قائم کرنے والے افراد خاصی تعداد میں موجود ہیں، نظم وضبط کا فقدان ہے اور اس باعث وہ بدنام زمانہ ہیں؛ بخلاف اس کے، مغرب کی غیر مسلم ترقی یافتہ اقوام نظم وضبط کی اس قدر خوگر ہو چکی ہیں کہ کوئی جگہ، مقام یا موقع ومحل ہو، قطار بند ہونا اور اپنی جگہ پہ اپنی باری کا انتظار کرنا، نیز اجتماعی زندگی کے اُصول وضوابط ہوں یا شہری زندگی کے قوانین، ان کا احترام اور پابندی کرنا اور ہر حال میں منظّم ومنضبط رہنا ان کا شعارِ زندگی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نظم وضبط ان کی اجتماعی زندگی کی امتیازی خوبی اور ان کے قومی تشخص کی پہچان ہے۔

مُسلم اقوام میں نظم وضبط کے فُقدان کے متعدّد عوامل ومحرّکات ہیں، جن سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، پھر بھی چند ایک کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا ایک بنیادی سبب ناخواندگی ہے، جس کی شرح فی صد عبرت انگیز اور شرمناک حد تک زیادہ ہے؛ حالانکہ دُنیا میں جتنے بھی ادیان ومذاہب اور اِزمز (ISMS) ہیں، ان میں اسلام واحد دین ہے، جس میں ہر ایک مُسلم مرد اور عورت پہ علم حاصل کرنا فرض ہے؛ اور اس فرض کی اہمیت یہ ہے کہ ہر مسلمان کو مہد سے لحد تک علم حاصل کرتے رہنے یعنی طالب علم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہمارے ظُلم وجہل اور سرطان زندگی کا نتیجہ ہے کہ علم کی فرضیت کے

باوجود بہت کم مسلمانوں میں علم کی طلب و جستجو پائی جاتی ہے؛ اس کے نتیجے میں ناخواندہ کم علم افراد کا تناسب تشویش ناک و شرمناک حد تک زیادہ ہے۔ پھر بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو اپنے زعم میں "فارغ التحصیل" (یہ محولۂ بالا ارشاداتِ نبوی کی رو سے غلط اصطلاح ہے) ہونے کے بعد بھی طالبِ علم یعنی علم کی طلب و جستجو میں رہتے ہیں۔ ظلم و جہل کی حد تو یہ ہے کہ اس پر بھی جو لوگ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ عالیہ پر عمل نہیں کرتے یا جزوی طور پر کرتے ہیں، اپنے آپ کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہی نہیں، عاشق سمجھتے، کہتے اور کہلاتے ہیں۔ اس جہلِ مرکب کے بہت سے عوامل و محرکات ہیں، جن میں معاشرتی سرطانیت، قرآن و سنہ سے کم آگاہی، نظامِ تعلیم میں نصابِ قرآن کا فقدان سرِ فہرست ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد آمرانہ ملوکیت کا دورِ استبداد آیا تو اسلامی معاشرے میں سرطانی ادارے قائم ہو گئے، جنہوں نے اپنے مفادات و اغراض کی خاطر مسلمانوں کو قرآنِ مجید سے دور و مہجور اور انہیں اس کے احکام و تعلیمات اور اوامر و نواہی سے نا آشنا یا کم آشنا رکھنے کے لیے نظامِ تعلیم سے نصابِ قرآن اور قلم کو خارج کر دیا، اور آیاتِ قرآنی کی غلط تاویل کرنے اور اپنے مطلب کی موضوع احادیث کی تشہیر بالباطل کرنے لگے۔ پھر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ تاویل بالباطل اور تشہیر بالباطل کے ابلیسی فنون ایجاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ چاروں سرطانی (یعنی فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری) ادارے اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ و قرآن اور بندوں کے دشمن ہیں۔ چونکہ لوگوں کو علم کی روشنی و توانائی (= سلطان) سے محروم کیے بغیر وہ انہیں نہ تو اپنے محکوم و غلام، مطیع و فرماں بردار اور محتاج و دست نگر بنا سکتے تھے اور نہ ان کو ان کے انسانی حقوق سے محروم کر کے ان کا استحصال ہی کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے عوام کی تعلیم و تربیت کا بندوبست نہ کیا، بلکہ انہیں ناخواندہ، جاہل، بے ہنر اور روحِ قرآن و حسنِ زندگی سے نا آشنا رکھنے کی خاطر ابلیسانہ ہتھکنڈوں، طاغوتی سازشوں اور جادویاتی و شیطانی فریب کاریوں سے کام لیا۔ یہ آمرانہ و مستبد حکمران اور اس کے معاون سرطانی اداروں کی

مجبوری تھی، جو آج بھی ہے اور کل بھی ہو گی۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں کلمۂ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ پر ایمان لانا ناگزیر ہے؟

کلمۂ توحید میں "لا" علامت ہے جملہ معبودانِ باطلہ، معاشرتی سرطانوں اور سرطانی اداروں کی نفی و تکذیب کی؛ نیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلمہ گو کے اس عہد و میثاق اور اپنے اس عزم بالجزم کے اظہار کی کہ "ہم غیر اللہ کو، چاہے وہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں میں سے ہو یا زندہ و مرحوم برگزیدہ ہستیوں میں سے، چاہے وہ زندہ و بے جان اسمائے بے مسمیات میں سے ہو یا مظاہرِ فطرت میں سے، کسی کو اپنا الٰہ و ربّ مانیں گے نہ بنائیں گے اور نہ انھیں اللہ تعالیٰ کی ذات، صفاتِ اُلوہیت و ربوبیت اور کاروبارِ خدائی میں شریک ہی سمجھیں گے؛ لہٰذا ان کو پکاریں گے نہ ان سے مدد مانگیں گے اور نہ ان کو اپنا کارساز و حاجت روا اور حافظ و ناصر ہی سمجھیں اور بنائیں گے"۔

اِس کلمۂ توحید کا دوسرا لفظ "اِلاَّ" علامت ہے اِثبات کی؛ یعنی کلمہ گو کے اس عہد و پیمان اور عزم بالجزم کی کہ "اللہ تعالیٰ ہی تنہا میرا الٰہ و ربّ ہے، لہٰذا میں صرف اسی کی عبادت یعنی بندگی کروں گا؛ اسی کو اپنا مولیٰ و نصیر اور کارساز و حاجت روا اپنے لیے کافی سمجھوں گا؛ نیز اسی کے احکام کو مانوں اور ان پر عمل کروں گا"۔ اکثر موحّد و متّقی اہلِ ایمان یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں ایک طرف تو مسلمان عشقِ رسول کا دم بھرتے اور سنّتِ رسول پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور دوسری طرف وہ تحصیلِ علم سے متعلّق بالخصوص ارشاداتِ نبویؐ پر عمل نہیں کرتے، بلکہ ان کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور عمر بھر ناخواندہ و محرومِ قلم رہتے ہیں؛ نیز کیوں نام نہاد علما اس زعم میں کہ وہ "فارغ التحصیل" ہیں، لحد تک طالبِ علم نہیں رہتے؟ یہ جہلِ مرکب ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ ان میں قرآنِ حکیم کی عظمت و برکات اور اس کے نصابِ تعلیم کی غیر معمولی جمالیاتی ۔ افادی اقدار کے شعور کا فقدان ہے؛ جس کا نتیجہ "بے یقینی" اور اللہ تعالیٰ اور اس کے زندہ و محفوظ کلامِ آخر سے دُوری و مہجوری ہے۔ ہمارے اس موقف کا زندہ ثبوت

جملہ مسلم اقوام کے تعلیمی نظام، خصوصاً پاکستان کا تثلیثی نظامِ تعلیم ہے، جن میں نصابِ قرآن شجرِ ممنوعہ ہے۔ یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ صلوٰۃ نظم و ضبط سکھاتی ہے اور مسلمانوں میں اس کے فقدان کے عوامل و محرکات کیا ہیں؟ ان عوامل میں سے ایک ناخواندگی ہے، جس سے بحث ہو چکی ہے اور دوسرا سبب سورۂ ماعون کی ان آیاتِ جلیلہ میں مضمر ہے:
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ٥ (۱۰۷: ۴ تا ۶) یعنی نامرادی و بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی صلوٰۃ کے فرائض و لوازمات اور تقاضوں سے غافل و بے پروا ہیں اور ریاکاری کرتے ہیں۔

ان آیاتِ جلیلہ سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ مسلم اقوام میں نظم و ضبط کے فقدان کا دوسرا بنیادی سبب نمازیوں کی صلوٰۃ کی حقیقت و اہمیت، غرض و غایت، لوازم و مقتضیات اور دُنیوی و اُخروی فوائد سے غفلت و بے پروائی، نیز ریاکاری ہے۔ اس کے نتیجے میں صلوٰۃ سے کما حقہٗ استفادہ کرنے کا انھیں دماغ ہے نہ طلب و جستجو۔ ظاہر ہے جس شے کی آرزو ہی نہ ہو وہ مل کیسے سکتی ہے؟ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں مسلمان صلوٰۃ کے فوائد و ثمرات سے محروم ہیں، جن میں سے ایک "نظم و ضبط" ہے، اور جس کے فقدان کے باعث مسلم معاشروں میں فساد اپنی نمود رکھتا ہے۔

سمع وطاعت

سمع وطاعت قرآنِ مجید کی دو ازبس اہم اصطلاحات ہیں۔ یہ دونوں عبد کی صفات اور عبودیت کا خاصّہ ہیں۔ عبد کا کام اپنے آقا و حاکم کا حکم سننا اور ماننا ہے۔ آقا کے حکم کی تعمیل میں ردّ و قدح یا حیل و حجّت کرنا غلام و محکوم کا منصب نہیں۔ اس کا فرضِ منصبی حکم کی بلاچون وچرا تعمیل کرنا ہے۔ انگریزی کے ایک شاعر نے سمع وطاعت کے مفہوم کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کا مصرع ہے: THERE IS NOT TO REASON WHY? THERE IS BUT TO DO AND DIE؛ یعنی حکم کی تعمیل میں حیل و حجّت یا توجیہہ نہیں، بلکہ امتثالِ امر اور جان دے دینا ہے۔ اب ان سے فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے۔

(۱) سمع:

انسان کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اس کا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام ہے۔ حسّی نظام میں سامعہ اور باصرہ اپنے وظیفے (FUNCTION) اور کارکردگی کی بنا پر اہم ترین حیثیت رکھتی ہیں۔ تہذیبِ اخلاق میں سب سے پہلے سامعہ کی تہذیب کی جاتی ہے تاکہ نوآموز کو "سننا" آجائے۔ اس کا مطلب گوشِ حق نیوش کا توجہ، حُسنِ نیّت اور اس آرزو سے سُننا ہے تاکہ حق و صداقت، علم و حکمت اور حسنہ و خیر کی باتوں سے استفادہ کیا اور حرزِ جاں بنایا جائے۔ سچّے طالبِ علم و ہنر، سچّے متبع اور سچّے تلامذہ کی صفت یہ ہوتی ہے کہ سمع وطاعت ان کا شعار ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک وہ لوگ جو "سمع" کی نعمتِ عظمٰی کی قدر نہیں کرتے اور اس سے وہ کام نہیں لیتے جو لینا چاہیے، وہ چوپاؤں کی طرح ہوتے ہیں، بہرے، گونگے اور اندھے، اور کسی بات کو وہ سمجھتے ہی نہیں (البقرۃ ۲:۱۷۱)۔

سورۂ انفال میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ (الانفال ۸: ۲۰-۲۱): اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت یعنی فرمانبرداری کرو، اس سے روگردانی نہ کرو، درآنحالیکہ تم صدائے حق سنتے ہو اور دیکھو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سنا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سنتے نہ تھے (کیونکہ ان میں قبولیتِ حق کی آرزو ہی نہ تھی)۔

اللہ تعالیٰ ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی صراحت کر دیتا ہے کہ "سننا اور ماننا"، اگر انسانیت کا خاصہ ہے تو شنوائی و گویائی کی قوت سے محرومی چوپاؤں کی خصلت ہے اور ایسی خصلت کے مالک انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوتے ہیں۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (الانفال ۸: ۲۲): یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیاتیاتی مخلوق وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے جب یہ حقیقت اور یقیناً حقیقت ہے تو پھر اہلِ ایمان پر لازم ہوا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوتِ حق کو گوشِ حق نیوش سے سنیں، جو انہیں "زندگی" دینے والی ہے اور اُسے قبول کریں۔ قرآنِ حکیم کی زبان میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ (الانفال ۸: ۲۴): اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسولؐ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے، اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔

ایمان و حُسنِ عمل کی دعوت کا جواب دینے اور قبول کرنے سے پہلے اس کا "سننا" لازم

آتا ہے؛ لہٰذا "سُننا" حسنِ انقلاب، حسنِ زندگی اور دُنیوی و اُخروی حسنہ حاصل کرنے کے لیے انسان میں ذوق و شوقِ سمع کا ہونا ناگزیر ہے قرآنِ مجید کی رُو سے ذوق و شوقِ سمع انسان کے زندہ ہونے پر اور اس کا فقدان اس کے مردہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ (النمل ۲۷: ۸۰): تم مردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں تک اپنی پکار یا دعوت پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں۔ ان لوگوں کے بارے میں جو سمع اور قلب (عقل و فکر وغیرہ) سے کام نہیں لیتے، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ چوپاؤں سے بدتر اور گئے گزرے ہیں اور ان کا انجام عذاب النار ہوگا:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (الاعراف ۷: ۱۷۹): اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنّم کے لیے پیدا کیا ہے (یعنی انجام کار ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اس جرم کی پاداش میں کہ) ان کے پاس قلوب (یعنی دل و دماغ کے نظام) ہیں، مگر وہ ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (حسّی۔ قلبی نظام کو معطل و ناکارہ کرکے) چارپایوں ایسے ہو گئے ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔

انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں سمع، بصر اور عقل انتہائی اہم اور امتیازی قوتیں ہیں؛ جو اُسے دیگر حیاتیاتی مخلوقات سے ممیّز کرتی ہیں۔ یہ ربِّ عظیم و کریم کی اتنی حسین و عظیم نعمتیں ہیں، جو اُسے انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز کرتی اور ان کے ذریعے وہ کائنات کی تسخیر کرتا، مادّی و جمالیاتی ارتقا کرتا؛ خیر و شر، حسنہ و سیئہ، حُسن و قبح، حق و باطل، توحید و شرک اور ایمان و کفر

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۚ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝ (الانفال ۸: ۲۰-۲۱) : اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت یعنی فرمانبرداری کرو؛ اس سے روگردانی نہ کرو، درآنحالیکہ تم صدائے حق سنتے ہو اور دیکھو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے (زبان سے) کہا : ہم نے سنا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سنتے نہ تھے (کیونکہ ان میں قبولیتِ حق کی آرزو ہی نہ تھی)۔

اللہ تعالیٰ ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی صراحت کر دیتا ہے کہ "سننا اور ماننا" اگر انسانیت کا خاصہ ہے تو شنوائی و گویائی کی قوت سے محرومی چوپاؤں کی خصلت ہے اور ایسی خصلت کے مالک انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوتے ہیں۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (الانفال ۸: ۲۲) : یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیاتیاتی مخلوق وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قرآنِ حکیم کی رو سے جب یہ حقیقت اور یقیناً حقیقت ہے تو پھر اہلِ ایمان پر لازم ہوا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوتِ حق کو گوشِ حق نیوش سے سنیں، جو انہیں "زندگی" دینے والی ہے اور اسے قبول کریں۔ قرآنِ حکیم کی زبان میں

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ وَاَنَّہٗٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (الانفال ۸: ۲۴) : اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسولؐ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے، اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔

ایمان و حسنِ عمل کی دعوت کا جواب دینے اور قبول کرنے سے پہلے اس کا "سننا" لازم

آتا ہے: لہٰذا اُسُننا حسنِ انقلاب، حسنِ زندگی اور دُنیوی و اُخروی حسنہ حاصل کرنے کے لیے انسان میں ذوق و شوقِ سمع کا ہونا ناگزیر ہے قرآنِ مجید کی رُو سے ذوق و شوقِ سمع انسان کے زندہ ہونے پر اور اس کا فقدان اس کے مردہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ○ (النمل ۲۷: ۸۰) :تم مردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں تک اپنی پکار یا دعوت پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں۔ ان لوگوں کے بارے میں جو سمع اور قلب (عقل و فکر وغیرہ) سے کام نہیں لیتے، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ چوپاؤں سے بدتر اور گئے گزرے ہیں اور ان کا انجام عذاب النار ہوگا:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۱۷۹) : اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنّم کے لیے پیدا کیا ہے (یعنی انجام کار ان کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا، اس جرم کی پاداش میں کہ) ان کے پاس قلوب (یعنی دل و دماغ کے نظام) ہیں، مگر وہ ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (حسّی۔قلبی نظام کو معطل و ناکارہ کر کے) چارپایوں ایسے ہو گئے ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔

انسان کے حسّی۔قلبی۔نفسی نظام میں سمع، بصرہ اور عقل انتہائی اہم اور امتیازی قوتیں ہیں، جو اُسے دیگر حیاتیاتی مخلوقات سے ممیّز کرتی ہیں۔ یہ ربِّ عظیم و کریم کی اتنی حسین و عظیم نعمتیں ہیں، جو اُسے انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز کرتی اور ان کے ذریعے وہ کائنات کی تسخیر کرتا، مادّی و جمالیاتی ارتقاء کرتا، خیر و شر، حسنہ و سیئہ، حُسن و قبح، حق و باطل، توحید و شرک اور ایمان و کفر

میں امتیاز کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں (نبیین ؑ، صدیقین، شہدآء اور صالحین) کی راہِ راست پر چل کر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ انسان کی منزلِ مقصود اور حسنُ المآب جنت ہے، جو اس کے معروضِ حسن و عشق کی جائے لقاء ہے۔ ان نعمتوں کی قدر دانی کا نتیجہ اگر جنت ہے تو اس کے کفران کا انجام جہنم کا عذابُ النار ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متنبہ کر دیا ہے کہ ان اہم ترین قوائے ثلاثہ کا مواخذہ ہوگا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۳۶): جس بات کا تمہیں علم نہیں، اس کے پیچھے نہ لگو۔ یقیناً سمع، بصر اور عقل سب کا مواخذہ ہونے والا ہے۔

اس بحث سے ثابت ہوا کہ ہمارے حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں سے خصوصاً سمع ہماری دنیوی و اُخروی زندگی کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہماری دنیوی و اُخروی کامیابی کے لیے ہمیں حکم دیتا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (المائدہ ۵: ۱۰۸): اللہ کا تقویٰ کرو (= اس کی آرزو کرو اور اس کی نافرمانی سے ڈرو) اور (اس کے احکام و تعلیمات اور علم و حکمت کی باتوں کو) سنو! اللہ نافرمانی کرنے والوں کو (ان کے غلط رویے کی وجہ سے) اپنا راستہ نہیں دکھاتا (جس کی وجہ سے وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہیں سکتے اور ناکام و نامراد رہتے ہیں)۔

صلوٰۃ کے حوالے سے سمع پر مزید بحث کرنے سے پہلے طاعت کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔ سمع کا مطلب انسان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو اس ارادے سے سننا ہے کہ وہ ان پر عمل کرے گا۔ اس اعتبار سے سمع و طاعت لازم و ملزوم ہیں، اور دونوں ہماری مادی و حیاتیاتی ترقی و کامیابی کے لیے غایت درجہ اہمیت رکھتی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ ...... فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ہ (آلِ عمران ۳ : ۳۱-۳۲) : (اے نبیؐ) ان لوگوں کو کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی یا اطاعت کرو (اس کے نتیجے میں) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔ (اے پیغمبرؐ!) تم ان سے کہہ دو کہ (فلاح و کامیابی کی راہ تمہارے لیے یہی ہے کہ تم) اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو پھر اگر یہ لوگ اطاعت سے روگردانی کریں تو اللہ یقیناً کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(ب) **اطاعت** (مادّہ ط و ع) : الطَّوْعُ کے بنیادی معنی ہیں : بطیبِ خاطر کسی کے ساتھ لگ جانا اور اس کا فرمانبردار ہو جانا (ابن فارس)۔ اس کے مقابلے میں کَرْهًا آیا ہے؛ جس کے معنی ہیں : کسی کام کو ناگواری اور دل پر جبر کر کے کرنا (حٰمٓ السجدۃ ۴۱ : ۱۱)۔ المفردات میں ہے : " طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ وَاَطَاعَهٗ يُطِيْعُ کے معنی ہیں، کسی کی کشادہ دلی اور بطیبِ خاطر فرمانبرداری کرنا۔" یہی مطلب ہے اس آیۂ جلیلہ کا :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النسآء ۴ : ۸۰) : "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے حقیقت میں اللہ کی اطاعت کی۔" اسی سورۃ میں ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ہ (النسآء ۴ : ۵۹) : اے مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں سے حکم اور اختیار رکھتے ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو (اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اُسے تسلیم کر لو)۔ اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح اور بہتر طریق کار یا راہِ عمل ہے؛ اور انجام کے لحاظ

یہ احسن بھی ہے۔

اسلام میں مطاعِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے؛ لہٰذا اس کے احکام کی برضا و رغبت اطاعت لازم ہے۔ چونکہ اس کے رسولؐ کی سیرت و سنّت اس کے احکام کی زندہ و احسن تفسیر ہوتی ہے، لہٰذا رسولؐ بھی اس لحاظ سے مطاع ہوتا ہے؛ اور اس کے احکام کی اطاعت فرض ہوئی۔ چونکہ نظامِ زندگی کو احکامِ الٰہیہ کے مطابق چلانے کے لیے حکومت ناگزیر ہے، لہٰذا احکامِ الٰہیہ کو ماننے والوں (مِنکُمْ کا یہی مطلب ہے) کے احکام کی تعمیل، جو دراصل احکامِ الٰہیہ کی تعمیل ہے، لازم ہوئی۔ حکّام کے احکامِ الٰہیہ کی تاویل میں خطا بھی ہو سکتی ہے یا وہ شعوری و غیر شعوری طور پر ایسا حکم بھی دے سکتے یا آئین و قانون بھی نافذ کر سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور سنّتِ رسولؐ کے منافی ہو تو ایسی صورت میں مسلم رعایا میں اختلاف و نزاع بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا آیا ہے۔ اس صورتِ حال میں قرآنِ مجید کا فتویٰ یہ ہے کہ احکامِ الٰہیہ اور سنّتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرنا فرض ہے۔ بالفاظِ دیگر، کتاب و سنّہ کی روشنی میں باہمی اختلافات کو دور کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

تہذیب و تحسینِ اخلاق اور تعمیر و تکمیلِ شخصیّت میں سمع و طاعت انتہائی اہم و مؤثّر کردار ادا کرتی ہیں؛ اور سمع و طاعت کی غیر معمولی اہمیّت کا شعور بیدار کرنے اور غازیوں کو ان کا عادی بنانے میں نظامِ صلوٰۃ کی اہمیّت اس سے بہت زیادہ ہے، جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور سنّتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی میں، مؤذّن کی دعوت سنتے ہی مسجد میں آنا، اس کی قرأت سننا اور اس کے اتّباع میں ارکانِ صلوٰۃ کو ادا کرنا، سمع و طاعت کی بہترین مشق و مزاولت ہے۔ انسان سمع و طاعت کا خوگر ہو جائے تو مسجد کے علاوہ گھر میں والدین، محلّے یا معاشرے میں بزرگوں سے، درس گاہوں اور تربیت گاہوں میں اساتذہ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں اپنے حکّام، افسروں وغیرہ کے احکام و نصائح کو غور و خوض سے سننا اور ان پر عمل کرنا، اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ انسان

احکام و قوانین کی پابندی کرنے کا خوگر ہو جائے تو وہ اچھا شہری کہلاتا ہے، جسے قرآنِ مجید "صالح" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ نمازیوں کو صالح بناتی ہے۔ صالحین کی صفاتِ حسنہ میں سمع و طاعت بھی آتی ہیں۔ صالح معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صالحین کی بھاری اکثریت ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی معاشرے میں جملہ مسلمان نمازی ہوتے ہیں، اس لیے ان کا صالح اور سمع و طاعت کا خوگر ہونا اور اس کے نتیجے میں ان کے معاشرے کا صالح ہونا، ضروری ہوا۔ ایسا معاشرہ مثالی ہوتا ہے، اور یہی اسلامی معاشرے کی منفرد خصوصیت ہے۔

ہمیں یہ اصلِ عظیم یاد رکھنی چاہیے کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے اسلامی معاشرے کی شناخت یہ ہے کہ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم ہوتے ہیں اور اربابِ اختیار بالخصوص اور دیگر افرادِ معاشرہ بالعموم ان نظاموں کو باحسن وجوہ چلانے میں اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔

نظامِ صلوٰۃ کا ایک بڑا فائدہ "سمع و طاعت" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باجماعت صلوٰۃ کے قیام سے سچّے نمازیوں میں سمع و طاعت کی آرزو نشو و نما پاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ حسن و حق کی باتیں گوشِ حق نیوش سے سُننے اور ان پر عمل کرنے، نیز اللہ تعالیٰ، اس کے رسولِ مقبولؐ اور مسلمان اولوالامر کی اطاعت کرنے لگتے ہیں، اور رفتہ رفتہ سمع و طاعت ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اور شعارِ زندگی بھی۔

قُرآنِ حکیم کی رُو سے اولوالامر سے مراد وہ بااختیار اشخاص ہیں، جو اپنے ماتحت یا اپنی رعایا کو حکم دینے کے مجاز ہوں۔ چنانچہ ساتھ ہی اس نے "مِنْکُمْ" کی شرط لگا کر اس امر کی صراحت کر دی کہ حکم دینے کے مجاز اشخاص کا مسلمانوں میں سے ہونا لابدی ہے کہ وہ صرف "معروف" کا حکم دیں اور منکر کا حکم دینے سے محترز رہیں، بلکہ منکر پر قدغن لگائیں۔ یہ یاد رہے کہ اسلام صرف اطاعت بالمعروف کی اجازت دیتا ہے اور اطاعت بالمنکر سے منع کرتا ہے۔ آگے بڑھنے سے

پہلے معروف و منکر کی اصطلاحات کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

معروف و منکر قرآنِ حکیم کی نہایت اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسری کی ضد بھی ہیں یہ دونوں اسلامی اخلاقیات یا فلسفۂ خیر و شر کی اساسیات ہیں۔ معروف ایسے قول و فعل سے عبارت ہے، جو فطرتِ صحیحہ، عقلِ سلیم، جمالیاتی حِسّ، ضمیر اور نفسِ مطمئنّہ یا حِسّی۔قلبی۔نفسی نظام کی رُو سے حسین ہو اور جسے انسان اپنی ذات سے منسوب کرنا پسند کرے۔ حسین قول و فعل یا معروف قرآنِ حکیم اور سُنّتِ حسنہ یا شریعتِ حقّہ کی رُو سے بھی جائز و حلال ہوتا ہے۔ چنانچہ حُسنِ خُلق یا مکارمِ اخلاق، عدل و احسان، حق و صداقت، حسنہ و خیر، حُسنِ عمل و عملِ صالح، حق گوئی و شجاعت، جود و سخا، ایثار و قربانی، تقویٰ و تکریمِ انسانی، حلم و محبّت، صبر و جفاکشی وغیرہ وغیرہ معروف ہی کی تعبیریں ہیں۔ بخلاف اس کے، مُنکر اس قول و فعل کو کہتے ہیں، جو حِسّی۔قلبی۔نفسی نظام کی رُو سے قبیح ہو اور انسان کو اُسے اپنی ذات سے منسوب کرنا پسند ہو نہ گوارا۔ مُنکر تو قرآن و سُنّہ یا شریعتِ حقّہ کی رُو سے بھی ناجائز و حرام ہوتا ہے۔ مثال کے طور سے سیئہ و شر، بدی، جرم و گناہ، کذب و تکذیبِ حق، کتمانِ حق، ظلم و استیصال، بُخل و جُبن، ناانصافی و بددیانتی، فتنہ و فساد، شرک و اصنام پرستی، بخل و طمع، خیانت و بُہتان تراشی، جرم و گناہ، قتل و غارت، کسبِ حرام و سیاہ کاری، قساوت و شقاوتِ قلب وغیرہ وغیرہ مُنکر کی تعریف میں آتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُولوالامر میں وہ سب اربابِ اختیار شامل ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت میں منتظم و مُہتمم، قیّم و قائد، افسر یا سربراہ ہوتے ہیں، اور ان کی رعایا ہوتی ہے۔ رعایا سے مراد زیرِ کفالت، زیرِ حفاظت، زیرِ تعلیم و تربیّت اور ماتحت اشخاص ہیں؛ لہٰذا اولاد اور چھوٹوں پر اپنے والدین اور بڑوں کی، بیوی پر شوہر کی، طلباء اور شاگردوں پر اپنے اساتذہ کی؛ اجیروں، ملازموں، ماتحتوں پر اپنے آجروں، منتظمین اور افسروں کی، نیز جملہ شہریوں پر اپنے حُکّام و حکمران کی اطاعت بالمعروف واجب ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ صلوٰۃ جہاں

اہلِ ایمان کو سمع و طاعت کا حکم دیتی ہے، وہاں اُولوالامر کو اپنی رعایا کی کفالت کا انتظام اور ان کے جان و مال اور بنیادی و شہری حقوق کی حفاظت کرنے کا مکلّف بھی کرتی ہے۔

سمع و طاعت کے ضمن میں دو نہایت اہم آیاتِ جلیلہ کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک کے مضمرات میں ہے کہ جن لوگوں میں حسن و حق کی باتیں سننے کی قوت سلب ہو جاتی ہے، وہ بہرے اور بے عقل ہوتے ہیں؛ دوسری آیۂ جلیلہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ مردہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو حسن و حق کی باتیں کہنے کا کیا فائدہ؟ (یونس ۱۰: ۴۲ اور النمل ۲۷: ۸۰) مُردہ فرد یا قوم کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس میں حسن و حق کی باتیں سننے کی آرزو و صلاحیت ہوتی ہے نہ دماغ و تاب۔ اس کے نتیجے میں اس فرد یا قوم کا رُشد و ہدایت اور علم و حکمت سے محروم ہو کر حسن کور و حق ناشناس، بہرا، اندھا اور گونگا بن جانا اور اس میں حسن و زندگی اور حسنِ انقلاب کی آرزو کا مُردہ ہو جانا، نیز معاشرتی سرطانوں اور سرطانی اداروں کا اس کو اپنا محکوم و غلام بنا لینا اور پھر اُس کا استحصال کرنا، اس سے ناانصافی کرنا، اس پر جور و جفا کو روا رکھنا اور اسے اس کے بنیادی و شہری حقوق سے محروم رکھنا، لازمی امر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ "تاریخی عمل" ہے، جو قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کا مستوجب ہے۔ یہ یاد رہے کہ انسان (فرد ہو یا قوم) کی جیسی آرزو ہوتی ہے تاریخی عمل بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مُسلم اقوام کی ضلالت و نکبت، ذلّت و مسکنت، ضعیفی و پسماندگی، ظلم و جہل اور سرطان گزیدگی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ مُردہ اور بہری ہیں، اور ان میں سمع و طاعت کا دماغ و ذوق ہے نہ تاب و استطاعت، اور نہ آرزو و جستجو ہی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کی یہ صورتِ حال بڑی ہی عبرتناک و فکر انگیز اور خطرناک ہے، جس کی ذمّے داری بالآخر سرطانی اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ ان ہلاکت آفرین و ظالم سرطانی اداروں کے استیصال کُلّی کی خاطر ربِّ علیم و حکیم نے کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کو نظامِ صلوٰۃ کی اساس بنا لیا ہے۔

شعورِ وقت

یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ "وقت دولت ہے"۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اس کی قدر کی اور اس کو اپنا رہوار بنایا۔ وہ اپنے ہم عصر اقوام سے آگے نکل گئی۔ اس کے نتیجے میں زمانے نے اقوامِ عالم کی قیادت اس قوم کو تفویض کر دی۔ مشاہیرِ زمانہ کے سوانح حیات بھی ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتے ہیں کہ ان کی عظمت و ترقی کا راز بھی یہی تھا کہ انہوں نے وقت ضائع نہیں کیا، بلکہ اس سے حسبِ مقدور زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا، اور اسے اپنا مرکب بنایا اور اس کی جہت کو درست رکھا۔ اس سے مستنبط ہوا کہ وقت کی قدر نہ کرنا، اس کا صحیح اور زیادہ سے زیادہ استعمال نہ کرنا اور اسے ضائع کرنا زیاں کاری ہے، نیز وقت کا ضیاع ناقابلِ تلافی خسارہ ہے۔

سورۂ عصر میں اللہ جلّ شانہ، نے تاریخی عمل کے حوالے سے اسی حقیقت کی طرف بلیغ و فکر انگیز اشارہ کیا ہے کہ انسان زیاں کار اور گھاٹے میں ہے، بجز اہلِ ایمان اور صالح لوگوں کے؛ جو صابر اور سچے ہوتے ہیں اور صبر و حق کی باہم تلقین کرتے رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ظلم و جہل کے سبب وقت ایسی نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہیں کرتا اور اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانے کی بجائے اُسے ضائع کر دیتا ہے۔ وقت کا ضیاع اصل میں کفرانِ نعمت اور زندگی کا ناقابلِ تلافی زیاں ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ افرادِ نسلِ انسانی کی بہت زیادہ اکثریت وقت ایسی نعمتِ عظمیٰ کو ضائع کر دیتی ہے یا اس سے اس قدر فائدہ نہیں اُٹھاتی جس قدر اس میں فائدہ اُٹھانے کی قابلیت ہوتی ہے۔

وقت کی قدر کرنے کا مطلب اگر اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا ہے تو اس کے ضیاع کا مطلب اپنا نقصان کرنا ہے۔ یہ نقصان دُہری نوعیت کا ہوتا ہے: مادّی اور جمالیاتی،

جیسے عرفِ عام میں روحانی کہتے ہیں ۔ زیاں کار لوگ دُنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی خراب کر لیتے ہیں ۔ وہ نہ صرف دُنیوی زندگی میں گھاٹے میں رہتے ہیں، بلکہ حیاتِ اُخروی کے اعتبار سے بھی نقصان میں رہتے ہیں ۔ اصل یہ ہے کہ آخرت کا نقصان ایسا ناقابلِ تلافی، مستقل اور عبرتناک زیاں ہے کہ انسان اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتا ۔ ایسے زیاں کار انسان ہی حقیقت میں محروم و نامراد اور اہلِ نار ہوتے ہیں ۔ اصل یہ ہے کہ جنّت کی محرومی ہی سب سے بڑی محرومی و نامرادی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے جنّت ایسی قُرّۃ العین اور جمالیاتی ثروت ہے، جس کا کوئی متنفّس خیال تک نہیں کر سکتا ۔ جنّت سے محرومی سے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وُہ شکیب رُبا و ناقابلِ برداشت ہوگی، اس پر مستزاد یہ کہ اس کے ساتھ جہنّم کے عذابُ النّار کو بھی سہنا ہو گا ۔ عذابُ النّار کی شدّت کا یہ عالم ہوگا کہ اہلِ نار لذّتِ حیات و موت سے ناآشنا سدا عالمِ سکرات میں رہیں گے ۔

صلوٰۃ کی ایک امتیازی خصوصیّت یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کے حُکم سے اس کا قیام وقت پر ہوتا ہے (النسآء ۴ : ۱۰۳)، لہٰذا وہ نمازیوں میں وقت کا شعور بیدار کرتی اور انہیں وقت کا پابند بناتی ہے ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حُکم سے اُسے صبح سے عِشاء تک پانچ وقت مسجد میں اوقاتِ معیّنہ پر باجماعت قائم کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ نمازیوں میں زمان و مکان کی اہمیّت و افادیّت کا شعور زندہ و بیدار رہتا ہے ۔ قرونِ اوُلیٰ کے مسلمانوں کی حیرت انگیز مادّی ترقّی اور جمالیاتی اِرتقاء کے عوامل میں زمان و مکان کا شعور بنیادی حیثیّت رکھتا تھا ۔ وقت کی کما حقّہٗ قدر کرنا اور اُسے صحیح طور پر استعمال کرنا اور اُسے ضائع نہ ہونے دینا، انسان کی مندرجۂ ذیل صفاتِ خمسہ پر دلالت کرتا ہے ۔

اوّل، وقت کی غیر معمولی اہمیّت و افادیّت پر یقینِ کامل ۔

دوم، وقت کے صحیح استعمال اور اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی صلاحیّت ۔

سوم، محنت کی غیر معمولی اہمیّت و عظمت کا احساس و شعور ۔

چہارم، تاریخی عمل کی قوت کا احساس و شعور۔
پنجم، صبر و استقامت اور حق گوئی کی عادت۔

یہ صفاتِ حسنہ جو بلاشبہ فرد و قوم کی دُنیوی و اُخروی کامیابی یا مادّی و جمالیاتی ترقی و کامیابی کی ضمانت فراہم کرتی ہیں، اِقامتِ صلوٰۃ سے پیدا ہوتی ہیں، بشرطیکہ معاشرے میں کتاب و سُنّت کے مطابق نظامِ صلوٰۃ قائم ہو اور نمازیوں کو صلوٰۃ کے فرائض اور تقاضوں کا شعور و ایقان ہو اور وہ اُنھیں پورا بھی کرتے ہوں۔

غور کریں تو صلوٰۃ با جماعت کے اس سے بہت زیادہ فوائد و فیوض ہیں جو عام طور سے خیال کیے جاتے ہیں لیکن ان کا یقین بالحق کم رکھتے ہیں۔ بہر حال، وقتِ مقررہ پر صلوٰۃ قائم کرنے کی فرضیت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس و شعور پیدا ہوتا ہے، جو فرد و قوم کو تاریخی عمل کے زیانِ مسلسل سے محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے انتہائی ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا میں جن افراد و قوم نے ترقی و خوشحالی، قوت و صولت اور عظمت و شہرت حاصل کی، انہوں نے وقت کا ضیاع نہیں کیا تھا بلکہ اس سے کما حقہ، فائدہ اٹھایا تھا۔ یہی شاہد عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام کا ہے۔ دُنیا کے عظیم ترین انسان، حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم، جن کی عظمت تاریخ تسلیم کر چکی ہے، ان کی سُنّتِ حسنہ بھی یہی تھی۔ آپؐ کی بمثال و مسلّمہ عظمت کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپؐ نے وقت کو اپنا مرکب بنایا، عمر بھر اس کے راکب رہے اور زندگی کی دوڑ میں ہر زمان و مکان کے انسان سے اتنے آگے نکل گئے کہ آج تک کوئی بھی آپؐ کی گرد تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکے گا۔

وقت واقعی دولت بھی ہے اور جمالیاتی ثروت بھی۔ یہ جہاں ترقی کا رہوارِ تیز رو ہے، وہاں یہ اپنے قدر ناشناس افراد و اقوام کے لیے تازیانۂ عبرت اور زیانِ مسلسل کا تاریخی عمل بھی ہے۔ اپنے اس موقف کے ثبوت میں ہم قرآنِ مجید کی سورہ عصر پیش کر سکتے

ہیں، جو الفاظ کے لحاظ سے جتنی مختصر ہے، معانی کے اعتبار سے اتنی ہی مطوّل اور جامع و مانع ہے، لہٰذا دریائے معانی کو کوزۂ الفاظ میں بند کرنے کی مثال بجا طور سے اس پر صادق آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حیاتِ انسانی میں وقت کی فعلیّت و اہمیّت کی طرف جسے فلسفۂ تاریخ میں تاریخی عمل اور قرآنِ حکیم میں "العصر" سے تعبیر کیا گیا ہے، انسان کی توجہ اس طرح مبذول کرائی ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر ۱۰۳: ۱تا۳) یعنی تاریخی عمل شاہد ہے کہ انسان حقیقت میں (مستقلاً) خسارے میں ہے، ان لوگوں کے سوا، جو ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے، نیز ایک دوسرے کو حق و صداقت کی نصیحت اور صبر و تحمّل، استقلال و استقامت اور برداشت و ثابت قدمی کی تلقین کرتے رہے۔

غور کریں تو سورۂ عصر کے مضمرات از بس اہم و بصیرت افروز ہیں۔ اس میں اللہ جلّ شانہٗ تاریخ کے حوالے سے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ انسان وقت کی منفی قوتوں یا سلبی تاریخی عمل کے باعث مسلسل خسارے میں زندگی کرتا ہے۔ اس کے متعدد عوامل ہیں مثلاً کفر و ایمان بالباطل، بدکرداری و بدخلقی، جرم و گناہ، ظلم و جہل، شرک و بت پرستی، غفلت و عدوان اور فساد و شر، نیز احساسِ ذمّے داری اور ثابت قدمی و قوّتِ برداشت کا فقدان اور ضعف و مرگِ ایمان۔ ان عوامل کی وجہ سے وقت کی قوّت یا تاریخی عمل ان افراد و اقوام کا مخالف ہو جاتا اور انہیں پچھاڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ ایسی اقوام پسماندہ و درماندہ اور مضمحل و کمزور ہو کر زمانے کی مرکب اور تیز رو قوموں کی محتاج و دست نگر یا محکوم و غلام بن جاتی ہیں۔

تیز رو اقوام سے مراد وہ ترقی یافتہ اقوام ہیں جو وقت کو اپنا رہوار بنا کر زندگی کے نو بنو تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔

صلوٰۃ بلاشبہ نمازیوں میں وقت کی افادی و حیاتیاتی اقدار کا شعور بیدار کرنے اور اس کے

نتیجے میں انہیں تاریخی عمل کے منفی و مضرت رساں نتائج و عواقب سے محفوظ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؛ بشرطیکہ وہ سچی ہو۔ سچی صلوٰۃ ان نمازیوں کی ہوتی ہے جو اس کو قُرّۃ العین اور تقرّبِ الٰہی کا وسیلہ سمجھ کر قائم کرتے اور اس کے فرائض اور تقاضوں کو بالخصوص بطیبِ خاطر پورا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ صلوٰۃ کو حسین و مؤثر بنانے کی خاطر اس کا نظام قائم کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ چونکہ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظاموں کو چاہتا ہے، لہٰذا سچے نمازی صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے ان تینوں نظاموں کو بھی قائم کرتے ہیں۔ الغرض، صلوٰۃ سچی اور حسین ہو تو وہ مؤثر ہوتی ہے اور سچے نمازیوں میں وقت کا شعور زندہ و بیدار کرتی ہے۔

توکّل و صبر

صلوٰۃ جہاں انسان میں توکّل و صبر پیدا کرنے کی تاثیر رکھتی ہے، وہاں وہ نمازیوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں اور صبر و صلوٰۃ کے ساتھ اس سے فتح و نصرت کی طلب و جستجو کریں۔ یہ دونوں نہایت اہم قرآنی اصطلاحات ہیں، لہٰذا ان کے معانی و مفہوم کی صراحت کر دی جاتی ہے:

(ا) توکّل (مادہ و ک ل)۔ التَّوکِیْلُ کے معنی ہیں، کسی شخص پر اعتماد کر کے اسے اپنا نائب مقرر کرنا، اور وَکِیْلٌ کا لفظ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (النسآء ۴: ۸۱): تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کارساز اور بھروسے کے لیے کافی ہے۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آلِ عمران ۳: ۱۷۳): ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ التَّوَکُّلُ (بروزنِ تَفَعُّل) صلہ عَلٰی کے ساتھ، مثلاً تَوَکَّلْتُ عَلَیْہِ

کے معنی کسی پر بھروسہ کرنا ہیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (ابراہیم ۱۴: ۱۱): اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ربِّ عزیز و قدیر بلاشبہ حسیب و وکیل ہے، لیکن ان کے لیے جو خود حتی المقدور سعی و جہد اور محنت و مشقت کرتے ہیں اور ان کی سعی و جہد کی جہت صالحہ و درست ہوتی ہے۔ ایسے ہی اہلِ ایمان و آرزو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے سزاوار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ فلسفۂ توکّل کو قرآنِ حکیم نے اپنے اعجازِ بلاغت سے اس نہایت مختصر آیۂ جمیلہ میں فکر انگیز انداز میں بیان کر دیا ہے:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ (الفاتحہ ۱: ۵): ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور فقط تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس آیۂ جمیلہ میں یہ حکیمانہ نکتہ مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کی پابندی کرنے کے بعد اس سے مدد و نصرت کی طلب و آرزو اور اس پر توکّل یا بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس قانونِ توکّل و استعانت کا اطلاق حیاتِ انسانی کے ہر گوشے پر ہوتا ہے۔ طالبِ علم کو احسن و اکمل طریق سے امتحان کی تیاری کرنے کے بعد بہترین نتیجے کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا واجب ہے، لیکن بغیر محنت کیے یا ادھوری محنت کر کے کامیابی کی توقع کرنا اور اس کے لیے ربِّ عادل سے دُعا کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا، قدرت کے قانونِ توکّل و استعانت کے خلاف ہے۔ سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کی نہایت فکر انگیز و بلیغ انداز میں صراحت کر دی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۝ (الرعد ۱۳: ۱۱): اللہ تعالیٰ کسی قوم کے احوال و ظروف کو نہیں بدلتا (یعنی اس میں حسنِ انقلاب نہیں لاتا)، جب تک وہ خود اپنے اندر حسنِ انقلاب نہیں لاتی۔ اس سے دو نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں:

اوّلاً، معاشرتی حسنِ انقلاب کی پیش شرط نفسیاتی حسنِ انقلاب ہے۔ اپنے آپ کو بدلنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے حسنِ انقلاب کی توقع رکھنی اور دعا کرنی چاہیے، اور اجابتِ دُعا کے لیے اس پر

بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سعی و جہد کے بعد بہترین نتیجے کے لیے اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعا مانگنی چاہیے اور اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

(ب) صَبْرٌ (مادّہ ص ب ر) کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ چیز کے حصول کے لیے برابر مصروفِ کار رہنا (تاج العروس)، لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل سعی و جہد کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے: رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (البقرۃ ۲: ۲۵۰): ہمارے پروردگار و آقا! ہم پر صبر ارزانی کر اور ہمارے قدم جما دے اور کافروں پر ہمیں فتح و نصرت عطا کر۔

قرآنِ مجید نے صابرین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آلِ عمران ۳: ۱۴۶): اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ کے بندوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصائب ان پر پڑے، ان سے وہ نہ تو دل شکستہ ہوئے اور نہ انھوں نے کمزوری ہی دکھائی اور نہ وہ (باطل کے آگے) سرنگوں ہی ہوئے۔ اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہے۔

الغرض، صبر کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ میدانِ کارزار ہو تو دشمنوں کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کرنا؛ ثابت قدم رہنا، جرأت و حوصلے کا مظاہرہ کرنا؛ کوئی افتاد پڑے تو جزع و فزع نہ کرنا؛ مشکلات درپیش ہوں تو گھبرا نہ جانا بلکہ ان پر قابو پانے کی مقدور بھر کوشش کرنا۔ مختصر یہ کہ احوال و ظروف خواہ کتنے نامساعد و صبر آزما کیوں نہ ہوں، ہمّت نہ ہارنا، بلکہ ثابت قدم رہنا اور حوصلے سے ان سے عہدہ برآ ہونے کی حتی المقدور کوشش کرنا؛ نیز اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کارزارِ حیات میں اولوالعزم و شجاع مردوں کی طرح

ثابت قدمی و ہمّت اور جرأت و حوصلہ مندی کا مظاہرہ کریں؛ سعی و جہد اور محنت و مشقّت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں اور اپنی قوّت و تدبیر پر گھمنڈ کرنے کے بجائے ربّ العزّت کی نصرت و تائید پر توکّل کریں اور اس سے مدد مانگتے رہیں۔ اگر وہ محکومی و غلامی اور ذلّت و مسکنت کی حالت میں ہوں یا اگر ان کا معاشرہ سرطان زدہ ہو، اور وہ آزاد و خوشحال ہونا چاہتے ہوں تو پہلے اُن کو اپنے دلوں میں اپنی آرزوؤں کو بدلنا ہوگا اور حسنِ انقلاب اور آزادی و خوشحالی کی سچّی آرزو پیدا کرنا ہوگی؛ نیز حسنِ انقلاب کے لیے بھرپور کوشش اور جہاد کرنا ہوگا؛ تب اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا ہوگی، اور صبر و استقلال سے جہاد کرتے رہنا، اور فتح و کامرانی کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ یہ ہے توکّل و صبر کا مفہوم۔ الغرض، اللہ جلّ شانہٗ سے استمداد و استعانت کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے اندر فتح و کامیابی کی آرزو پیدا کی جائے؛ پھر صحیح خطوط پر بھرپور سعی و جہد کی جائے اور ہر حال میں جرأت و ہمّت سے کام لینا اور ثابت قدم رہنا چاہیے؛ نیز اپنی قوّت و عقل پر تکیہ اور گھمنڈ کرنے کے بجائے ربِّ رحیم کی نُصرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ زندگی کے ہر گوشے میں فتح و کامیابی حاصل کرنے کے لیے حتیّٰ الامکان سعی و جُہد کرنے کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لینا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر بھروسہ کرنا اہلِ ایمان کا شعار ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ صلوٰۃ میں توکّل و صبر کی صفات پیدا کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اعتراف ہوگا۔ انسان طبعاً عجلت پسند اور جلد گھبرا جانے والا ہے (الانبیا ۲۱: ۳۷؛ المعارج ۷۰: ۱۹)، اور یہ دونوں جبلّتیں صبر و توکّل کی اضداد ہیں۔ حسنِ صلوٰۃ کا خاصّہ یہ ہے کہ اس سے اہلِ ایمان و آرزو کے باطنی نظام میں حسنِ انقلاب آتا ہے اور ان میں صبر و توکّل کی صفات پیدا ہو جانے سے وہ عجلت پسند رہتے ہیں نہ تھڑدلے بلکہ صابر و متوکّل بن جاتے ہیں۔ صلوٰۃ نمازیوں میں اس حقیقت کا حسنِ یقین پیدا کرتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اُن کا والی و وارث، حافظ و ناصر اور کارساز و مستجیب الدّعوات ہے؛ لہٰذا اس کی

نصرت شاملِ حال ہو تو فتح سے ہمکنار ہونا یقینی ہے (البقرۃ ۲: ۲۱۴)، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ صالح عمل کرنا ان کا شعارِ زندگی ہو۔

قرآنِ حکیم ایمان و عملِ صالح کا ذکر عموماً ساتھ ساتھ کرتا ہے۔ اس کے بین السطور میں یہ حکیمانہ نکتہ مضمر ہے کہ اسلام کے معتقداتِ جلیلہ و محرکہ کو اپنے باطنی نظام میں جذب کر کے ان کے مطابق زندگی کرنا عبارت ہے اعمالِ صالحہ سے؛ اور اعمالِ صالحہ سے ایمان زندہ و محکم اور معتبر بنتا ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ توکّل و صبر دونوں صفاتِ علی ایمان و اعمالِ صالحہ پر دلالت کرتی اور ان کے زمرے میں آتی ہیں۔ غور کریں تو نظامِ صلوٰۃ کا وظیفہ ہی نمازیوں کے ایمان کو زندہ و محکم کرنے اور ان میں اس ایمان کے اجزائے لاینفک یا معتقداتِ جلیلہ و محرکہ کے مطابق عمل کرنے کی آرزو کو زندہ و فعال رکھنا ہے۔

اصل یہ ہے کہ توکّل و صبر صلوٰۃ بالحق کا خاصہ بھی ہیں اور تقاضا بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سچے نمازیوں اور مؤمنوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ متوکّل و صابر ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، توکّل و صبر ان کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح ایمان کا اعتبار عملِ صالح ہے، اسی طرح صلوٰۃ کا اعتبار عملِ صالح ہے، جس سے یہاں مراد صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ قرآنِ مجید ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ توکّل و صبر ایسی صفاتِ حُسنیٰ ہیں، جو ربِّ ذوالجلال والاکرام کو محبوب ہیں اور وہ اپنے متوکّل و صابر بندوں سے محبت کرتا اور انھیں دوست رکھتا ہے (آلِ عمران ۳: ۱۵۹؛ الانفال ۸: ۴۶)۔

حیاتِ طیبّہ

زندگی کی لذّت سے آشنا وہ اہلِ حسن و سرور ہوتے ہیں، جو حیاتِ طیبّہ بسر کرتے ہیں، اور حسنِ عمل سے زندگی طیّب بنتی ہے۔ حیاتِ طیبّہ کا اصل الاصول کیا ہے؟ قرآنِ حکیم نے اپنے ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (النحل ۱۶: ۹۷) : جو شخص بھی عملِ صالحہ یا حسنِ عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ہم اسے (دنیا میں) طیّب زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) انھیں ان کے بہترین اعمال کا اجر دیں گے۔

حیاتِ طیبّہ کو قرآنِ حکیم نے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے؛ یعنی ایسی حسین و مطہر زندگی جو لذّت انگیز، مسرت آفرین اور نشو و ارتقا کرنے والی ہو۔ قرآن مجید کی رُو سے زندگی ایمان اور حسنِ عمل سے طیّب بنتی ہے؛ یعنی اس میں حسن و نور اور اطمینان و سرور پیدا ہوتا ہے اور وہ حرکی و ارتقائی بنتی ہے؛ اور ایمان و حسنِ عمل کا احسن و اکمل مظہر صلوٰۃ ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ صلوٰۃ بالحق ہی سے زندگی حسین و منوّر، مطہر و سرور آگیں اور حرکی و ارتقائی بنتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی زندگی بسر کرنے والا صاحبِ حسن و سرور ہو گا، جسے قرآن مجید نفسِ مطمئنّہ سے تعبیر کرتا اور اسے اپنا منظورِ نظر و اہلِ آرزو بندہ اور وارثِ جنّت قرار دیتا ہے۔

جنّت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہاں حیاتِ انسانی موت اور اس کے جملہ انداز و رنگ مثلاً خوف و حزن، اضمحلال و انحطاط، آشفتگی و بیقراری، کلفت و آلام، پیری و معذوری، ناگواری و بیزاری، حسرت و یاس وغیرہ وغیرہ سے منزّہ و مبرا ہو گی، اور لذّت آفرین و سرور آگیں ،

طمانیت انگیز وکیف وپرور اور حرکی وارتقائی ہوگی۔ چنانچہ جنت اور اس کی حیاتِ طیبہ اُن اہلِ حسن وسرور کو ملے گی، جو اہلِ آرزو اور سچے اور پکے نمازی ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ حیاتِ طیبہ وہ اہلِ ایمان وصالحین بسر کرتے ہیں، جو اسلامی معاشرے میں ہوتے ہیں، جو جنتِ ارضی ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ وہاں صلوٰۃ وزکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے قائم ہوتے ہیں اور حکومت کی سرپرستی میں اسوۂ حسنہ کے مطابق اپنے وظائف احسن طریق سے سرانجام دیتے ہیں۔ اگر یہ کہیں کہ صلوٰۃ وحیاتِ طیبہ لازم و ملزوم ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

فلسفۂ صلوٰۃ کا ماحصل یہ نکلا کہ صلوٰۃ ایمان وحُسنِ عمل کا احسن واکمل مظہر ہے اور اس سے نمازیوں کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوتی ہے، اس دُنیا اور آخرت دونوں میں۔

طبّی فوائد

اسلام کے نظامِ صلوٰۃ کی افادی اقدار گوناگوں ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ سے جہاں حسّی، قلبی، نفسی نظام کا تزکیہ ہوتا ہے اور اس کی فطری استعدادیں قوّت سے فعل میں آتی ہیں اور وہ فعّال و حرکی بن کر اپنے وظائف احسن طور سے سرانجام دینے کے قابل بنتا ہے؛ وہاں یہ صحتِ بدنی کے لیے بھی ازبس مفید ہے۔ جدید طبّی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی صلوٰۃ سے نمازیوں کی اتنی کسرتِ بدنی ہو جاتی ہے جو اس کے ہضم کو درست، بدن کو صحت مند اور دورانِ خون کو اعتدال پر رکھنے کے لیے کافی ہے۔ باجماعت صلوٰۃ کے قیام کے لیے انسان کو گھر سے مسجد تک پیدل آنا مسنون ہے اور اس میں یہ حکمت مضمر ہے کہ پانچ وقت آنا جانا تندرستی قائم رکھنے کے لیے ازبس مفید ہے۔ علاوہ ازیں، صلوٰۃ کے دوران رفعِ یدین، قیام ورکوع اور سجود و قعدہ کرنے سے ورزش بھی ہو جاتی ہے۔

یہ ورزش امراضِ قلب کو روکتی بھی ہے اور ان کا بے ضرر علاج بھی ہے

پیرانہ سالی میں عموماً گھٹنوں کا مرض ہو جاتا ہے۔ اطبّاء کا مشاہدہ و تجربہ ہے کہ باقاعدگی سے صلوٰۃ قائم کرنے والوں کو یہ مرض نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم نمازیوں کو۔ یوں بھی صلوٰۃ پکّے نمازیوں کو چاق و چوبند رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علاوہ بریں صلوٰۃ سے طمانیتِ قلب و جاں ملتی ہے، کیونکہ یہ ذکرِ الٰہی کا احسن و اکمل طریقہ ہے (الرّعد ۱۳: ۲۸)، اور قلب و نفس مطمئن ہوں تو انسان ذہنی انتشار، نفسیاتی دباؤ، آشفتہ سری، اعصابی امراض، خوف و حزن، احساسِ تنہائی، پریشان خیالی، اوہام پرستی، بیخوابی اور جنوں ایسے کئی امراض سے بچا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ کو مانعِ امراضِ نفسیاتی کہہ سکتے ہیں۔

قرآنِ مجید جب یہ کہتا ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف ہوتا ہے نہ حُزن (یونس ۱۰: ۶۲)، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ متذکرۂ بالا نفسیاتی بیماریوں سے محفوظ اور نفوسِ مطمئنّہ ہوتے ہیں؛ اور نفوسِ مطمئنّہ کی زندگی دُنیا میں بھی حیاتِ طیبّہ ہوتی ہے اور آخرت میں بھی انھیں جنّت کی حسین و طیب اور مسرور وارتقائی زندگی نصیب ہوگی (الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔

وضو جو صلوٰۃ کی پیش شرط (PRE-REQUISITE) ہے طبّی نقطۂ نظر سے ازبس اہمیت رکھتا ہے اس سے ہاتھ دھونے کی عادت پڑتی ہے، جو طبّی نقطۂ نظر سے انتہائی مفید اور کئی قسم کی بیماریوں کا تدارک کرتی ہے۔ ہاتھ دھو کر کھانے کی غیر معمولی اہمیت ایک مسلّمہ امر ہے۔ پھر پانچ وقت وضو کرتے وقت دانت صاف کرنا پڑتے ہیں اور دانتوں کو مسواک سے صاف کرنا سنّتِ حسنہ ہے۔ اگر مسواک میسّر نہ ہو تو برش وغیرہ سے دانت صاف کرنا لازم ہیں۔ قدیم و جدید طبّ بتاتی ہے کہ دانت صاف نہ ہوں تو ان کو پائیوریا ایسا غلیظ اور خطرناک مرض لاحق ہو جاتا ہے، جس سے معدہ و ہضم خراب ہو جاتا ہے اور کئی قسم کی مضرّت رساں بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ دانتوں کے مرض سے سانس بدبودار ہو جاتا ہے اور اس سے اس کی شخصیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ بدبودار سانس میاں بیوی کے درمیان نفرت اور

گاہے گاہے طلاق کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اس کی حفاظتی تدبیر وضو میں مسواک یا برش کرنا ہے۔ اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے تو پھر وضو کی طبی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

وضو میں ناک میں پانی ڈالنا اور اسے اچھی طرح سے صاف کرنا، ناک کی بیماریوں سے بچاؤ کا مجرّب نسخہ ہے۔ اس سے نزلہ، زکام وغیرہ کے جراثیم دُھل کر نکل جاتے یا مر جاتے ہیں؛ نیز ناک میں بار بار پانی ڈالنے سے دماغ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اور کانوں کی قوتِ شنوائی کو تقویّت پہنچتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے ضعف و اضمحلال کا عمل سُست پڑ جاتا ہے۔ چہرہ دھونے سے ایک تو وہ پاک و صاف اور نورانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میری اُمتیوں کی ایک امتیازی نشانی یہ ہوگی کہ وضو کی برکت سے ان کے چہرے روزِ قیامت منوّر ہوں گے۔" دوسرے اس کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ وضو سے آنکھیں بار بار دُھلتی رہتی ہیں تو گرد و غبار بھی دُھل کر دور ہو جاتا ہے؛ نیز آنکھوں کی تپش بھی جاتی رہتی ہے اور وہ ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں نمازی امراضِ چشم سے محفوظ رہتا ہے۔ الغرض وضو مانع چشم امراض و بینی (=ناک) ہے؛ نیز اس سے بینائی تیز ہوتی ہے اور آنکھیں روشن رہتی ہیں۔

مُنہ دھونے کے بعد چوتھائی سر کا مسح، کانوں کے اندر اور عقبی حصے، نیز سر کے نچلے اور گردن کا مسح صحتِ بدنی کے لیے ازحد مفید ہے؛ نیز یہ سر درد، ضربتِ حرارت (HEAT STROKE) اور ضربتِ شمسی (SUN STROKE) کی روک بھی کرتا ہے۔ اس سے ذہن مضمحل ہوتا ہے نہ سست، بلکہ مستعدی سے اپنا وظیفہ ادا کرتا ہے۔ آخر میں جب نمازی پاؤں دھوتے ہیں تو اس کا اثر سب سے پہلے سر کو پہنچتا ہے۔ اس کی مثال درخت ایسی ہے۔ اسے پانی دیتے ہیں تو وہ سب سے پہلے چوٹی کو سیراب کرتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے وضو خاص طور سے ازبس مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء، مفکرین، تلامیذ القرآن، مفسرین و

محدّثین اور فقہا، نیز علم و حکمت کی طلب و جستجو رکھنے والے عموماً باوضو رہتے تھے اور دن رات میں کئی بار وضو کرنا ان کا شعار تھا۔

آج کل فشارِ دم (= بلڈ پریشر)، ذیابیطس، وجع القلب (انجائنا) اور چربیلے مادّوں سے امراضِ قلب کی عام شکایت پائی جاتی ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ کسرت یا ورزش کی کمی ہے۔ جو نمازی پانچ وقت باقاعدگی سے مسجد میں جاکر صلوٰۃ ادا کرتے ہیں یا مستورات اور سالخوردہ مرد جو گھر میں صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، وہ اتنی کسرت ضرور کر لیتے ہیں، جو ان بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کفایت کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اشتہا سے زیادہ کھانا کھانے کے عادی نہ ہوں، بلکہ مرغن اور قوّتِ ہضم سے زیادہ کھانے سے پرہیز کرنے والے ہوں۔

صلوٰۃ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے حافظہ تیز ہوتا ہے، اور عقل و فکر میں قوّت و سلامتی پیدا ہوتی ہے، نیز جمالیاتی حِس فعّال رہتی اور جمالیاتی ذوق میں لطافت و بوقلمونی پیدا ہوتی ہے۔

فصل سوم

صلوٰۃ کے تقاضے

مسلم اقوام کی زبوں حالی وپس ماندگی اور ان کے معاشرے کے گوشے گوشے میں فساد کی نمود اور ان میں صدیقین، شہدا اور صالحین کی عبرتناک حد تک کمی کو دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کے عوامل ومحرّکات کیا ہیں؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی صلوٰۃ مؤثر نہیں رہی۔ اس پر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کے مؤثر نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ اس اہم سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں دینِ اسلام کے چار بنیادی نظام قائم نہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) نظامِ صلوٰۃ (۲) نظامِ زکوٰۃ (۳) نظامِ امر بالمعروف اور (۴) نظامِ نہی عن المنکر۔ دوسرے، مسلمانوں کی اکثریت اقامتِ صلوٰۃ پر مداومت نہیں کرتی، اور تیسرے، جو مسلمان مستقل طور سے صلوٰۃ ادا بھی کرتے ہیں، وہ ان کے تقاضے پورے نہیں کرتے، اِلّا ماشاءاللہ۔ اس پر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کے تقاضے کیا ہیں، جن کو پورا نہ کرنے سے صلوٰۃ مؤثر نہیں رہی؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا تفصیل واطناب کا متقاضی ہے، لیکن یہ موقع اختصار چاہتا ہے، لہٰذا صلوٰۃ کے جملہ تقاضوں میں سے جو انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر گوشے سے تعلق رکھتے ہیں، اُن اہم ترین تقاضوں سے فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے سورۂ ہود میں صلوٰۃ کے دو اہم ترین تقاضوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ تقاضے فکر انگیز و ایمان افزا ہیں: ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ..... اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ۝ (ہود ۱۱: ۸۴ تا ۸۷): اور اہلِ مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو (رسول بنا کر) بھیجا۔ اس نے کہا: "میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی یعنی پرستش و اطاعت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ (= معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور خدا) نہیں۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تمہیں خوشحال دیکھ رہا ہوں (لہٰذا شرک و کفرانِ نعمت نہ کرو)، مگر مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب پر چھا جائے گا۔ اور میری قوم کے لوگو! ماپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کی ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو (یہ اقتصادی فساد ہے، لہٰذا) زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر تم یقین لانے اور ماننے والے ہو تو سنو! اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے۔ بہر حال، میں تم پر کوئی نگرانِ کار نہیں ہوں (کہ جبراً تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کروں)۔

لوگوں نے جواب میں کہا: اے شعیبؑ! کیا تیری صلوٰۃ یا نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں؟ یا یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو جس طرح چاہیں خرچ نہ کریں؟ (یعنی ہمیں اپنے مال و دولت پر کوئی تصرّف و اختیار نہیں)۔ بس تو ہی ایک عالی ظرف و راستباز آدمی رہ گیا ہے۔"

ان آیاتِ جلیلہ میں صلوٰۃ کے مفصلۂ ذیل تقاضوں پر زور دیا گیا ہے:

اوّل: صلوٰۃ کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ انسان شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) سے باز رہے اور توحید پرستی اختیار کرے۔

دوم: کاروبار اور لین دین میں عدل کو روا رکھے اور فساد نہ پھیلائے۔

سوم: انسان کے پاس جو مال و دولت ہو اُسے اپنی مرضی سے خرچ نہ کرے، بلکہ احکامِ الٰہیہ

کے مطابق خرچ کرے۔

ان تقاضوں سے فرداً فرداً مختصراً بحث کی جاتی ہے۔

تقویٰ

فلسفۂ عبادت پر تفکر بالحق کرنے سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ عبادت کی ہر شکل، مثلاً، صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، قربانی، صدقہ وخیرات، عدل واحسان، تعلیم و تعلم قرآن، جہاد بالقرآن، جہاد بالسیف، تبلیغِ اسلام وغیرہ وغیرہ سب کا محرک بھی تقویٰ اور مقصود بھی تقویٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کے آغاز ہی میں انسان کو اس اصلِ عظیم سے آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب متقیوں کو ہدایت دیتی ہے (البقرہ ۲:۲ بعد)؛ حالانکہ دوسرے مقامات پر صاف بتا دیا کہ قرآنِ مجید جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے الھدیٰ و نور اور رحمت وشفا ہے (المائدۃ ۵:۱۵، ۴۴؛ الاسراء ۱۷:۸۲)۔ وجہ یہ ہے کہ تقویٰ میں جرم وگناہ اور ظلم وعدوان کی پُرخار جھاڑیوں سے دامنِ زندگی کو بچا کر نکل جانے اور اپنی منزلِ مقصود پانے کی آرزو کا مفہوم پایا جاتا ہے، جسے قرآنِ مجید "فلاح" اور فوزاً عظیماً (عظیم کامیابی) سے تعبیر کرتا ہے (النساء ۴:۱۳ وبمواضع کثیرہ)۔ ہدایت کی آرزو ہو تو انسان ہدایت پاتا ہے۔ ظاہر ہے جس چیز کی آرزو ہی نہ ہو وہ اسے حاصل کرنے کا دماغ رکھتا ہے نہ سعی وجہد ہی کرتا ہے۔

لیکن ہر عبادتِ الٰہی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں تقویٰ پیدا کرتی ہے خاص کر صلوٰۃ تو اس ضمن میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ صلوٰۃ میں دیگر عبادات کی بہ نسبت تقویٰ پیدا کرنے کی سب سے زیادہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ قرآنِ مجید ہے جو مسجد ایسے مقدس مقام اور اہلِ ایمان کے پاکیزہ ماحول میں ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حضور پڑھا اور

سُنا جاتا ہے۔ دوسرے، مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور محدود پیمانے پر "حشر" کا مقام ہے۔ یہاں اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے حضور اکٹھے ہو کر، سرِ نیاز خم کرنے، سربسجود ہونے، توبۃ النصوح کرنے اور اپنی بندگی و بے چارگی، عجز و انکساری اور فقر و گدائی کا اظہار و اعتراف، دُنیوی و اُخروی حسنہ فلاح و کامیابی، نیز اس کی رحمت و مغفرت کی استدعا کرنے آتے ہیں۔ دُعا سچی ہو تو مستجاب ہوتی ہے۔ سچی دُعا دراصل اظہارِ آرزو کا دوسرا نام ہے۔ الغرض، تقویٰ اگر اہلِ ایمان کو صلوٰۃ قائم کرنے کی تحریک کرتا ہے تو اقامتِ صلوٰۃ انسان کو متقی بناتی ہے اور متقی اسے کہتے ہیں جو اہلِ آرزو ہو اور تقویٰ اس کا شعارِ زندگی ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کے لغوی و اصطلاحی معانی معلوم کر لیے جائیں:

تقویٰ کا مادہ و ق ی ہے۔ امام راغب اصفہانی رح فرماتے ہیں: وَقَيْتُ الشَّيْءَ۔ وِقَايَةً و وِقَاءً کے معنی ہیں کسی شے کو مضرت رساں اور نقصان دہ چیزوں سے بچانا۔ اَلتَّقْوٰی: اس کے اصل معانی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں، جس سے ضرر، گزند یا نقصان پہنچنے کا احتمال یا اندیشہ ہو۔ کبھی کبھی تقویٰ اور خوف مترادفات کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں (المفردات، بذیلِ مادّہ)۔

ابوالکلام آزادؒ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۲:۲) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "زندگی کی تمام باتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔ بعض طبیعتیں محتاط ہوتی ہیں، بعض بے پروا ہوتی ہیں۔ جن کی طبیعت محتاط ہوتی ہے، وہ ہر بات میں سمجھ بوجھ کر قدم اُٹھاتے ہیں، اچھے بُرے، نفع نقصان، نشیب و فراز کا خیال رکھتے ہیں۔ جس بات میں بُرائی پاتے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں، جس میں اچھائی دیکھتے ہیں، اختیار کر لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے، جو لوگ بے پروا ہوتے ہیں، ان کی طبیعتیں بے لگام اور چھوٹ ہوتی ہیں۔ جو راہ دکھائی دے گی چل پڑیں گے۔ جس کام کا خیال آئے گا، کر بیٹھیں گے۔ جو غذا سامنے آئے گی، کھالیں گے۔

جس بات پر اڑنا چاہیں گے، اڑ بیٹھیں گے۔ اچھائی، برائی، نفع نقصان، دلیل اور توجیہہ کسی بات کی بھی انہیں پروا نہیں ہوتی۔

جس حالت کو ہم نے یہاں "احتیاط" سے تعبیر کیا ہے، اُسی کو قرآن "تقوائے" سے تعبیر کرتا ہے۔ "متّقی"، یعنی ایسا آدمی جو اپنے فکر و عمل میں بے پروا نہیں ہوتا۔ ہر بات کو درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کھٹک رکھتا ہے۔ برائی اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے؛ اور اچھائی اور فائدہ کی جستجو رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، ایسے ہی لوگ تعلیمِ حق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اُبی بن کعبؓ سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا:

"اَمَا سَلَكْتَ طَرِيْقاً ذَا شَوْكٍ؟" کیا تم کبھی ایسے راستے میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں؟ فرمایا، ہاں۔ کہا: فَمَا عَمِلْتَ؟ اس حالت میں تم نے کیا کیا؟ فرمایا: شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ! میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ کہا: فَذَالِكَ التَّقْوٰى، یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔ (دیکھیے ترجمان القرآن، ۱: ۷، ۳۰۴ تا ۳۰۸، بذیل استدراک، زمزم کمپنی لمیٹڈ، لاہور، تاریخ ندارد)۔

امام راغب اصفہانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور حضرت اُبی بن کعبؓ کی تشریحات سے مستنبط ہوتا ہے کہ تقوائے کی قرآنی اصطلاح میں سلبی اور ایجابی دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں، مثلاً اس کا سلبی مفہوم ہے: اللہ جلّ شانہٗ کے مکافاتِ عمل اور قانونِ احترامِ آرزو کے معجّل یا فوری اور موجّل یا تاخیری نتائج و عواقب کا خوف۔ معجّل نتائج و عواقب سے مراد فکر و نظر اور نیّت و عمل کے اثرات ہیں جو فی الفور قلب پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کُل باطنی یا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام متاثر ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے، موجّل نتائج و عواقب موت کے بعد عالمِ برزخ میں باندازِ مجاز و مثال اور دارالآخرت یا الحیوان میں حقیقی صورت

میں ظہور پذیر ہوں گے۔ الحیوان میں موت نہیں ہوگی۔ اس کے دو حصے ہیں: جنت اور جہنم۔ جنت میں حسن و شباب، طمانیت و مسرت، جمالیاتی ارتقاء اور زندگی کی سرمدیت ہوگی۔ بخلاف اس کے جہنم میں عذاب النار کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ اہلِ نار نہ موت نہ زندگی کی لذت سے آشنا ہی ہوں گے۔ قرآنِ مجید کی زبان میں ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (یعنی وُہ اس میں نہ مریں گے نہ زندگی ہی کریں گے، دیکھیے الاعلیٰ ۸۷: ۱۳)۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرۃ ۲: ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۳ و بمواضعِ کثیرہ): یعنی اللہ کا تقویٰ کرو تو اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ احترامِ آرزو کے حوالے سے اپنے اعمالِ بد کے فطری نتائج و عواقب سے ڈرو۔ بالفاظِ دیگر، حدود اللہ سے تجاوز کرنے، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے، اس کو بھلا دینے اور اس کی صراطِ مستقیم کے بجائے شرک و ضلالت کی راہوں پر چلنے کے نتائجِ عاجلہ و موجلہ سے خوف کھاؤ۔ اس کے ایجابی معانی یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا الٰہ و رب بناؤ اور اس پر قائم رہو؛ اس کی رحمت و مغفرت، نیز دُنیوی و اُخروی حسنہ، جنت کی حسین و سرور انگیز حیاتِ ابدی، جمالیاتی ارتقاء اور سب سے بڑھ کر اپنے معروضِ حسن و عشق اور ربِ ذوالجلال والاکرام کی ہم نظری و ہمکلامی، قرب و حضوری اور لقاء و رضوان کی جمالیاتی ثروت حاصل کرنے کی طلب و جستجو کرو، جس کا بہترین ذریعہ اقامتِ صلوٰۃ اور اس کے تقاضوں کا اتمام کرنا ہے۔

بعض ادیان و مذاہب کے پیروؤں نے یہ عقیدہ اختراع کر لیا ہے کہ صرف وہی ناجی ہیں اور باقی سارے ادیان و مذاہب باطل اور ان کے پیروکار اہلِ نار ہیں۔ ان میں سے اہلِ کلیسا اپنے اس عقیدے کی بڑے زور و شور سے تشہیر کر رہے ہیں کہ انسان کی نجات عقیدۂ تثلیث پر ایمان لانے پر منحصر ہے۔ عقیدۂ تثلیث کی مختصراً تشریح کرنے سے پہلے اس کے متعلق قرآنِ مجید کا فتوٰی سُنا دینا چاہتا ہوں کہ یہ عقیدہ شرکِ جلی اور ناقابلِ معافی

ظلمِ عظیم ہے اور انگریزی میں تثلیث کو TRINITY کہتے ہیں۔ نصاریٰ اس ناقابلِ فہم وادراک عقیدے کی اس طرح تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس، دراصل باپ، بیٹا اور کلمہ ہیں۔ ان تینوں کو وہ اقانیمِ ثلاثہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسے "ایک میں کا تین" بھی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ باطل و مشرکانہ نظریہ دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا کہتے ہیں کہ اس کی عقلی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں، وہ اپنے اس عقیدے کو غیر معقول IRRATIONAL تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کے جواز میں یہ مفروضہ پیش کرتے ہیں کہ جملہ بنی آدم پیدائشی گناہگار ہیں۔ ان کی نجات کی خاطر اللہ تعالیٰ نے روح القدس یا کلمے کی صورت میں کنواری مریمؑ کے بطن میں حلول کیا، وہاں ایک بچے کی طرح نشوونما پائی، تولد ہوا اور یسوع، مسیح یا عیسیٰؑ کے نام سے موسوم ہوا۔ اپنی قومِ یہود کی اصلاح کی خاطر تبلیغ کرتا رہا، لیکن وہ آپؑ پر ایمان نہ لائے اور سازش کر کے آپؑ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی نوعِ انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، لہٰذا اب جو شخص عقیدۂ تثلیث و کفارے پر ایمان لائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور خدا مانے گا، اس کا قیامت کے دن، جو یومِ الدین (DAY OF JUDGMENT) یا روزِ حساب و انصاف ہے، محاسبہ نہ ہوگا اور نہ اس پر قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا اطلاق ہی ہوگا، اور اس کے جرم و گناہ، ظلم و عدوان، شرک و بت پرستی کے باوجود اسے بخش دیا جائے گا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا الٰہ و رب نہ ماننے والے چاہے نبیؑ، صدیق، شہید اور صالح ہی کیوں نہ ہوں (خاکم بدہن) جہنم میں جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تثلیث و کفارے کے عقائد سے ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو ان پر ایمان رکھنے والوں کے ظلم و جہل پر دلالت کرتے ہیں۔

نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ "انسان فطرۃً یا پیدائشی گناہگار ہے"، عقلِ سلیم اور دینِ فطرت اسلام کی رو سے نامعقول و باطل ہے، اور رب العالمین کے قانونِ مکافاتِ عمل اور

صفتِ عدل کی تکذیب کرتا ہے بخلاف اس کے اسلام کا عقیدہ معقول و منصفانہ ہے۔ قرآنِ مجید نے طرح طرح سے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو احسن الخالقین ہے، اس نے اس کی "تقویم" یعنی خَلق و خُلق کو حسین بنایا ہے (دیکھیے التین ۹۵ : ۴)۔ سورۂ روم میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو اپنی فطرت پر (احسن و اکمل) بنایا ہے (الرّوم ۳۰ : ۳۰؛ نیز دیکھیے الانفطار ۸۲ : ۶ تا ۹، جس میں صاف فرما دیا، جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ دینِ حنیف کی تکذیب کرتے ہیں)۔ دوسرے، عقیدۂ تثلیث و کفّارہ کے ماننے سے یہ ماننا بھی لازم آتا ہے کہ، خاکم بدہن، اللہ تعالیٰ سبحان و صمد اور عادل و محسن نہیں بلکہ ظالم و متعصب ہے؛ علاوہ ازیں، وہ رحمٰن بالذات نہیں، بلکہ سوتیلی ماں کی طرح صرف تثلیث و کفّارہ کے مشرکانہ عقیدے پر ایمان لانے والوں کے لیے رحیم ہے اور جو اسے ربّ العالمین، رحمٰن و رحیم، سبحان و صمد اور وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں، ان کے لیے وہ ظالم و غیر منصف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عیسائیت کی بنیاد ظلم و شرک اور باطل و جہل پر استوار ہے، اور یہ آرزوں کے تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کی عبرتناک مثال ہے۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ بات صلوٰۃ و تقویٰ کے ربطِ باہمی کی ہو رہی تھی، جس کی نوعیت صلوٰۃ و قرآن کے ربطِ باہمی جیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "قرآنِ مجید جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے ہدایت ہے اور ہدایتِ مطلقہ کی واضح براہین رکھتا اور الفرقان ہے (البقرۃ ۲ : ۱۸۵، نیز دیکھیے آلِ عمران ۳ : ۱۳۸)۔ الفرقان کا مطلب ہے صیرفیِ حق و باطل، بالفاظِ دیگر، حق و باطل، حُسن و قبح، خیر و شر اور حسنہ و سیئہ میں امتیاز کرنے والا؛ لیکن اس نے فلسفۂ آرزو کی اس اصلِ عظیم کی بھی صراحت کر دی ہے کہ قرآنِ حکیم متقیوں کو ہدایت دیتا ہے (البقرۃ ۲ : ۲)۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ مجید سے ہدایت وہ لوگ حاصل کرتے ہیں، جن کو اس کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔

الہدیٰ کا مطلب ربّ العالمین کی ہدایتِ مطلقہ یا حقیقی رہنمائی ہے۔ اس سے مستنبط

ہوا کہ قرآنِ مجید ایسا نور ہے، جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہِ مستقیم دکھاتا اور اس کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ اس تک پہنچ جائے، جو اس کی زندگی کی غایت الغایات ہے۔ الھدیٰ یا قرآنِ حکیم ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا حقیقی "وسیلہ" ہے۔ یہ نور بھی ہے جو عامۃ النّاس کو بالعموم اور اہلِ آرزو کو بالخصوص توحید و شرک، عدل و ظلم، نفع و ربٰو، حق و باطل، حسن و قبح، حسنہ و سیئہ، خیر و شر، سود و زیاں، کامیابی و ناکامی اور ہدایت و ضلالت کے فرق کو دلائل و براہین کے ساتھ واضح طور سے دکھاتا ہے۔

اس فلسفۂ قرآنِ حکیم کا حاصل یہ نکلا کہ تقویٰ ہو تو انسان ہدایت حاصل کرسکتا اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ جو اس کے معروضِ حسن و عشق (اِلٰہ) کی جائے لِقاء یا جنّت ہے، لہٰذا عبادت کا بنیادی مقصد انسان میں تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ اس موقف کے ثبوت میں چند آیاتِ جمیلہ دلائل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں: اوّلاً، فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا ...... اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ٥ (المؤمنون ۲۳: ۳۲) پھر ہم نے ان میں خود انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انہیں دعوت دی): اللہ کی عبادت کرو۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود و مقصود اور خدا) نہیں ہے۔ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟ ثانیاً، یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ ...... تَتَّقُوْنَ ٥ (البقرۃ ۲: ۲۱): لوگو! اپنے رب کی عبادت (= حمد و ثنا، پرستش و اطاعت یا بندگی) کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ ثالثاً، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ ... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ٥ (البقرۃ ۲: ۱۸۳): اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے؛ توقع ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہوگا۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے مقصود اہلِ ایمان میں تقویٰ پیدا کرنا ہے اور عبادت کی احسن و اکمل شکل صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ میں کلامِ الٰہی کی قرأت کی بھی جاتی اور سنی بھی جاتی ہے؛ حمد و ثنا بھی کی جاتی ہے؛ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کی آل پر درود و سلام بھی بھیجا جاتا ہے، اپنے اور دوسروں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا بھی مانگی جاتی ہے؛ نیز امداد و ہدایت کی بھی اِستدعا کی جاتی ہے؛ اور "دعا مخ العبادت" یعنی عبادت کی روح ہے۔ علاوہ بریں، اقامتِ صلوٰۃ میں قیام و قعدہ اور رکوع و سجود بھی ہوتے ہیں۔ اس سے

مستنبط ہوا کہ صلوٰۃ کی غایتِ حقیقی مصلّین یا نمازیوں میں تقوٰی پیدا کرنا ہے اور جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، تقوٰی ہی انسان میں اس کے معروض حسن و عشق، حسن و حسنہ، حسنِ زندگی، حسنِ انقلاب، جالیاتی ارتقاء اور حسنُ المآب کی آرزو و جستجو پیدا کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صلوٰۃ و تقوٰی کا ربطِ باہمی لائنک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبیؑ و رسولؐ کی اُمّت کو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔ (دیکھیے الانبیآء ۲۱: ۱، تا ۷۳؛ لقمٰن ۳۱: ۱۷ و بمواضع کثیرہ)؛ نیز صلوٰۃ و تقوٰی کے تعلق کی نوعیت دوا و شفا یا مؤثر و اثر کی سی ہے؛ اگرچہ اثرِ صلوٰۃ یعنی تقوٰی کی نوعیت بھی اپنی جگہ مؤثر کی سی ہے۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ کو کلیدِ جنّت اور معراجِ انسانی کہتے ہیں؛ نیز یہ عبودیّت کے مقامِ احسان کے بلند ترین مدرجۂ شاہدیّت پر متمکّن ہونے اور جالیاتی ارتقاء کرنے کا ذریعہ ہے۔

صلوٰۃ کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مصلّین یا نمازیوں کو متّقی بناتی ہے اور اللہ تعالیٰ متّقیوں سے محبّت کرتا اور انہیں دوست رکھتا ہے (آلِ عمران ۳: ۷۶؛ التوبۃ ۹: ۷)؛ نیز اُن کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی ان کا حامی و ناصر ہے (البقرۃ ۲: ۱۹۴؛ التوبۃ ۹: ۱۲۳)۔ تقوٰی ہی کی بدولت قربانی یا عبادت قبول ہوتی ہے (المائدۃ ۵: ۲۷)۔ علاوہ بریں، متّقی لوگوں ہی کے لیے جنّت تیار کی گئی ہے، اور وہ اس میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہوں گے اور اس میں ہمیشہ (عیش و عشرت کی) زندگانی کریں گے (الحجر ۱۵: ۴۵ تا ۴۸؛ اور الدخان ۴۴: ۵۱) الغرض، متّقیوں کے لیے ہی آخرت میں حسنُ المآب اور مقامِ کامیابی ہے؛ جہاں باغ، انگور اور نوخیز ہم سن دوشیزائیں اور چھلکتے جام و ساغر ہوں گے۔ وہاں وہ کوئی لغو اور جھوٹی بات نہیں سنیں گے۔ یہ تمہارے ربّ کی طرف سے جزا اور کافی انعام ہے (النبآ ۷۸: ۳۱ تا ۳۸)۔

حاصلِ کلام یہ کہ صلوٰۃ انسان کو متّقی یا اہلِ آرزو بناتی ہے۔ اہلِ آرزو سے مراد وہ اہلِ ذوق و شوق ہیں جنہیں نفوسِ مطمئنّہ یا اہلِ حسن و سرور بننے کی طلب و جستجو ہوتی ہے، لہٰذا اس مقصد کی خاطر انہیں حسن و حق،

رُشد و ہدایت، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حُسنِ زندگی جمالیاتی ارتقاء، جمالیاتی ثروت، حُسنِ انقلاب اور حُسنِ المآب کی، نیز سب سے بڑھ کر اپنے معروضِ حُسن و عشق یا معبود و مقصود کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کی تمنا ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، ان کے دلوں میں قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل، اس کے قانونِ احترامِ آرزو اور روزِ قیامت اپنے محاسبے اور عذابِ النار کا ڈر اور اپنے اِلٰہ و رب سے دوری و مہجوری اور اس کی ناراضی و فراموشی کا خوف ہوتا ہے، لہٰذا وہ شرک و بت پرستی، جرم و گناہ، ظلم و ناانصافی، فحشاء و منکر اور سیئہ و شر سے گریزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں صلوٰۃ و تقویٰ لازم و ملزوم ہیں؛ اور کیوں ربِ رحمٰن و کریم ہر زمان و مکان میں افرادِ نسلِ انسانی کو نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، نیز کیوں اس حکم کی نوعیت ابدی ہے۔

شکرِ نعمت

قرآنِ مجید کی رُو سے شکرِ نعمت دین و صلوٰۃ کے اہم ترین تقاضوں میں سے ہے۔ شکرِ نعمت کی اصطلاح ذو معنی ہے۔ اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ ربِّ کریم نے انسان کو جو نعمتیں ودیعت کی یا عطا کی ہیں، اُن کے لیے اس کا صمیمِ قلب کے ساتھ شکریہ ادا کیا جائے اور اس کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی کی جائے۔ اس کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ ربِّ رحیم کی نعمتوں سے خود بھی حتی المقدور فائدہ اٹھایا جائے، دوسروں کو بھی اس سے مستفید کیا جائے اور انہیں ان سے استفادہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ مثال کے طور سے، قومی یا بین الاقوامی وسائلِ پیداوار پر نہ تو اپنے لیے قبضہ کیا جائے اور نہ دوسروں کو ان سے فائدہ اُٹھانے سے منع کیا جائے، بلکہ انہیں ایسا کرنے کا موقع یا اجازت دی جائے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ اکتناز و احتکار، بُخل و تکاثر، نیز سرمایہ داری، سودی سرمایہ کاری، جاگیرداری اور زمینداری کے نظام، نیز سودکاری کی جملہ مروّجہ شکلیں، مثلاً مزارعت و مضاربت، کرایہ داری، دستاویزی، ساہوکاری، بینک کاری اور تمسکات کاری کُفرانِ نعمت کی صورتیں ہیں، اور کُفرانِ نعمت گناہِ کبیرہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اصلِ دین اور خاصّۂ عبودیّت ہے۔ دین کے اس اصل الاُصول کو سمجھنے کی خاطر اس حقیقت کا اِدراک ضروری ہے کہ زندگی بشر کا استحقاق نہیں، ربِّ کریم کی نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اگر ربِّ ذوالجلال والاکرام ہمیں زندگی عطا نہ کرتا، انسان نہ بناتا، حتیٰ قلبی نفسی نظام ودیعت نہ کرتا، لذّتِ ایمان سے آشنا نہ کرتا، صحت نہ دیتا اور نہ حُسنِ عمل کی توفیق ہی عطا کرتا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ اس دُنیا کو اگر وہ ہمارے لیے اجرامِ فلکی سے مزیّن اور حسین و لذیذ اور دلکش و راحت افزا نعمتوں سے معمور نہ کرتا اور نہ ہمیں ان سے مستفید ہونے کی توفیق ہی دیتا تو اس محرومی کا ہم کیا مداوا کر سکتے

تھے؟ اگر وہ ہمیں حسن و عشق کی نعمتِ عظمیٰ عطا نہ کرتا، ہماری دعا کو سنتا نہ مستجاب کرتا اور نہ ہمیں رحمت و مغفرت سے نوازتا، نیز نہ ہمیں نہ ہمیں ہدایت ہی دیتا تو ہمارا کیا بنتا؟ اگر وہ رحمٰن و رحیم وہاب و کریم، ستّار العیوب و غفّار الذنوب، کارساز و حاجت روا، مولیٰ و نصیر اور مجیب الدعوات نہ ہوتا تو سوچیے ہمارا کیا حشر ہوتا؟ اگر وہ ہماری تعلیم و تربیت، رشد و ہدایت اور تزکیہ و حکمت آموزی کے لیے نبیوںؑ اور رسولوںؑ کو اپنی کتب کے ساتھ مبعوث نہ فرماتا اور ہمیں محبّت و مودّت اور طمانیّت و مسرّت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ہمارے لیے نسب و صہر کے رشتے نہ بناتا تو ہم اپنی اس نامرادی و محرومی کی شکایت کس سے کرتے؟ کیا ان بے بہا نعمتوں کے لیے ہم پر اپنے ربِ رحیم و کریم کا شکریہ واجب نہیں؟

یقیناً واجب ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم عمر بھر بھی ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے رہیں تو حق ادا نہیں کر سکتے۔ یہ تو تھا دنیا کی نعمتوں کا ذکر۔ جنّت جو قرّۃ العین و حسنُ المآب ہے اور جسے اس نے اپنے اہلِ حسن و سرور بندوں کے لیے تیار کیا ہے، اس کی حسین و بیمثال اور بے قیاس و لازوال نعمتوں کا حقِ شکر تو بندے ابدالآباد تک ادا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک تلخ و عبرتناک واقعیت ہے کہ اس دنیا میں بہت کم لوگ ہوں گے جو اس نقطۂ نظر سے ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتوں کو دیکھتے اور ان پر غور و فکر کرتے ہوں گے، لہٰذا ان کے شکر کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کفرانِ نعمت واقعی ظلم و جہل ہے اور انسان کی محرومی و نامرادی اور خود ظلمی کی اصل وجہ اس کا جہل ہے؛ اور جہل سے زیادہ خطرناک و مہلک اور لا دوا مرض جہلِ مرکّب ہے، جس میں معاشرتی سرطانوں، نام نہاد مشائخ و علمائے سوء اور علم و دانش سے محروم اہلِ قلم اور "دانشور" مبتلا ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی اور ان کی تقلید میں عامۃ النّاس میں سے اکثر جہلِ مرکّب کے مرض کے شکار ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ شرک و اکابر پرستی کرتے ہیں، لیکن اسے ایسا سمجھنے کے بجائے اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ کارِ ثواب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے انسان مہلک بیماری کو بھی بیماری نہ سمجھے، بلکہ علامتِ صحت خیال کرے تو وہ نہ اس کا علاج کرائے گا نہ شفایاب ہی ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کی سنتے نہ مانتے ہیں؛ اور نہ اس وقت

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھتے اور نہ اس سے عبرت ہی حاصل کرتے ہیں۔ ان کو اپنے مستقبل کی فکر ہے، نہ مستقبلِ بعید یعنی آخرت کی۔ وہ نہ تو انفس و آفاق میں تدبّر بالحق کرتے، نہ اپنے مقصدِ حیات کو سمجھتے اور نہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔

علاوہ بریں، قیامت خیز جوہری اسلحہ سازی اور حریف قوّتوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی منصوبہ بندی، نیز دنیا میں فساد و جنگ کی نمود بھی اقوامِ عالم کے جہلِ مرکّب کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ اس کو جھٹلانے کی کوئی وجہِ جواز نہیں کہ جہل کے مرض کے باعث انسان اپنے ربِّ کریم کا بندۂ شکور بننے کے بجائے کفرانِ نعمت کر کے اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے، تو یہ بھی سچ ہے کہ صلوٰۃ مرضِ جہل کا مؤثر علاج ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں کتُبِ سماوی، خصوصاً قرآنِ حکیم، احادیثِ طیبہ، آثار اور تاریخ کے علاوہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، نیز آپؐ کے صحابۂ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے سوانحِ حیات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

صلوٰۃ بلاشبہ ہم میں ربّ العالمین کی صفاتِ حسنہ اور اس کی بے قیاس عظیم و حسین نعمتوں کا شعور بیدار کرتی اور ان کے لیے اس کی حمد و ثنا کرنے اور شکریہ بجالانے کا احساس دلاتی اور داعیہ پیدا کرتی ہے۔ اس کا ثبوت سورۂ فاتحہ ہے، جو صلوٰۃ کا جزوِ لاینفک ہے اور اس کا آغاز ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے ہوتا ہے۔ یہ آیۂ جمیلہ ربِّ رحمٰن و رحیم کی نعمتوں کے اعتراف اور ان کے لیے انسان کے جذباتِ تشکر و امتنان کا حسین اظہار ہے۔

سورۂ فاتحہ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کی ہر سورت، خصوصاً سورۂ رحمٰن میں انسان کی توجہ کو اپنی نعمتوں کی طرف مبذول کراتا ہے تاکہ ایک تو وہ ان سے کام لے اور فیضان حاصل کرے اور دوسرے اپنے منعم و محسن کا شکریہ ادا کرے۔ شعورِ نعمت سے ایک تو داعیۂ شکر اور دوسرے صفاتِ الٰہیہ کا عرفان پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا عرفان انسان میں اس حقیقت کا یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ اور صرف وہی اس کا خالق و

رازق اور پروردگار و مالک ہے۔ اس کے نتیجے میں وُہ موحد بن کر شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) سے محفوظ رہتا ہے، جو ظلم عظیم اور ناقابلِ معافی گناہ ہے اور اس کا انجام عذابُ النّار اور حیات و ممات کی محرومیِ جاوید ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شکرِ نعمت فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ صلوٰۃ جہاں انسان کو اپنے ربِّ کریم کی نعمتوں کے لیے اس کا شکر بجالانے کی تحریک و تقاضا کرتی ہے، وہاں وہ اس سے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ اولاد اپنے والدین کا، بیوی اپنے شوہر کا اور تلامذہ اپنے اساتذہ کا، الغرض ہر شخص اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے اور ایسا کرنے کی عادت بنا لے۔ شکر گزاری سے جہاں باہمی مودّت و محبّت، ہمدردی و غمگساری، احسان و وفاکیشی اور ایثار و قربانی کے جذبات پرورش پاتے ہیں، وہاں احساسِ ممنونیّت سے تحسینِ خُلق بھی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، جو شخص اپنے محسُن کی عنایت و احسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اپنے ربِّ کریم کی نعمتوں کا شکر کرنا بھی بھول جاتا ہے اور کفرانِ نعمت ایسے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ ہمیں قدرت کا یہ قانون یاد رکھنا چاہیے کہ شکرِ نعمت سے اگر اس میں برکت پیدا ہوتی ہے تو کُفرانِ نعمت سے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شکرِ نعمت فطرتِ انسانی کا خاصہ اور دین و ایمان اور خصوصاً صلوٰۃ کا تقاضا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مُسلم اقوام میں اکثریّت ان لوگوں کی ہے جن کا شعارِ زندگی ناشکر گزاری بن چکا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں وہ زیانِ مسلسل میں ہیں، پس ماندہ و مفلوک الحال اور کمزور و دست نگر ہیں، نیز اپنی بقا و سلامتی کے لیے اپنی حریف ترقی یافتہ اقوام کی مرہونِ منت ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمہ دار" معاشرتی سرطانیت" ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب ملوکیت کا دور آیا تو فرعونی ادارے نے اپنی معاونت و بقا کے لیے ہامانی، قارونی اور آذری ادارے قائم کر دیے۔ یہ چاروں سرطانی ادارے

ایک دوسرے کے پشتیبان بن گئے، اور رعایا پر حکمرانی کرنے لگے۔ انہوں نے حکومت اور اپنی عملداری کو مضبوط و مستحکم اور رعایا کے حقوق سلب اور ان کا استحصال کرنے، نیز ان کو اپنا محکوم و غلام اور محتاج و دست نگر بنانے اور رکھنے کی خاطر اسلام کے بنیادی نظاموں۔ نظامِ صلوٰۃ، نظامِ زکوٰۃ، نظامِ امر بالمعروف اور نظامِ نہی عن المنکر۔ کا بتدریج استیصال کرنا شروع کر دیا۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس و منافقوں کی سازشوں اور آرزوں کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے جالیاتی دھوکوں کے ذریعے سرطانی ادارے اپنے ابلیسی منصوبے میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے۔ یہ چاروں نظام حصارِ دین کی مضبوط اساسیات ہیں، لہٰذا اسلامی معاشرے میں ان کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق مختصراً اشارے کیے جاتے ہیں:

(۱) نظامِ صلوٰۃ:

جو اس تصنیف کا موضوع اور دین کی اہم ترین اساس ہے، اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو رفتہ رفتہ نظامِ صلوٰۃ کی اہمیت و غایت کے ساتھ اس کے "نظام" کے تصور ہی سے ناآشنا کر دیا۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ صلوٰۃ کا مطالعہ کریں، جو آپؐ نے مسجدِ نبویؐ میں قائم کیا تھا تو ہمیں اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ وہ "کُل زندگی" کو محیط تھا۔ مسجدِ نبویؐ کیا تھی؟ سجدہ گاہ کے ساتھ تعلیمی ادارہ، تربیت گاہ، عدلیہ، عسکری صدر مقام، مجلسِ شوریٰ، دفترِ انتظامیہ اور ثقافتی مرکز بھی تھی، سرطانی اداروں اور یہود و مجوس اور نصاریٰ و منافقین کی سازشوں سے نظامِ صلوٰۃ تو نہ رہا، البتہ صلوٰۃ رہ گئی۔ اسی طرح مسجد کے ادارے تو نہ رہے، البتہ مدرسہ قائم رہا، لیکن اسلام کے دشمنوں نے اپنی جالیاتی فریب کاری کے ذریعے مسجد کے نظامِ تعلیم سے نصابِ قرآن کو اس طرح خارج کر دیا کہ آج تک اُمتِ مسلمہ کو اس کا احساس و شعور نہیں۔ "دینی" مدارس ہمارے اس موقف کے زندہ ثبوت ہیں، جن میں نصابِ قرآن کا قریب قریب فقدان ہے۔ ان میں لوح و قلم، سائنس ٹیکنالوجی، علومِ جدیدہ اور ہر فن شجرِ ممنوعہ ہیں۔ اس

کے نتیجے میں مسلم اقوام سائنس ٹیکنالوجی (= علم وہنر) کی قوتِ تسخیرِ زمان و مکان اور جوہری توانائی (اصطلاحِ قرآن میں "سُلطان"، دیکھیے رحمٰن ۵۵ : ۳۳) سے محروم ہو کر دوسری اقوام کے مقابلے میں کمزور و ناتواں اور پس ماندہ و مردہ، نیز ان کی محتاج و دست نگر اور محکوم و غلام ہو گئیں اور اب تک ہیں۔

(۲) نظامِ زکوٰۃ :

دراصل نظامِ صلوٰۃ کا جزوِ لاینفک ہے برطانی اداروں اور دیگر دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور آزری پیشوائیت کی تاویل باباطل سے نظامِ زکوٰۃ کا مفہوم بھی یکسر بدل گیا اور مسلم اقوام اس نظام کے وظائف (FUNCTIONS) اور طریقِ کار سے رفتہ رفتہ کم آشنا ہوتی چلی گئیں۔ انجام کار انہیں یہ حقیقت یاد ہی نہ رہی کہ نظامِ زکوٰۃ قائم کرنا اور قرآن و سنّہ کے مطابق چلانا، مسلم حکومت کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ "ایتائے زکوٰۃ" کا مطلب قرآنِ مجید اور سنّتِ حسنہ کی رُو سے دُہرا ہے: ایک یہ کہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ دوسرے مسلم رعایا سے اپنے عُمّال کے ذریعے زکوٰۃ وصول کر کے اہلِ احتیاج کو احسن طریق سے دینا، حکومت کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ زکوٰۃ کو احسن طریق سے دینے کا مطلب کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے ربّ کریم کی نعمتوں سے محروم نہ رہے؛ اور حکومت اہلِ احتیاج کے لیے روزگار، رہنے سہنے، کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے، علاج معالجے، تعلیم و تربیّت، صحت و صفائی وغیرہ وغیرہ کے لیے معقول و احسن انتظام کرے۔

یہ کتنی عبرتناک واقعیّت ہے کہ دنیا کے کسی مسلم ملک میں نظامِ صلوٰۃ قائم ہے نہ نظامِ زکوٰۃ۔

(۳) نظامِ امر بالمعروف :

معروف قرآنِ حکیم کی جامع و مانع اخلاقیاتی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے حُسنِ عمل یا

عملِ صالح۔ بالفاظِ دیگر، ہر ایسا قول و عمل جسے انسان طبعاً، عقلاً اور شرعاً اچھا سمجھتا اور پسند کرتا ہے۔ رعایا کو منظم طریقے سے اعمالِ صالحہ کرنے کی ترغیب دینا اور قانون کے ذریعے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرنا بھی حکومت کی تیسری اہم ذمّے داری ہے۔

(۴) نظامِ نہی عن المنکر:

"منکر" ہر ایسے قول و عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو طبعاً، عقلاً اور شرعاً ناپسند ہو اور اُسے اپنی ذات سے منسوب کرنا اس کو گوارا نہ ہو۔ یہ بھی قرآنی اصطلاح ہے اور معروف کی ضد ہے۔ اس اعتبار سے "منکر" کا معنیٰ ہوا، جُرم و گناہ، ظُلم و جہل اور سیّئہ و شر۔ رعایا کو بالخصوص اور افرادِ نسلِ انسانی کو بالعموم فحشاء و منکر سے باز رکھنے کا مناسب انتظام کرنا مُسلم حکومت کی چوتھی اہم ذمّے داری ہے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ معاشرتی سرطانیت ہے، جس نے مُسلم اقوام کو ظالم و جاہل اور عاقبت نااندیش و مردہ بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں کُفرانِ نعمت، احسان فراموشی اور ناشکر گزاری ان کا شعارِ زندگی بن گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، سرطانی اداروں نے مسلمانوں کو بالخصوص اس اصلِ عظیم سے ناآشنا کر دیا ہے کہ جہاں ان کی حکومت ہو، وہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام قائم کرنا اُن کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ دوسرے ان کی سازشوں اور تشہیر بالباطل اور آزری اداروں کی تاویل بالباطل کے سبب مسلمانوں کو صلوٰۃ کے فرائض اور خاص کر تقاضوں کا علم ہی نہیں رہا؛ اور جن کو تھوڑا بہت علم ہے بھی انھیں ان تقاضوں کو پورا کرنے کا دماغ ہے نہ داعیہ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ من حیث الاُمّۃ مسلمان ناشکر گزار اور کُفرانِ نعمت کے خوگر ہیں۔ علاوہ بریں، حُسنِ صلوٰۃ کی تاثیر سے سچّے نمازیوں کا شکر گزار بننا اور اپنے ربِّ کریم کی نعمتوں کی قدر کرنا اور ان کے لیے اس کا شکر بجالانا، ایک فطری امر ہے۔ ہم اپنے اس موقف کی تائید میں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے شعارِ زندگی کو پیش کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ

حُسنِ صلوٰۃ کا خاصّہ شکرِ نعمتِ ربّی ہے، لہٰذا جس قوم کا شعار شکرِ نعمت کے بجائے کفرانِ نعمت ہو، اس کی صلوٰۃ حُسن و نُور اور اثر یا جمالیاتی و افادی قدروں سے محروم ہوتی ہے۔ اور وہ خود بھی مغضوب و مقہور اور گمراہ و محروم ہوتی ہے۔

توحید

دینِ اسلام کی اساس توحید ہے، لہٰذا صلوٰۃ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اہلِ ایمان موحّد ہوں، مُشرک و بت پرست نہ ہوں۔ وہ نہ صرف توحیدِ اُلوہیت کے دل و جان سے قائل ہوں، بلکہ اس عقیدے کے مطابق زندگی کرتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے؛ لہٰذا جو شخص شرک کرتا ہے اس کی صلوٰۃ بلکہ ہر عبادت مردہ و بے اثر ہے۔ شرک کی دو بڑی اقسام ہیں؛ شرک فی الذّات اور شرک فی الصّفات۔

(۱) **شرک فی الذّات** کی ایک معروف و زندہ مثال عقیدۂ ابنیّت یا عقیدۂ تثلیث (TRINITY) ہے۔ عقیدۂ ابنیّت کی رُو سے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کا بیٹا مانتے ہیں۔ عقیدۂ تثلیث یہ ہے کہ اللہ، روح القدس اور عیسیٰ علیہ السلام اقانیم ثلاثہ ہیں۔ یہ باطل عقیدہ آذری سرطالوں کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کی اِنتہائی گمراہ کُن و عبرتناک اِیجاد ہے۔ یہ ایسا نامعقول اور جاہلانہ عقیدہ ہے کہ علمائے نصاریٰ آج تک اس کی عقلی توجیہہ کر سکے ہیں نہ کر ہی سکیں گے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ انسان کے ظُلم و جہل کی انسانیت سوز مثال ہے۔ اس کے متعلق ربِ جبّار و قہّار کس غضب و جلالت سے فرماتا ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ

مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ہ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ہ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ہ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ہ (مریم ۱۹: ۸۸ تا ۹۳) :

اور یہ لوگ (نصاریٰ) کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ بڑی ہی سخت بات ہے جو تم گڑھ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دہل کر گر پڑیں؛ اس بات پر کہ لوگ رحمٰن کے لیے بیٹا ہونے کا دعوٰی کر رہے ہیں۔ رحمٰن کے لیے یہ شایانِ شان نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں بلا استثنیٰ سب کے سب رحمٰن کے حضور غلام بن کر آئیں گے۔

ابنیّت کا عقیدہ نصاریٰ سے پہلے یہود میں بھی موجود تھا اور حضرت عُزیر علیہ السّلام کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے :

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ہ (التوبۃ ۹ : ۳۰) :

یہودی کہتے ہیں کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ محض ان کی مُنہ کی باتیں ہیں (جو لایعنی و بے حقیقت ہیں)۔ یہ ان لوگوں کی نقل کرتے ہیں؛ جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ کی مار ان پر کہاں سے فریب کھا رہے ہیں۔

اس آیۂ جلیلہ سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ سے پہلے بھی اس قسم کا مشرکانہ عقیدہ اقوامِ عالم میں پایا جاتا تھا۔ اس سے ملتا جلتا عقیدہ "اوتاریت" کا ہے، جو ہندوستان، مصر اور بہت سے دیگر ممالک اور اقوام میں پایا جاتا تھا۔ اس عقیدے کی رُو سے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ لوگوں کی اصلاح کے لیے دُنیا میں بشر کی صورت اور اس کی طرح ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور لذّتِ موت سے آشنا ہو کر واپس اپنے جہان میں چلا جاتا ہے اور خدائی

کرنے لگتا ہے۔ بخلاف اس نامعقول ومشرکانہ عقیدے کے، اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جَلّ شانہٗ سُبحان وصمد اور عزیز وقدیر ہے، اس کی شان سے بعید ہے کہ وہ بشر بنے اور نو ماہ رحمِ مادر میں پرورش پائے، پیدا ہو اور اپنی نشو ونما کے لیے ماں باپ، اساتذہ اور دیگر قوّتوں کا مرہونِ منّت ہو۔ اس نے لوگوں کو ہدایت واصلاح کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت تک نبوّت ورسالت اور وحی وتنزیل کا سلسلہ قائم رکھا۔ پھر جب دین اور انسان کی حسّی، قلبی، نفسی قوّتوں کی تکمیل ہوگئی تو یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا اور اصلاح وہدایت کا کام اہلِ علم کو تفویض کر دیا۔

(۲) **شرک فی الصّفات** کا عقیدہ غیر مسلم اقوام کے علاوہ اُمّتِ مُسلمہ کے اکثر فرقوں میں پایا جاتا ہے، لیکن ان کے ظُلم وجہل کی اِنتہا یہ ہے کہ وہ شرک کو شرک ہی نہیں سمجھتے، بلکہ اُلٹا عبادت خیال کرتے ہیں۔ یہ مشرکانہ عقیدہ بھی آذری سرطانوں کی اِیجاد ہے، اور یہ اِیجاد ان کے ابلیسانہ فنِ تسمیہ بالباطل وتاویل بالباطل کا کرشمہ ہے۔ تسمیہ بالباطل کے ذریعے وہ اسم بے مُسمّیٰ کو اسم بامُسمّیٰ بنا کر دکھاتے ہیں اور تاویل بالباطل کے ذریعے اسے سچّا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وہ برگزیدہ یا موہومہ ہستیوں، آستانوں، مقامات، مقابر وغیرہ وغیرہ کو صفاتِ اِلٰہیہ سے متّصف کرکے دکھاتے ہیں۔ مثال کے طور سے، وہ ان ہستیوں کو عالم الغیب، حاضر وناظر، کارساز ومُشکل کُشا، دستگیر وحاجت روا، داتا، مددگار، سمیع ومستجیب الدّعوات سمجھتے، ان کو پکارتے اور ان سے دُعائیں مانگتے ہیں۔ قبروں، آستانوں، شبیہوں، مجسّموں، مورتیوں وغیرہ وغیرہ کی پرستش کرنا، چڑھاوے چڑھانا اور غیر اللہ کے نام کی نذر ونیاز دینا بھی شرک ہے۔

شرک کی ایک اور قسم بھی ہے، جسے قُرآنِ مجید کے محاورے میں اپنی خواہشِ نفس کو اپنا اِلٰہ بنانا ہے (الفرقان ۲۵: ۴۳؛ الجاثیہ ۴۵: ۲۳)۔ نفسِ امّارہ کا وظیفہ خواہشات پیدا کرنا ہے۔ شیطانِ ابلیسی نفسِ امّارہ کے تعاون سے ان خواہشات کو چاہے وہ قبیح کیوں نہ ہوں، اپنی وسوسہ اندازی اور جادویاتی فریب کاری کے ذریعے مزیّن کر کے یعنی حسین ودلکش بنا کر دکھاتا ہے۔

انسان اس جمالیاتی دھوکے میں مارا جاتا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بجائے ان میں سے کسی خواہش کو اپنا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بنا لیتا اور اپنے حقیقی اِلٰہ و ربّ کی محبّت کو اپنی خواہش کی محبّت پر قربان کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، وہ اللہ تعالیٰ کو فراموش کر کے اس سے دُور ہو جاتا ہے، اور ظالم و جاہل اور زیاں کار بن جاتا ہے۔ غیر اللہ کی محبّت، اللہ سبحانہٗ، وتعالیٰ کی محبّت پر غالب آجائے تو اس کے مشرک و بت پرست، مجرم و گناہگار، غافل و جاہل اور ظالم و معاشرتی سرطان بن جانے کے امکانات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔

احکامِ الٰہیہ کے بجائے کسی ایک یا اس سے زائد معاشرتی سرطانوں کے احکام کی برضا و رغبت تعمیل کرنا بھی شرک ہے اور قرآنِ مجید کے محاورے میں ایسے لوگوں کو اپنے "ارباب" بنا لینا کہتے ہیں (التوبۃ ۹: ۳۱)۔

شرک کی ضد و نقیض توحید ہے۔ اس عقیدے کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ ایک اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ ہی جُملہ مخلوقات کا ربّ یعنی خالق و پروردگار، آقا و مالک ہے اور تنہا وہی سب کا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے، نیز وہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ، رحمٰن و رحیم، سُبحان و صمد، عزیز و قدیر اور حیّ و قیّوم ہے۔ علاوہ بریں، وہ غنی ہے اور جملہ مخلوقات اس کی محتاج و سائل ہے؛ لہٰذا کوئی ہستی چاہے کتنی برگزیدہ و مقرّب کیوں نہ ہو، اس کی مخلوق و مربوب، محکوم و غلام اور فقیر و سائل ہونے کی بنا پر اس کی ذات و صفات یا کارو بارِ خدائی میں شریک نہیں ہو سکتی۔ "شرکت فی خدائی" کسی مخلوق کے مقدور ہی میں نہیں۔

صلوٰۃ کی حقیقت جامع و واضح طور سے سمجھنے کی خاطر ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے رشتے کی نوعیت کو معلوم کرنا لازم ہے۔ اس سے ہمارا رشتہ یہ ہے کہ وہ ہمارا ربّ بھی ہے اور اِلٰہ بھی۔ ربوبیّت اور اُلوہیّت کے یہ دونوں رشتے از بس اہم ہیں، اور اس غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان رشتوں کے ادراک و عرفان اور ایقان و اذعان کے بغیر انسان ربّ العالمین کا سچا عبد و عابد نہیں بن سکتا؛ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ گمراہ و منافق،

مُشرک و بت پرست (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اور ظالم و جاہل بن جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس رشتے کا ادراک و ایقان، انسان کو متقّی و مؤمن، مجاہد و صالح اور شہید و صدّیق بناتا ہے۔ اب ان دونوں رشتوں سے علیحدہ علیحدہ بحث کی جاتی ہے۔

(۱) توحیدِ ربوبیّت:

اس کا معنیٰ و مفہوم یہ ہے کہ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی ربّ العالمین ہے۔ ربّ، قرآنِ حکیم کی وسیع المعانی بنیادی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تنہا اور فقط اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ ہی نہ صرف افرادِ نسلِ انسانی بلکہ کُل مخلوقات کا خالق و رازق، پروردگار و مالک اور حاکم و بادشاہ ہے؛ نیز تنہا وہی سب کا ناصر و حافظ، کارساز و وکیل، مولیٰ و حبیب، دستگیر و مُشکل کُشا اور حاجت روا و مجیب الدّعوات ہے۔ چونکہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، لہٰذا اس کی صفاتِ حسنہ میں اس کا کوئی شریک ہے نہ ہوسکتا ہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بشر ہر حال میں ربّ العالمین کا بندہ و فقیر ہی رہتا ہے، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کتنا ہی عظیم و برگزیدہ کیوں نہ بن جائے۔ عبدیّت کا خاصّہ عبودیّت ہے معبودیّت نہیں؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی صفات یا خدائی میں شریک ہونا عبد کے مقدور ہی میں نہیں۔ توحید کا سِرّ الاسرار یہ ہے کہ انسان کی برگزیدگی اور عُلوِّ مرتبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا مُخلص بندہ و فقیر اور سائل بن جائے۔ چنانچہ جو شخص (فرد ہو یا قوم) اللہ جَلَّ شانُہٗ کے سوا کسی اور ہستی یا ہستیوں کو صفتِ ربوبیّت کا حامل سمجھتا ہے اور اپنے اس جہل کے نتیجے میں وہ غیر اللہ کو اپنی مدد و حاجت روائی اور دستگیر و مُشکل کشائی وغیرہ وغیرہ کے لیے پکارتا ہے، وہ ربّ وحدہٗ لاشریک کی نظر میں مُشرک ہے اور شرک ظُلمِ عظیم، گناہِ کبیرہ اور ناقابلِ معافی جرم ہے، اور مُشرک پر جنّت حرام ہے۔

تاریخِ دین بتاتی ہے کہ ہر زمان و مکان میں نبوّت و رسالت کا بنیادی فریضہ شرک و

بُت پرستی کے سرطانی (= فرعونی وہامانی اور قارونی وآزری) اداروں کا اِستیصال کرنا اور رب العالمین کے بندوں کو غیر اللہ کی محکومی وغلامی سے نجات دلانا، شرک وکفر کے اندھیروں اور پستیوں سے نکال کر توحید کی روشنی میں لانا اور انسانیت کی معراجِ کمال پر پہنچانا تھا۔ یہ ارفع واعلیٰ حسنُ المقام ان اہلِ آرزو مومنوں کو نصیب ہوتا ہے جو سچے موحّد ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ سچے موحّد ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مخلص وانعام یافتہ بندے، دوست (= اولیاء اللہ) اور اصحاب الجنۃ ہوتے ہیں، وہی خوف وحزن کے کرب اور عذابُ النّار سے محفوظ ومصئون رہتے ہیں اور انہیں کو اپنے معروضِ حسن وعشق کا قرب ورضوان اور دید وحضوری ایسی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ یہ اجرِ عظیم ہے توحیدِ ربوبیّت پر قولاً وفعلاً ایمان لانے اور اس عقیدے کے مطابق زندگی کرنے اور اس پر ہر حال میں ثابت قدم رہنے کا؛ نیز یہ مقصودِ حیات، غایتِ دین اور مشیّتِ الٰہی ہے۔ اس فلسفۂ توحید کو قرآنِ مجید نے اپنے حسین وایمان افروز الفاظ و اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ..... نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ

(حٰمٓ السجدۃ ۴۱ : ۳۰-۳۲) جن لوگوں نے کہا: اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس (عہد) پر ثابت قدم رہے (کسی اور ہستی کو رب سمجھا نہ مانا)۔ یقیناً ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: نہ خوف کھاؤ نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے اولیاء یعنی دوست و سرپرست ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا اور ہر شے جس کی تمھیں طلب وآرزو ہوگی، تمھاری ہوگی۔ یہ سامانِ ضیافت ہے اس ہستی کی طرف سے جو غفور ورحیم ہے (نیز دیکھیے الاحقاف ۴۶: ۱۳)۔

ان آیاتِ جلیلہ میں تفکّر بالحق کرنے سے دین وحیات کے اس اصل الاصول سے آگہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ربوبیّت اور اپنی مربوبیّت کا رشتہ انسان کے لیے غیر معمولی

اہمیت رکھتا ہے اور اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو سمجھنے، قول و فعل سے تسلیم کرنے اور استوار رکھنے سے وہ شرک و بُت پرستی، کفر و نفاق، اقتصادی بدیانتی و ناانصافی، خیانت و سرقہ، فرعونی، ہامانی، قارونی و آذری؛ ضمیر و قلم فروشی، عصمت و جسم فروشی، آیات فروشی و قوم فروشی؛ نیز تذلیل و تحقیرِ انسانی، ضلالت و شقاوت، خوف و حزن اور عذابُ النّار سے محفوظ و مصئون بھی رہتا ہے اور اُسے قرب و رضوانِ "دوست"، دُنیوی و اُخروی حسنہ، فلاح و کامیابی، مادّی ترقی و جمالیاتی اِرتقاء، طمانیت و جمالیاتی ثروت، امن و سلامتی؛ نیز ربِّ ذوالجلال والاکرام کی جنّت اور رحمت و مغفرت ایسی عظیم نعمتیں میسّر آتی ہیں۔

جُملہ بنی نوعِ انسان، ربّ العالمین کے حسین تخلیقی شہکار، عیالُ بندے اور پروردہ ہیں اور بلا امتیازِ کفر و ایمان وہ سب کو روزی دیتا، ان کی پرورش کرتا، ان کی آرزوئیں پوری، دُعائیں قبول اور کوشش مشکور کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے فلسفۂ ربوبیّت پر غور و فکر کرنے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ معیشت ہماری زندگی میں بنیادی حیثیّت رکھتی ہے اور دین کا مقصد عدل و احسان کی بنیاد پر ایسا معاشی نظام قائم کرنا ہے، جس میں کفالتِ اجتماعیہ کا احسن و اکمل بندوبست کیا جائے، قومی دولت کی گردش کا دائرہ کُل معاشرے کو محیط ہو اور ایک فرد بھی بے گھر، بھوکا پیاسا، ناخواندہ اور محروم و محتاج نہ رہے؛ نیز اس میں سود ہو نہ سودی سرمایہ کاری، جاگیرداری ہو نہ مزارعت، مضاربت ہو نہ بینکاری یا ساہوکاری؛ الغرض، معاشرے کا نظام ایسا حسین و طیّب ہو کہ اس میں فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری اداروں کا فُقدان ہو۔ اس ضمن میں اسلام کا یہ اصل الاصول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نظامِ زکوٰۃ کو نظامِ صلوٰۃ مستلزم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح علم کی تحصیل کے لیے اس کی طلب و آرزو کا ہونا ضروری ہے اور معلّم کے لیے طالب علموں کو تعلیم دینے کے ساتھ ان کا تزکیہ کرنا بھی لازمی ہے تاکہ ان میں علم کی آرزو کے ساتھ استعدادِ تحصیل بھی قوّت سے فعل میں آجائے؛ بعینہٖ نظامِ زکوٰۃ کے ساتھ نظامِ صلوٰۃ کا قیام بھی ناگزیر ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کے اِلٰہ و ربّ کے عشق کی شمع روشن

ہوجائے اور اس کی تب و تاب سے ان میں اس کے حسین تخلیقی شہکاروں کے لیے رحمت بن جانے کی آرزو بھی زندہ و بیدار ہوجائے۔ علاوہ بریں، صلوٰۃ کی تاثیر سے اہلِ ایمان میں عادل و محسن، متقی و صالح اور شہید و صدّیق بننے، اللہ تعالیٰ کے احکام ایتائے زکوٰۃ و انفاق بالعفو پر عمل کرنے اور کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنے، نیز معاشرے کو سرطانی معاشرتی امراض، مثلاً شرک و بت پرستی، ظلم و جہل، استحصال و ناانصافی، افلاس و احتیاج، بخل و ناخواندگی، اسراف و تبذیر، تکاثر و سود، فحشاء و منکر وغیرہ وغیرہ سے محفوظ رکھنے کی طلب و جستجو پیدا ہوجائے۔

قرآنِ حکیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّتِ حسنہ کی رُو سے زکوٰۃ کی غایتِ حقیقی ہی کفالتِ اجتماعیہ ہے۔ ہمیں یہ بات واضح طور سے ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ ''ایتائے زکوٰۃ'' قرآنِ حکیم کی ذومعنی اصطلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں: جس طرح حکومت کو زکوٰۃ دینا ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر فرض ہے، اسی طرح رعایا سے زکوٰۃ وصول کرکے اہلِ احتیاج کو دینا حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔ حکومت کے بارے میں ایتائے زکوٰۃ کے فرمانِ الٰہی کا مطلب کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا ہے۔ اس کی مثال ہمیں عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے دَور میں ملتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کفالتِ اجتماعیہ کی ذمّے داری حکومت کی ہے، لیکن اسے اپنی اس ذمّے داری کا احساس دلانا اور اسے اس سے عہدہ برآ ہونے پر مجبور کرنا افرادِ معاشرہ پر فرض ہے، اور ایسا نہ کرنا، قرآنِ حکیم کی رُو سے تکذیبِ دین ہے (الماعون ۱۰۷: ۱ تا ۷)۔ اصل یہ ہے کہ معاشی زندگی میں توازن برقرار رکھنا حکومت کی اہم ترین ذمّے داریوں میں سے ہے؛ لہٰذا ربّ العالمین کے ذرائعِ پیداوار اور پیداوار کو، جو جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے ہیں، ان میں عدل و احسان کے فطری یا قرآنی اصول کے مطابق تقسیم کرنے کا بندوبست کرنا حکومت کا اہم فریضہ ہے۔

فلسفۂ توحیدِ ربوبیّت کے سلسلے میں ہمیں انسان کی اس نفسیاتی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا

چاہیئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اُسے ایک تو ارادہ واختیار کی آزادی امانت کے طور پر عطا کی ہے، اور دوسرے اس میں قبضہ وتصرّف، سلب ونہب، فساد وتخریب، اکتناز واحتکار، بُخل وتکاثُر، اسراف وتبذیر، استحصال وجلبِ منفعت اور مفت خوری کے داعیات بھی پائے جاتے ہیں، جن کے لیے مغربی علمائے نفسیات (مثلاً میکڈوگل وغیرہ) نے INSTINCTS کی اصطلاح وضع کی ہے، جس کا ترجمہ اُردو میں "جبلّتیں" کیا جاتا ہے۔ ان داعیات کو نفسِ امّارہ پیدا کرتا اور شیطان سے مل کر ان کو مزیّن کر کے دکھاتا رہتا ہے تاکہ انسان اس جمالیاتی فریب میں آکر ان کی تشفّی کرنے میں لگ جائے۔ اپنے اس طریقِ واردات کے ذریعے شیطان اقتصادی فساد برپا کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں افراد قلبی یا نفسیاتی بیماریوں میں اور معاشرہ سرطانی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اقتصادی فساد کے سدِّباب کے لیے ربّ العالمین نے اہلِ ایمان کو قرآن وسُنّہ کے مطابق صلوٰۃ وزکوٰۃ کے نظامِ توحیدِ ربوبیّت واُلوہیّت کی اساس پر استوار کرنے اور چلانے کا حکم دیا ہے۔

قرآنِ حکیم، سُنّتِ حسنہ اور اُثار کی رُو سے توحیدِ ربوبیّت پر ایمان لانے کا مطلب اسلام کے مندرجۂ ذیل عقائد اور اصولوں کو تسلیم کرنا اور ان کے مطابق زندگی کرنا ہے:

اوّل : اللہ تعالیٰ جملہ افرادِ نسلِ انسانی کا ربّ ہے اور وہ سارے اس کے عیال، بندے اور فقیر وسائل ہیں (الفاتحہ ۱: ۲؛ الدّخان ۴۴: ۸؛ فاطر ۳۵: ۱۵؛ الرّحمٰن ۵۵: ۲۹)۔

دوم : اس نے آسمانوں اور زمین میں کُل نعمتیں، مثلاً ذرائعِ پیداوار اور پیداوار، اپنے سارے بندوں کے تمتّع کے لیے پیدا کی ہیں (البقرۃ ۲: ۳۶؛ الاعراف ۷: ۲۴ وبمواضعِ کثیرہ)۔

سوم : اجتماعی ذرائعِ پیداوار اور دیگر نعمتوں سے لوگوں کو عدل واحسان اور سعی ومحنت کے قرآنی اُصولوں کے مطابق مستفید ہونے کا موقع دینا حکومت اور ہر فردِ بشر پہ لازم ہے (الشّوریٰ ۴۲: ۱۵؛ النّحل ۱۶: ۹۰؛ النّجم ۵۳: ۳۹؛ البلد ۹۰: ۴)۔

چہارم : محنت کر کے روزی کمانا ہر انسان پر فرض ہے (التوبۃ ۹: ۷۹)۔

پنجم : کسبِ حرام کی ہر شکل، مثلاً سود کی ہر صورت (مزارعت یا بٹائی، مضاربت، کرایہ، پگڑی، سودی سرمایہ کاری، بینکاری یا ساہوکاری، حصص و تمسکات، بانڈوں، سرٹیفکیٹوں وغیرہ وغیرہ پر فائدہ یا نفع جو ربٰو ہے، وغیرہ وغیرہ)؛ قوم فروشی، قمار بازی، منشیات فروشی، سمگلنگ، چور بازاری، گراں فروشی، اقتصادی بددیانتی، سٹہ بازی، لاٹری، نسر بازی، چوری، ڈکیتی، رہزنی وغیرہ وغیرہ، نذرانے، چڑھاوے، رشوت، جرم و گناہِ کبیرہ ہیں (البقرۃ ۲: ۲۷۵؛ الاعراف ۷: ۱۵۷، و بمواضعِ کثیرہ)۔

ششم : زکوٰۃ یا کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا فرض ہے اور اسے قائم نہ کرنا یا ایسا کرنے کی حکومت و معاشرہ کو ترغیب نہ دینا تکذیبِ دین ہے (الماعون ۱۰۷: ۱ تا ۷؛ الحاقہ ۶۹: ۳۴؛ الفجر ۸۹: ۱۸)۔

ہفتم : اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو یعنی جائز ضرورت سے زائد مال و دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنا یا حکومت کے حوالے کر دینا فرض ہے (البقرۃ ۲: ۲۱۹)۔

ہشتم : ربِ کریم نے انسان کو زندگی دی ہے، بشر بنایا ہے، اس کو بدنی و حسی اور قلبی و نفسی قوتیں عطا کی ہیں؛ اور اسے زندہ رکھنے اور آرام و راحت سے زندگی گزارنے کے قابل بنانے کی خاطر زمین میں ان کے لیے گوناگوں نعمتوں کے خزینے چھپا کر رکھ دیے ہیں؛ اور ہر چیز کی طرح انسان کو زوجین بنایا ہے تاکہ نسلِ انسانی زندہ و باقی رہے۔ چونکہ انسان کی کوئی چیز اپنی نہیں، نہ جسم و جان اور نہ علم و اولاد؛ لہٰذا وہ جو مال و دولت کماتا ہے، اس کا مالکِ حقیقی ربّ العالمین ہے، وہ صرف امین ہے؛ لہٰذا جس طرح وہ اپنی بیوی بچوں، حتّٰی کہ اپنی جان تک کو ہلاک کرنے کا شرعاً و قانوناً مجاز نہیں، اسی طرح وہ شرعاً "اپنے" مال و دولت کو اکتناز و احتکار اور اسراف و تبذیر کے ذریعے ہلاک نہیں کر سکتا؛ اور اس طرح وہ محروم و محتاج لوگوں کو ان سے مستفید ہونے سے نہیں روک سکتا۔

ربِّ علیم و خبیر کو علم تھا کہ نفسی۔ ابلیسی شیطان کی وسوسہ اندازی و جالیاتی فریب کاری کے

سبب انسان میں اپنی آزادیِ ارادہ و اختیار کو غیر فطری یا ناجائز طور سے استعمال اور زمین پر فساد کرنے کے امکانات موجود ہیں، جو اس کے دمِ واپسیں تک رہیں گے، لہٰذا اس نے انسانی معیشت میں توازن اور معاشرے میں امن و سلامتی قائم رکھنے کی خاطر اُسے خلافتِ ارضی تفویض کی ہے۔ خلافت یا حکومت کے امور کو عدل و انصاف سے سرانجام دینے کے قابل بنانے کی خاطر ربُّ العالمین نے محض اپنے فضل سے اُسے موضوعی۔ معروضی ہدایت سے نوازا ہے۔ موضوعی ہدایت سے مراد اس کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام، خصوصاً عقل و وجدان اور علم و حکمت کا نور ہے اور معروضی ہدایت کا مطلب وحی و تنزیل اور اسوۂ پیغمبری کی روشنی ہے۔

الغرض، فلسفۂ توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا ربّ العالمین کا نعمت کدہ ہے، جو اس کی جُملہ مخلوقات، خصوصاً کُل بنی نوعِ انسان کے لیے ہے۔ اس میں سے سب کو سعی و محنت کرکے، سب کی ضروریات کے حوالے سے عدل و احسان کے اصول کے مطابق، بقدرِ ضرورت اپنا حق یا حصہ لینا چاہیے؛ نیز رعایا اور حکمران ہر حیثیت سے اُسے خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی شخص اپنی معذوری، ضعیفی، بیماری، بیکسی، اسیری یا کسی اور وجہ سے اپنے ربِ کریم کی نعمتوں میں سے اپنے حصے سے محروم نہ رہے۔ یہ ہے دینِ اسلام کا اصل الاصول، فلسفۂ توحیدِ ربوبیت کا لُبِّ لباب اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی غایت اور آپؐ کی سُنّتِ حسنہ۔

(۲) توحیدِ اُلوہیت:

اللہ تعالیٰ سے انسان کے رشتے کی نوعیت یہ بھی ہے کہ وہ ربّ کے ساتھ ہمارا اِلٰہ بھی ہے۔ وہ کیوں ہمارا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا جمالیاتی زبان میں معروضِ حُسن و عشق ہے؟ اس سوال کا ایک لفظی جواب یہ ہے کہ وہ "الحُسن" ہے۔ چونکہ وہ الحُسن ہے، اس لیے اسے حُسن سے محبت بلکہ عشق ہے؛ اور وہ سُبحان و صمد، رحمٰن و رحیم، وہّاب و کریم، الحیّ ذوالقیوم اور عزیز و قدیر ہے؛ نیز وہ احسن الخالقین ہے اور اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔

تزویجی ہے، لہٰذا اس کی ہر تخلیق حسین اور جوڑا جوڑا ہے۔ علاوہ ازیں، جمال و جلال، رنگ و بُو، نُور و حیات اور رحمت و نظافت چونکہ حُسن کے عناصرِ امتزاجی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر شئے کو محیط ہے (غافر ۴۰: ۷)؛ اور وہ زندہ ہے؛ اگرچہ ہر مخلوق کی زندگی کی نوعیت جداگانہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا حقیقی معروضِ حُسن و عشق ہے، لہٰذا ہمیں اپنی جُملہ محبوب چیزوں سے شدید ترین محبّت اس سے کرنی چاہیے (البقرۃ ۲: ۱۶۵)؛ یہ ہماری فطرت کا تقاضا بھی ہے اور مشیّتِ ایزدی بھی۔

عشقِ الٰہی کی تاثیر یہ ہے کہ اس سے انسان میں تقویٰ و ایمان، ذکر و پرستش، اطاعت و بندگی اور تسلیم و رضا ایسے خصائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ان اصطلاحات کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے:

(۱) تقویٰ:

اس کے دو معانی ہیں: ایجابی اور سلبی۔ ایجابی معانی ہیں: اپنے اللہ کو خوش رکھنے، اس کے احکام کے مطابق حسین و مطمئن زندگی گزارنے اور اس کے جادۂ مستقیم پر گامزن رہ کر اس تک پہنچنے کی آرزو و جستجو۔ اس کے سلبی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل، اس کی ناراضی، دوری، اپنی محرومی و نامرادی اور عذابُ النّار کا خوف پایا جاتا ہے، جسے خشیتِ الٰہی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم تقویٰ کے لیے "آرزو" کی تعبیر بھی اختیار کرتے ہیں: اپنے معروضِ حُسن و عشق کے قرب و وصال، حضوری و رضوان اور اس کی جائے بقا جنّت کی، جو انسان کا حُسنُ المآب بھی ہے؛ نیز خوف و حزن کے کرب اور عذابُ النّار سے محفوظ و مصئون رہنے کی آرزو۔

(۲) ایمان قرآنِ مجید کی بنیادی اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں طمانیت انگیز یقینِ محکم؛ اور بلحاظِ شرع اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی توحیدِ الوہیّت و ربوبیّت، اس کے انبیاءؑ و رسلؑ، ملائکہ، کتب اور آخرت کو دل و جان اور قول و فعل سے تسلیم کرنا، اور ان

عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کے مطابق زندگی کرنا۔ یہ ایمان بالحق ہے، جس میں آفاقی اتحاد و مفاہمت، عدل و احسان اور محبت و قربانی کی بنیادیں فراہم کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کی ضد و نقیض کُفر اور ایمان بالباطل ہے، جس میں عالمگیر فساد و تخریب، ظُلم و استحصال اور جنگ و جدال کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

(۳) **ذِکر** سے مراد اللہ تعالیٰ کو محبت سے یاد کرنا، اس کی آرزو کرنا، اس کی حمد و ثنا اور اسمائے حُسنیٰ کا ورد کرنا، اس کی باتوں پر غور و فکر اور تذکرہ کرنا؛ اس کی کتاب آخر و مطہّر، قرآنِ مجید کو پڑھنا، اس میں تدبّر بالحق کرنا، اس کا ابلاغ کرنا ہے۔ ذکر کی ایک اکمل و احسن صورت صلوٰۃ ہے۔ قرآنِ مجید بھی ذِکر ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو "ذِکر" کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ الحسن ہے، لہٰذا اس کے ذِکر سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حُسن کی تاثیر طمانیت آفرینی و سُرور انگیزی ہے۔

(۴) **پرستش** کی احسن و اکمل شکل اسلام کی صلوٰۃ ہے۔ چونکہ اس میں معروضِ حُسن و عشق کا ذِکر ہوتا ہے، اس لیے یہ قرّۃ العین ہے؛ اس سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے، جمالیاتی اِرتقاء ہوتا ہے اور "دوست" کا قُرب و رضوان حاصل ہوتا ہے، اور نمازی نفسِ مطمئنّہ بنتا ہے جو قرآنِ مجید کی رُو سے وارثِ جنّت ہے (الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰)۔ عشق کا تقاضا اور مشیّتِ الٰہی یہ ہے کہ اہلِ آرزو اپنے اِلٰہ کو یاد کرنے کے لیے کم سے کم پانچ اوقاتِ مقررہ پر اس کے گھر میں صلوٰۃ قائم کریں۔ لیکن جہاں تک اسے یاد کرنے کا تعلق ہے، اسے ہمہ وقت یاد کرنا شیوۂ اہلِ عشق و وفا ہے، جن کا مقولہ ہے:

جو دم غافل سو دم کافر

ذِکرِ الٰہی میں تاثیرِ برقِ حُسن ہوتی ہے، جو اہلِ جذب و شوق اپنے معروضِ حُسن و عشق کو یاد کرتے ہیں، الحسن اُن کو یاد کرتا ہے اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا یاد کرنا، ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے، جس کا کوئی بشر اندازہ نہیں کر سکتا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ بیگار یا چٹی سمجھ کر عادت کے طور پر یا دکھاوے کی خاطر صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، ایسی صلوٰۃ حسن و معنیٰ سے محروم اور مردہ و بے اثر ہوتی ہے۔ ہمیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ صلوٰۃ کو زندہ، حسین اور قرۃ العین و مؤثر بنانے کے لیے اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ناگزیر ہے۔

(۵) **اطاعت** کا مطلب ہے: معبود و محبوب کی خوشنودی کی خاطر دل و جان سے اس کی فرماں برداری کرنا، اسے مطاعِ حقیقی سمجھنا، اور اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا اور حیل و حجت نہ کرنا۔ انگریزی کے ایک شاعر کا یہ مصرع اِطاعت کے جامع مفہوم کا آئینہ دار ہے: NOT TO REASON WHY, BUT TO DO AND DIE.

(۶) **بندگی** سے مراد انسان کا اپنے آپ کو صرف اور تنہا اپنے اِلٰہ کا بندہ و پرستار اور صرف اسی کو اپنا معبود سمجھنا اور مدد کے لیے پکارنا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (البقرۃ ۲: ۱۶۳)، اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۱۲: ۶۷) کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنے اندر روح کی طرح جذب کر کے ان کے مطابق زندگی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا اِلٰہ سمجھنا، نہ بنانا اور نہ کسی اور کی حاکمیتِ اعلیٰ کو تسلیم ہی کرنا۔ حکم ماننا تو صرف اللہ تعالیٰ کا؛ بندہ و محکوم بننا تو صرف اور تنہا اپنے اِلٰہ و ربّ کا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکمِ اعلیٰ اور مالک تسلیم نہ کرنا۔

(۷) **تسلیم و رضا**: اس کا مطلب ہے راضی برضا رہنا؛ اس کی ہر عطا کو حسنہ ہو یا عسرت و نقصِ مال و اولاد وغیرہ کو بطیبِ خاطر قبول کرنا؛ امتحان کتنا کٹھن، دشوار، صبر آزما بلکہ شکیب رُبا کیوں نہ ہو، صبر و استقامت سے گزرنا، مایوس و نا اُمید نہ ہونا، بلکہ اس پر توکل رکھنا اور پُر اُمید رہنا۔

قرآنِ مجید نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے رشتے کی نوعیت کو فلسفۂ توحیدِ اُلوہیت کے حوالے سے اپنے ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے: (۱) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (البقرۃ ۲: ۱۶۳ و بمواضع کثیرہ)، کوئی اِلٰہ نہیں بجز اللہ کے۔ (۲) اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

(یوسف ۱۲: ۶۷) : آئین و حکمرانی یا حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ کی ہے۔

پہلے کلمۂ طیبہ میں "لا" کو "الّا" پر مقدم رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ جب تک ان تمام ہستیوں کی نفی و تکذیب نہ کی جائے، جو یا تو خود زبان یا عمل سے اپنی اُلوہیت یا خدائی کی مُدّعی ہوں یا جن کو مُشرکوں نے اپنے ظُلم و جہل سے اپنا اِلٰہ بنالیا ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ مُدّعیانِ اُلوہیت کو فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری سرطانی و استحصالی اداروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ سرطانی ادارے لوگوں پر اپنا حُکم چلاتے، ان کی تذلیل و تحقیر اور ان کا استحصال کرتے؛ نیز انھیں ان کے انسانی حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں، لوگوں کو اپنا دست نگر و محتاج اور محکوم و غلام بناتے، ان پر حکمرانی کرتے نیز جلبِ منفعت اور اکتناز و احتکار کی خاطر وہ سیاسی، مذہبی، اقتصادی، ثقافتی اور عسکری زندگی میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔ ان معاشرتی سرطانوں کا یہ شعارِ زندگی ان کی اس نفسیاتی کیفیت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنے بندے سمجھتے اور ان سے غلاموں ایسا سلوک روا رکھتے ہیں۔ یہ اگر دعوائے خدائی ہے اور یقیناً ہے تو پھر یہ استحصالی ادارے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے دشمن ہوئے؛ لہٰذا ان کا استیصال انسان کی دُنیوی و اُخروی حسنہ اور خوف و حزن کے عذابُ النّار سے اس کی نجات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ ہے فلسفۂ توحیدِ اُلوہیت کا لُبِّ لباب، جس کے ادراک و ایقان کے بغیر انسان اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے، نہ اپنے اِلٰہ و ربّ کو؛ اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی سچّی عبادت ہی کرسکتا ہے؛ اور عبادت اصل میں صلوٰۃ و زکوٰۃ سے عبارت ہے۔

غور کریں تو ہم اسے فلسفۂ صلوٰۃ سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ہم صلوٰۃ قائم ہی اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق و رازق اور پروردگار و مالک بھی ہے اور ہمارا معبود و مقصود اور معروضِ حسن و عشق بھی، اس لیے کہ وہ الحق والحُسن ہے۔ مختصر یہ کہ عبادت کا حُسن صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃ کا حُسن اللہ تعالیٰ سے ہمارے رشتے کا علم و یقین ہے۔

اِتّباعِ سُنّتِ حسنہ

صلوٰۃ کا ایک بنیادی تقاضا نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اِتّباع ہے۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ ہر زمان و مکان کے عظیم و مثالی انسان ہیں۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کا اِتّباع کر کے ہم بھی عظیم انسان بن سکتے ہیں: صالح، شہید اور صدّیق، نیز نوعِ انسانی سمیت جُملہ مخلوقات کے لیے "رحمت" بن سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ کی عظمت کا راز آپؐ کی صفتِ رحمۃٌ لّلعالمینی میں مضمر ہے۔ تاریخ اور کتبِ سماوی شاہد ہیں کہ آپؐ نے ایک فقیدالمثال حسنِ انقلاب کے ذریعے اہلِ عرب کو سرطانی اداروں کی غلامی و محکومی سے نجات دلائی اور ایک مثالی معاشرہ قائم کیا، جو اخوّت، مساوات، عدل و احسان، مواخاۃ و محبّت، ایثار و قربانی اور امن و سلامتی کی جنّت تھا۔ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم تھے۔ اس کے نتیجے میں اس میں صدّیقین، شہدآء اور صالحین کی کثرت تھی اور سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا فُقدان تھا۔ علم ناآشنا اہلِ عرب کا اس طرح تزکیہ کیا گیا کہ ان میں علم و حکمت اور ہنر و فن سیکھنے سکھانے، تلامیذ القرآن بننے اور دوسروں کو بنانے، نیز اپنے اور دوسروں کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کرنے اور اولاد سمیت دیگر مخلوقات کے لیے رحمت بن جانے کی آرزو زندہ و فعّال ہوگئی۔ انھیں یعنی مرد و زن کو بنیادی حقوق ملے تو انھوں نے پیغمبرِ اعظم و آخر اور رحمۃٌ لّلعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تحریکِ رحمۃٌ لّلعالمینی کے ذریعے اقوامِ عالم کو انسان کے بنیادی حقوق سے روشناس کرانے اور مظلوم و محروم، محکوم و غلام اور محتاج و مفلوک الحال افرادِ نسلِ انسانی کو ان کے بنیادی حقوق دلانے کی خاطر جہاد و اجتہاد کیا۔

آپؐ کی تحریکِ رحمۃٌ لّلعالمینی جو دراصل آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے، اس کا مقصد شرک و

بُت پرستی، کفر و نفاق، سود خوری و حرام کاری، ظُلم و استحصال، ناخواندگی و جہالت، لسانی، قبائلی، الوانی اور طبقاتی عصبیت اور معاشرتی سرطانیت کا اِستیصال کرنا اور لوگوں کو موحِّد اور اللہ تعالیٰ کے بندے بنانا اور ان کے قلوب میں عشقِ الٰہی کی شمع فروزاں کر کے ان میں حُسن و حیاتِ طیبہ، حُسنِ خُلق، دُنیوی و اُخروی حسنہ، حُسنِ انقلاب، مادّی وجمالیاتی اِرتقاء اور جنّت کی آرزو کا اِحیاء کرنا تھا۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ آپؐ کی بے مثال محنت ومشقّت، سعی وجہد، اجتہاد وجہاد، ایثار و قربانی، صبر و تحمّل اور خُلقِ عظیم کی بدولت اسلام کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمین، جس نے مستقبل میں عالمگیر بننا تھا، اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی۔ ہم اپنے اس موقف کے ثبوت میں کہ آپؐ کی سُنّتِ حسنہ حقیقت میں رحمۃٌ للعالمین اور خُلقِ عظیم ہے، دو آیاتِ جمیلہ پیش کرتے ہیں:

(۱) وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (الانبیاء ۲۱: ۱۰۷): [اے نبیؐ] ہم نے آپؐ کو عالموں (مثلاً عالمِ انسانی، عالمِ حیوانی، عالمِ نباتاتی، عالمِ جماداتی، عالمِ بحری، عالمِ سماوی وغیرہ وغیرہ) کے لیے رحمتِ محض بنا کر (دنیا میں) بھیجا ہے۔

(۲) وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۝ (القلم ۶۸: ۴): [اے رحمۃٌ للعالمینؐ] یقیناً آپؐ صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں۔

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اِتباع میں خلیق بننا اور حُسنِ خُلق کا مظاہرہ کرنا، اور افرادِ نسلِ انسانی اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت بننا، اصل میں پیرویِ سُنّتِ حسنہ ہے۔ یہ دین کی غایت، مشیّتِ ایزدی اور صلوٰۃ کا اہم ترین تقاضا ہے۔ یہ عشقِ الٰہی کا تقاضا بھی ہے اور جو مومن یہ تقاضا پورا کرتا ہے، وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کا محبوب و ولی بن جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہے مندرجہ ذیل آیۂ جمیلہ کا:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (آلِ عمران ۳: ۳۱): کہہ دو! اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو

میرا اِتّباع کرو۔ اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمھاری خطاؤں کو تمھاری خاطر معاف کردے گا۔ اللہ بڑی مغفرت کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

اس سے یہ اصلِ عظیم آشکارا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے محبّت کا اعتبار اِتّباعِ رسولؐ ہے؛ اور اِتّباعِ رسولؐ اللہ تعالیٰ کی ولایت و مغفرت اور رحمت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی ہمیں آگاہ کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی حقیقت میں کفر ہے اور ایسے کافروں سے اللہ تعالیٰ کے محبّت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (آلِ عمران ۳: ۳۲)۔

صلوٰۃ جن چیزوں کی تربیّت کرتی ہے، مثلاً نظم وضبط، اِتّباع واطاعت وغیرہ وغیرہ کی؛ ان چیزوں کے کرنے کا وہ مطالبہ بھی کرتی ہے۔ جو نمازی صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، وہ اس کی افادی قدروں سے محروم رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ان کی صلوٰۃ بے جان وغیر مؤثر ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ صلوٰۃ ان اہلِ حسن وسرور کی حسین ومنیر اور زندہ ومؤثّر ہوتی ہے، جو اس کی جمالیاتی۔ افادی اقدار سے مستفید ہونے کی خاطر اس کے تقاضے پورا کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اِتّباعِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم صلوٰۃ کا اہم ترین تقاضا ہے تو بیجا نہ ہوگا، بلکہ اِظہارِ حقیقت ہوگا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اِتّباعِ رسولؐ سے اللہ تعالیٰ کی ولایت ورحمت اور مغفرت ایسی عظیم نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔

زکوٰۃ

میں اسے اعجازاتِ قرآنی میں سے سمجھتا ہوں کہ وہ اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ اِیتائے زکوٰۃ کا بھی حکم دیتا ہے۔ اس سے مقصود اہلِ ایمان میں اس حقیقت کا شعور پیدا کرنا ہے کہ صلوٰۃ کو زکوٰۃ مستلزم ہے اور جب تک اہلِ ایمان اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ اِیتائے زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں کرتے اُن کی صلوٰۃ ان کی موضوعی دمعروضی یا انفرادی واجتماعی زندگی پر اپنے تاثرات مرتب نہیں کرے گی۔ یہ یاد رہے کہ صلوٰۃ ہمارے باطنی یا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام سے تعلق رکھتی ہے اور زکوٰۃ کا تعلق ہماری خارجی یا معاشی زندگی سے ہے؛ لیکن دونوں کے حسین ومنیر اثرات ہمارے خُلق و کردار پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

صلوٰۃ کا بنیادی وظیفہ حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کا اور زکوٰۃ کا وظیفہ ہمارے خارجی نظام زندگی کا تزکیہ کرنا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں تزکیہ کا مطلب تطہیر و تصفیہ اور نشوونما کرنا ہے لیکن یہ دونوں نظام ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ صلوٰۃ اگر دل میں تقویٰ، عدل و احسان، ہمدردی وغمگساری، اخوت و مساوات، محبت وخیر سگالی، صدقہ وخیرات، زکوٰۃ و انفاق بالعفو اور ایثار وقربانی کے داعیات پیدا کرتی ہے تو زکوٰۃ ان داعیات کی تکمیل کرتی ہے۔ اس سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں: اِیتائے زکوٰۃ سے ایک طرف قومی دولت کی گردش کا دائرہ سکڑنے کے بجائے وسیع تر ہوتے ہوتے قوم مُلت بلکہ دوسری اقوام کو بھی محیط ہو جاتا ہے اور اس سے قوم کی دولت میں افزونی، اس کی زلیست میں فراخی اور معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ دوسرے اُس کے مثبت وحسین اثرات زندگی کے دیگر شعبوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں قوم ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کرتے کرتے مضبوط و ناقابلِ تسخیر بن جاتی ہے۔

یہاں تاریخی عمل کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ماضی میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ خوشحالی و ترقی یافتہ اقوام نے ان قوموں سے شکست کھائی اور ان کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوئیں جو ان کی بہ نسبت کم ترقی یافتہ اور کم خوشحال تھیں؟

قرآن مجید نے جا بجا یہ تاریخی واقعیت بیان کی اور اس کے دو بنیادی عوامل کی نشاندہی کی ہے؛ ایک کفرانِ نعمت اور دوسرا، مرگِ آرزو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کفرانِ نعمت کا مطلب عقل و فکر، علم و ہنر، دولت و آزادی اور قوت کا غلط استعمال اور امن و سلامتی کی ناقدری ہے؛ نیز معاشرے کی اصلاح کی بجائے اس میں فساد برپا کرنا ہے۔ فساد سے مراد ہر گوشۂ زندگی میں لوگوں سے عدل و احسان کرنے کے بجائے ان سے ناانصافی کرنا، ان پر ظلم کرنا، ان کا استحصال کرنا، امانت و دیانت کے بجائے خیانت و بددیانتی کرنا، احکامِ الٰہیہ کی تعمیل کرنے کے بجائے تکذیب کرنا، فحشاء و منکر کو اپنا شعارِ زندگی بنا لینا؛ نیز سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا فرعونی، ہامانی اور قارونی و آزری کرنا، اور رعایا کا ان کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے ان کی خوشامد اور ان سے تعاون کرنا ہے۔ مرگِ آرزو سے مراد ربِّ کریم کی نعمتوں کی طلب و جستجو کا فقدان ہے۔ چنانچہ جس قوم میں حسنِ زندگی، دُنیوی و اُخروی حسنہ، الحُسنیٰ یا معروف، حُسن و عشق، حسنِ مآب، حسنِ انقلاب اور مادی و جمالیاتی ارتقاء، نیز دُنیوی و اُخروی کامیابی کی آرزو نہیں رہتی اور اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ناقص اور ادھوری شکل میں؛ نیز وہ اپنے فطری وظائف احسن طریقے سے انجام نہیں دیتے تو اس کے نتیجے میں اس میں سرطانی ادارے قائم ہو جاتے ہیں جو اس کی ہلاکت و بربادی کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مسلم رعایا پر فرض ہے کہ وہ اسلامی حکومت کو زکوٰۃ دے اور حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت (= العفو) کو خود فی سبیل اللہ خرچ کرے یا حکومت اور رفاہی اداروں کو ایسا کرنے کے لیے دے، اسی طرح اسلامی حکومت کا اوّلین فریضہ نظامِ زکوٰۃ قائم کر کے رعایا کی کفالت کا حسنِ انتظام کرنا ہے۔ کفالتِ اجتماعیہ سے مراد رعایا

کی بنیادی ضروریات کا وسائلِ قومی کے مطابق حسنِ انتظام کرنا ہے۔ بنیادی ضروریات کا مطلب ہے: تعلیم و تربیّت، روزگار، روزی، مکان، کپڑا، علاج معالجہ، ماحول کی صفائی وغیرہ وغیرہ۔ حکومت اگر ایسا نہیں کرتی تو معاشرے میں سرطانی ادارے قائم ہو جاتے ہیں؛ ان کی وجہ سے معاشرے میں توازن برقرار نہیں رہتا، افراد میں طبقاتی عصبیّت پیدا ہو کر باہمی کشمکش ہونے لگتی ہے؛ اور دولت سرمایہ داروں کے درمیان ہی گردش کرنے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں قوم سرطانی بیماریوں اور بُرائیوں کا شکار ہو جاتی ہے، مثلاً افلاس و احتیاج، ظُلم و جہل، ناخواندگی و پس ماندگی، شرک و بُت پرستی، فحشا و منکر، اِقتصادی بدکرداری، خوشامد، نفاق، خود غرضی، بُخل و تکاثُر، اسراف و تبذیر اور ناانصافی و استحصال وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو سامنے کی بات ہے کہ پاکستان سمیت مُسلم اقوام میں کفالتِ اِجتماعیہ کا حُسنِ نظام دکھائی نہیں دیتا، اِلّا ماشاء اللہ۔ اصل یہ ہے کہ مسلم اقوام قُرآنِ مجید سے دُوری و مہجوری اور اس کی غیر معمولی اہمیّت و عظمت سے کم آگاہی کے سبب نہ تو اہلِ آرزو اور نہ متشکّر و صالح ہی ہیں، چنانچہ مرگِ آرزو اور کُفرانِ نعمت کی پاداش میں ان کا ایمان بھی مُردہ ہے اور وہ ان قوموں کی بھی حریف نہیں ہو سکتیں جو ایمان بالباطل رکھتی ہیں، اور اپنے یقین کی قوّت اور عمل کی حرکت و توانائی سے زندہ و توانا ہیں۔ مثال کے طور پر، آزادی بیش بہا نعمت ہے، اور یہ زندگی کا جمالُ جلال ہے۔ اس کی قدر کرنے کا مطلب زمانے کے حربی و دفاعی تقاضوں کے مطابق اس کے تحفّظ کا موزوں انتظام کرنا اور اس کی خاطر جدید ترین سامانِ حرب و ضرب، جان و مال اور زبان و قلم سے جہاد اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا ہے، لٰہذا جو قوم ایسا نہیں کرتی وہ کُفرانِ نعمت کرتی ہے۔ قُدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے جس نعمت سے کماحقّہ، استفادہ نہ کیا جائے اور اس کی حفاظت کا معقول بندوبست نہ کیا جائے یا اس نعمت کی آرزو برائے نام ہو تو وہ نعمت سلب کر لی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم میں دُنیوی و اُخروی حسنہ اور حُسنِ زندگی کی آرزو نہ رہے تو وہ ان نعمتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور اس

وقت تک محروم رہتی ہے جب تک اس میں اس کے حصول کی آرزو پھر زندہ و فعّال نہ ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر، اس میں حسنِ انقلاب کی آرزو زندہ و حرکی نہ ہو جائے۔ ایتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کی غایتِ حقیقی ہی کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنا ہے۔ اگر زکوٰۃ و انفاق بالعفو کا نظام قرآن و سُنّہ کے مطابق قائم ہوا اور وہ اپنے وظائف احسن طریق سے سرانجام دیتا ہو تو وہاں سرطانی اداروں کے قیام کا امکان نہیں رہتا۔

صلوٰۃ قلب کے احیاء اور نشوونما کا اکمل و احسن ذریعہ ہے! نیز یہ دل میں سعادت بھی پیدا کرتی ہے، جس سے عدل و احسان، ہمدردی و اخوّت، ایثار و قربانی، حسنہ و خیر، جود و سخاوت اور محبت و رحمت کے چشمے پھوٹتے اور کشتِ زندگی کو شاداب و بارآور کرتے ہیں، علاوہ بریں، صلوٰۃ کی تاثیر سے تشکرِ الٰہی کے جذبے اور حسنِ زندگی کی آرزو کی نشوونما ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ حسنِ صلوٰۃ سے انسان کو اپنے الٰہ و رب کی رضا کے لیے زکوٰۃ اور اس کے بندوں کی زندگی کو حسین و مطمئن بنانے اور انہیں ربِ کریم کی نعمتوں سے استفادہ اور حسنِ زندگی کی لذت سے آشنا کرنے کی خاطر حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت حکومت کے خزانۂ عامرہ میں جمع کرا دینے کی تحریک ہوتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ زکوٰۃ اور العفو (حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت) کو دینے کا صحیح طریقہ وہی ہے، جو عہدِ نبوی ؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مروّج تھا۔ برِصغیر پاک و ہند میں انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ سُنّتِ حسنہ کے خلاف ہے۔ اس سے گداگری کو فروغ حاصل ہوا ہے اور انسان کی تذلیل و تحقیر ہو رہی ہے۔ جہاں تک انفاق بالعفو کا تعلق ہے، مسلم اقوام اس حکمِ الٰہی کو یکسر فراموش کر چکی ہیں۔ یہ شیطان کے جالیاتی فریب کا کمال ہے۔ الغرض زکوٰۃ کی غایتِ حقیقی کفالتِ اجتماعیہ ہے، جس کی مثال ناقص ہی سہی، عصرِ حاضر میں ہمیں اشتراکی اور مغربی سرمایہ دارانہ ممالک میں ملتی ہے۔

ہمیں یہ اصلِ عظیم یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی شخص (فرد یا جماعت) اسلام کی رُو سے

وسائلِ پیداوار پر متصرّف و قابض نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ربّ العالمین نے اپنی نعمتیں جُملہ بنی نوعِ انسان کے "تمتع" کے لیے پیدا کی ہیں؛ نیز انسان جو کچھ کماتا اور حاصل کرتا ہے، اس کا وہ ایسا "امین" ہے، جس سے وہ اپنی جائز ضروریات کے مطابق فائدہ تو اُٹھا سکتا ہے اور راہِ حق میں خرچ بھی کر سکتا ہے، لیکن اس کا مالک نہیں ہوتا، اس لیے اپنی مرضی سے "اللّے تللّے" نہیں کر سکتا؛ نیز اس میں جُملہ اہلِ احتیاج کا حصّہ (یا حق) ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، اُسے اپنی جائز ضروریات کے مطابق روپیہ پیسہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہے، لیکن حدِّ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اپنے پاس جمع رکھنے یا اسراف و تبذیر کرنے کا وہ مجاز نہیں۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ یہ نظریہ کہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ دینے سے انفاق بالعفو کا امرِ ربی" اور اکتناز و احتکار کے نواہیِ الٰہیہ ساقط ہو جاتے ہیں، درست نہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید کے اوامر و نواہی مُطلق اور غیر مبدّل ہیں، ساقط نہیں ہو سکتے اور یقیناً یہ ہے۔ تو پھر یہ نظریہ غلط و باطل ہے کہ انفاق بالعفو کا حُکمِ الٰہی فرض نہیں، حالانکہ اس کی فرضیت پر سُنّتِ حسنہ سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ و کتبِ حدیث و سیرت شاہد ہیں کہ پیغمبرِ اعظم و آخر و رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم عمر بھر انفاق بالعفو پر عمل پیرا رہے اور کبھی صاحبِ نصاب نہیں ہوئے، حالانکہ آپؐ کے پاس مال و دولت بھی آتا رہا۔ آپؐ کا یہ اُسوۂ حسنہ اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ ایتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے احکامِ الٰہیہ کی تعمیل فرض ہے۔ یہ نظریہ کہ انفاق بالعفو کا حُکمِ الٰہی فرض نہیں، خلافتِ راشدہ کے بعد عہدِ حکومت میں سرطانی اداروں خصوصاً آذری ادارے کی اختراع ہے۔ یہ تاویل بالباطل کی عبرتناک مثال ہے۔ ایسے ہی نظریات کو دیکھ کر، جو علمائے سُوء احکامِ الٰہیہ کی مُطلقیت و ابدیت کی تکذیب کرتے ہیں، علامہ اقبالؒ ان کے اس غلط و گمراہ کُن رویّے کی اللہ تعالیٰ سے اس طرح فریاد کرتے ہیں:

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند (بالِ جبریل)

اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ اِیتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کا حکم دینے میں یہ حکمتِ الٰہی مضمر ہے کہ ان کے بغیر صلوٰۃ مؤثر نہیں ہو سکتی، نیز نہ اس کے ثمرات سے مستفید ہی ہوا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ سے دل میں سعادت پیدا ہوتی ہے اور اِیتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو سے قلبِ سعید سے رحمت کے چشمے اُبلتے اور بہتے ہیں، جن سے افرادِ نسلِ انسانی کے علاوہ دیگر مخلوقات بھی مستفید ہوتی ہیں۔ بخلاف اس کے، اگر مالدار نمازی زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے احکام پر عمل نہ کریں تو ان کی صلوٰۃ غیر مؤثر ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ بخیل، قسی القلب اور معاشرتی سرطان بن جاتے ہیں۔ مُسلم ممالک میں چونکہ صلوٰۃ کا نظام قائم ہے، نہ زکوٰۃ کا، لہٰذا ان میں معاشرتی سرطان اور سرطانی ادارے پلتے جلتے ہیں۔ ماحصل یہ ہے کہ سرطانی ادارے ہی مسلم اقوام کی ذلّت و مسکنت، پسماندگی و دست نگری، ضعیفی و مفلسی، نیز ان میں تشتّت و افتراق اور تحزّب و تفرقہ کے ذمّے دار ہیں۔

اِقتصادی تقاضے

صلوٰۃ کا ایک اِقتصادی تقاضا حُسنِ کردار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاجر و صنعتکار ہو یا دکاندار، کاروبار اور لین دین میں امانت و دیانت، ایفائے عہد و پیمان، قول و فعل میں ہم آہنگی، صداقت و راستبازی اور عدل و احسان اس کا شعارِ زندگی ہو۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اقتصادیات کا کوئی گوشہ ہو، اس میں ہر قسم کی بددیانتی، دروغ گوئی نوسربازی، بے انصافی، ظلم و استحصال، ذخیرہ اندوزی، سٹّہ بازی، سودی سرمایہ کاری، رشوت ستانی، سمگلنگ وغیرہ وغیرہ حرام ہے۔

گاہک ہو یا محنت کش، ملازم ہو یا شریکِ کاروبار، جو فعّال ہو، غیر فعّال (SLEEPING PARTNER) نہ ہو، سب کو ان کا حق دینا فرض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیداوار یا آمدنی میں سب شرکائے کار کو سرمائے کے عوض نہیں بلکہ ان کی محنت و سعی کی کیفیت و کمیت کے مطابق حصّہ ملنا چاہیے اور کم سے کم اتنا حصّہ ضرور ملنا چاہیے، جس سے ہر شخص اپنے خاندان کی کفالت کر سکے۔ پیداوار یا آمدنی کی تقسیم کا دوسرا بنیادی اصول عدل و احسان ہے؛ لہٰذا سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظاموں میں طلب و رسد کا مروّجہ اصول، جو سرطانی اداروں کا وضع کردہ ہے، حرام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے محنت کشوں کا استحصال ہوتا ہے اور وہ اپنے حق سے محروم رہتے ہیں۔

صلوٰۃ کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نمازی ہر حال میں عملِ صالح کرے، فساد نہ کرے۔ فساد کا مطلب اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے اور وہ ہے سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا فرعونی و ہامانی اور قارونی و آذری اصولوں اور طریقوں کے ذریعے لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا؛ نیز معاشرے کے حُسن و توازن

امن وسلامتی، نظم وضبط، اِتحاد واتفاق اور آزادی ومساوات میں خرابی پیدا کرنا، اور اس کے نتیجے میں اس میں تشتّت وافتراق، خرابی وبے نظمی، ناآہنگی وبے اعتدالی کے ساتھ خوف وحزن، عدمِ تحفظ، احساسِ محرومی کی فضا پیدا کرنا۔

صلوٰۃ کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان جو کچھ کماتا یا جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے، اُسے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کرسکتا۔ اس تقاضے میں، جو دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حکم ہے، یہ اصلِ عظیم مضمر ہے کہ انسان جو کچھ کماتا یا حاصل کرتا ہے، ربّ العالمین کی ودیعت کردہ قوتوں اور اس کے فضل ورحمت کے طفیل کرتا ہے، لہٰذا وہ "اپنے" مال ودولت، جائیداد وغیرہ کا "امین" ہے، مالک نہیں ہے۔ چونکہ انسان اور اس کے مال ودولت کا حقیقی مالک ربّ العالمین ہے، لہٰذا انسان اس کے احکام کے مطابق اپنے مال ودولت کو خرچ کرنے اور اس سے تمتّع یا استفادہ کرنے کا مکلف ہے۔ اس سلسلے میں اس کے بنیادی احکام ہیں: (۱) زکوٰۃ دینا (۲) ضرورت سے زائد مال ودولت (= العفو) کو زکوٰۃ کی طرح حکومت کو دینا تاکہ وہ کفالتِ اجتماعیہ کا انتظام کرسکے۔ (۳) اکتناز واحتکار، یعنی مال ودولت کو جمع کرنا اور ذخیرہ اندوزی کرنا حرام ہے۔ (۴) بخل اور (۵) اسراف وتبذیر حرام ہے۔ (۶) وراثت کی تقسیم احکامِ الٰہیہ کے مطابق کرنا۔ (۷) حاجت مند اور مفلوک الحال لوگوں کی کفالت کا انتظام کرنا (۸) اپنے مال ودولت میں اپنے اعزّہ واقارب اور محروم وسائل لوگوں کے حق کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک بنیادی اُصول "عدل واحسان" ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ کا اساسی اقتصادی تقاضا یہ ہے کہ تاجر ہو یا صنعتکار، دکاندار ہو یا خوانچہ فروش، آجر ہو یا اجیر قرآنِ مجید کے اصولِ عدل واحسان کا پابند ہونا ناگزیر ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ کسی حال میں بھی اہلِ ایمان کو ناجائز یا حرام طریقوں سے روزی کمانے یا روپیہ پیسہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ ماپ تول میں کمی نہیں کرسکتے اور نہ تول میں ڈنڈی ہی مار سکتے ہیں۔ صلوٰۃ کسی نمازی کو

اس چیز کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ گاہکوں کو ان چیزوں کے بجائے جن کا سودا ہوا ہے، دوسری چیزیں دیں یا کم دیں۔ وہ چیزوں میں ملاوٹ کرنے اور اصلی چیزوں کے بجائے نقلی چیزیں بیچنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ علاوہ بریں، وہ تاجروں کو ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کرنے کی سختی سے منع کرتی ہے۔ الغرض، وہ ہر قسم کی تجارتی بددیانتی سے منع کرتی ہے، کیونکہ اس سے صلوٰۃ کا حُسن و نور زائل ہو جاتا ہے اور وہ مؤثر نہیں رہتی۔ دوسرے، اس سے معاشرے میں فساد برپا ہوتا ہے، جس کے نتائج منفی، مہلک اور دُور رس ہوتے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جو تاجر و صنعتکار وغیرہ اصُولِ عدل و احسان پر سختی سے عمل نہیں کرتے، اللہ جَلَّ شانہٗ کی نظر میں وہ سب بددیانت، مفسد اور فتنہ پرداز ہیں، نیز وہ معاشرے، قوم و اُمّتِ مُسلمہ اور افرادِ نسلِ انسانی کے دشمن اور ملک کے غدار ہیں۔

قرآنِ مجید کے اصولِ عدل و احسان کا اطلاق تقسیمِ پیداوار پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کہنا انسب ہے کہ تقسیمِ پیداوار قرآنِ حکیم کے اصُولِ عدل و احسان کے مطابق ہونی چاہیے۔ جو صنعتکار یا تاجر ایسا نہیں کرتے، وہ بددیانت و مفسد ہیں۔ ان کو معاشرتی سرطانوں یا سرطانی اداروں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید کا دوسرا اقتصادی اصُول یہ ہے کہ قومی پیداوار کی تقسیم سعی و محنت کی کیفیت و کمیّت کے مطابق ہونی چاہیے، لیکن پیداوار میں ہر عملاً حصّہ لینے والے کا حصّہ کم سے کم اتنا ضرور ہونا چاہیئے، جس سے وہ اپنی اور اپنے کُنبے کی کفالت کر سکے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہر انسان پر محنت و مشقت کر کے احسن طریق سے کمانا فرض ہے تو اپنے ربّ العالمین کی آفریدہ نعمتوں سے اپنا حصّہ لینا بھی اس کا حق ہے۔ جو سرطانی ادارے محنت کشوں کو ان کا حق یا حصّہ نہیں دیتے، وہ ان کا استحصال اور ان پر ظُلم کرتے ہیں۔ اسے بھی قرآنِ حکیم فساد سے تعبیر کرتا ہے۔

صلوٰۃ کا ایک اہم ترین و اوّلین تقاضا یہ ہے کہ مسلمان سود کاری و سود خوری یا

سودی سرمایہ کاری نہیں کر سکتے، کیونکہ اسلام میں سود اور اس کی ہر شکل حرام ہے، مثلاً مزارعت و مضاربت، کرایہ، پگڑی، ساہوکاری یا بینکاری، تمسکات کاری (جیسے بچت کی سکیموں پر سرمایہ لگانے سے سود لینا، جسے "نفع" کے نام سے موسوم کرتے ہیں)؛ نیز بانڈوں کا انعام، لاٹری کا روپیہ وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ بریں صلوٰۃ کسی کو قماربازی اور سٹہ بازی کی جملہ مروجہ شکلیں، نیز جسم فروشی، قلم فروشی، ضمیر فروشی، جال فروشی وغیرہ وغیرہ کی بھی اجازت نہیں دیتی، بلکہ سختی سے منع کرتی ہے۔

ہمیں یہ اصلِ عظیم یاد رکھنی چاہیئے کہ حرام کاری و حرام خوری سے قلب کا نُور و سُرور، نفس کا اطمینان اور زندگی کا حُسن سلب ہو جاتا ہے، اور انسان کی باطنی دُنیا میں خوف و حزن کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اہلِ نار بن جاتا ہے۔ ذہنی انتشار، اعصابی دباؤ، تفکرات و آلام، ڈر، غم، گوناں گوں اندیشے، پریشانیاں وغیرہ وغیرہ آتشِ قلب سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ جَلَّ شانُہٗ نے قرآنِ حکیم میں رزقِ حرام کو پیٹ کا ایندھن کہا ہے (البقرۃ ۲ : ۱۷۴؛ النسآء ۴ : ۱۰)۔

صلوٰۃ کا ایسا ہی ایک اساسی تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی و منشا کے مطابق "اپنے" مال و دولت میں تصرف نہیں کر سکتا؛ لہٰذا وہ نہ تو اپنی خواہش کے مطابق اسے خرچ کر سکتا ہے نہ جمع۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح انسان اپنی مرضی سے غیر اللہ کی عبادت، نہ شرک ہی کر سکتا ہے، اور ہر معاملے میں احکامِ الٰہیہ کی اِطاعت اس پر لازم ہے، لہٰذا وہ ناجائز و حرام طریقوں سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح جو مال و دولت وہ جائز طریقوں سے حاصل کرتا ہے، اسے وہ فقط اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی خرچ کر سکتا اور اپنی جائز ضروریات ہی کے لیے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ اسراف و تبذیر یا بُخل و اکتناز کرنے کا مجاز نہیں۔ صلوٰۃ کے اس تقاضے یا حکمِ الٰہی کی بنا اسلام کا یہ اصل الاصول ہے کہ تمام مال و دولت جو انسان کماتا یا جائز طریقے سے، مثلاً وراثت

میں حاصل کرتا ہے، اس کا وہ مالک نہیں، "امین" ہے، اس لیے کہ اس کا مالکِ حقیقی اصل میں ربّ العالمین ہے۔ اگر وہ حقیقی مالک کے منشا کے مطابق اس کی امانت خرچ نہیں کرتا تو امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے چند بنیادی احکام کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں:

اوّل: مال و دولت کو جمع کرنے والا جہنمی ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ .... فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ (الھمزۃ ۱۰۴: ۱ تا ۹)۔ ہلاکت و بربادی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ پر) لوگوں کو طعنے دینے اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا عادی ہے؛ جس نے مال و دولت جمع کیا اور اُسے گِن گِن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال و دولت ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (یا اُسے حیاتِ جاوید بخشے گا)۔ ہرگز نہیں، اُسے حُطمہ میں پھینک دیا جائے گا، اور تم کیا جانو کہ حُطمہ کیا ہے؟ اللہ کی شعلہ زن آگ ہے، جو دلوں کو محیط ہو جائے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اور وہ) اونچے اونچے ستونوں میں بند ہوں گے۔

سورۂ معارج میں بھی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ دوزخ کی آتشِ سوزاں میں وہ شخص جائے گا جو حق قبول کرنے کے بجائے اس سے مُنہ موڑ لیتا ہے اور مال و دولت کو جمع کرتا اور بند رکھتا ہے۔ اس طرح ایک تو وہ دولت کو محجوب (ہ ہ ہ ہ) اور ناکارہ (IDLE) بناتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ان کے حق سے محروم رکھتا ہے؛ لیکن اس دردناک عذاب سے سچے نمازی محفوظ رہیں گے:

كَلَّا إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ۝ ..... إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ ..... وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۝ (المعارج ۷۰: ۱۵ تا ۳۵):

(وہ دوزخ کے عذاب سے) ہرگز (نجات) نہیں پائیں گے۔ وہ شعلہ زن آگ ہے جو تن بدن کو کھا جائے گی۔ ہر اس شخص کو پکار پکار کر اپنی طرف بلاتی ہے، جس نے حق سے

پیٹھ پھیری اور منہ موڑا؛ اور مال جمع کیا اور اسے بند کر رکھا (نہ انفاق بالعفو پر عمل کیا اور نہ اُسے تجارت، صنعت وحرفت میں لگایا؛ نیز اس سے نہ ان کا حصّہ دیا، جو اپنا حصّہ لے نہ سکے اور چُپ رہے (محروم) یا انھوں نے اپنے حصّے کا مطالبہ کیا (سائل) اور اس طرح ایک تو دولت کو محجوب و ناکارہ بنا دیا اور دوسرے، اہلِ احتیاج کو ان کے ربِّ کریم کی نعمتوں سے محروم رکھا)۔ انسان (بلحاظِ سرشت) بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ واویلا کرنے لگتا ہے، اور جب اُسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے رُک جاتا یعنی بُخل کرنے لگتا ہے اور اہلِ احتیاج کو ان کا حصّہ دینے سے انکار کرتا ہے لیکن (سچّے) نمازی ایسا نہیں کرتے، (سچّے نمازی کون ہیں؟) جو اپنی صلوٰۃ پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں؛ اور جن کے مال و دولت میں ان کا حصّہ ہے جو تلامیذ القرآن کو معلوم ہے، جو اپنے حصّے کا مطالبہ کرنے والے ہیں اور جو اس سے محروم تو ہیں، مگر مطالبہ نہیں کرتے۔ نیز وہ جو (یعنی سچّے نمازی) روزِ جزا کی (دل وجان اور زبان وقلم سے) تصدیق کرتے ہیں اور جو اپنے پروردگار وآقا کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں (اس لیے بھی کہ) ان کے ربّ کا عذاب ایسا نہیں کہ اس سے بے خوف رہا جائے جو اپنی جنس (SEX) یا جنسی اعضاء وجوارح (= شرم گاہوں) کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں یا اسیرانِ جنگ کے؛ ان سے حفاظت نہ کرنے والوں پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ اس کے علاوہ کچھ اور کریں تو وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں؛ (علاوہ بریں) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد وپیمان کا پاس کرنے والے ہیں، اور اپنی شہادتوں پر قائم رہنے والے ہیں؛ اور اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہی (سچّے نمازی ہیں) جو بہشتوں میں معزّز ومکرّم ہوں گے۔

محولہ بالا آیاتِ جلیلہ میں ایک تو دولت جمع کرنے والوں، بخیلوں اور اہلِ احتیاج اور اپنے حصّے سے محروم لوگوں کو ان کا حصّہ نہ دینے والوں کا جو کرب انگیز وعبرتناک انجام ہوگا، اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ دوسرے اس اہم حقیقت کی وضاحت کردی گئی ہے کہ

سچے نمازی نہ تو بخیل ہوتے ہیں، نہ دولت ہی جمع کر کے رکھتے ہیں، اور نہ اپنی دولت سے اہلِ احتیاج اور محروم لوگوں کو حصہ دینے سے انکار ہی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ دوزخ کے الناک عذاب سے محفوظ رہتے ہیں۔ تیسرے، سچے نمازیوں کی صفات و اعمالِ صالحہ کی نشاندہی کی گئی ہے، جو دراصل صلوٰۃ کے تقاضے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو نمازی صلوٰۃ کے متذکرۂ بالا تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، وہی سچے ہوتے ہیں اور انہی کی صلوٰۃ سچی، موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے؛ نیز وہی معزز و مکرم اہلِ جنت ہیں۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہوئی کہ جن نمازیوں میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں، وہ سچے نمازی ہیں نہ ان کی صلوٰۃ سچی، موثر اور نتیجہ خیز ہے۔

بات اصل میں صلوٰۃ کے اقتصادی تقاضوں کی ہو رہی تھی۔ صلوٰۃ بخل و حرص کو سختی سے منع کرتی ہے، کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الحشر ۵۹: ۹) جو لوگ اپنے نفس کے بخل و طمع سے بچا لیے گئے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے "انفاق" کو نیکی کا معیار قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (آلِ عمران ۳: ۹۲) : تم نیکی کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تم وہ کچھ (یعنی مال و دولت، پیداوار وغیرہ اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو، جسے تم محبوب رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔

یہاں یہ از بس اہم سوال پیدا ہوتا تھا کہ انسان کس قدر خرچ کرے؟ اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے ایجازِ بلاغت سے جتنا مختصر دیا ہے اتنا ہی جامع و مانع ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ (البقرۃ ۲: ۲۱۹) : پوچھتے ہیں: ہم اللہ کی راہ میں کیا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جو کچھ تمھاری (جائز) ضرورت سے زائد ہو۔

ضرورت کا معیارِ اوّل تو ہر شخص جانتا ہے کہ کیا ہے؟ اسلامی معاشرے میں جہاں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (الحجرات ۴۹: ۱۰؛ یعنی مومن بھائی بھائی ہوتے ہیں)، وہاں معیارِ زندگی اخوّت و مساوات کے اعتبار سے مثالی ہونا چاہیے، جیسا کہ عہدِ نبویؐ میں تھا۔ خود پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ حسنہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ آپؐ کا معیارِ زندگی عام شہریوں ایسا تھا، اور اسی میں ہمارے لیے حسین نمونہ ہے: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ہ (الاحزاب ۳۳: ۲۱)۔ اصل یہ ہے کہ تمھارے لیے رسول اللہ (کی سیرتِ طیبہ) میں حسین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کی اُمید رکھتا اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم 'انفاق بالعفو' یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو زکوٰۃ کی طرح خرچ نہیں کرتے 'یعنی حکومت کے عُمّال کو خزانۂ عامرہ میں جمع کرانے کے لیے نہیں دیتے، بلکہ جمع کر کے رکھتے ہیں' اور اس کے نتیجے میں ربّ العالمین کے بندوں کو اُن کے ربّ کی نعمتوں میں سے ان کے حصّے سے محروم رکھتے ہیں، نیز قومی دولت کی گردش کو محدود اور اُسے محجوب و ناکارہ کرتے ہیں، ان کو اس جرم کی جو سزا ملے گی، اس کی ایک جھلک قرآنِ مجید نے اس طرح دکھائی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ .....

فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ہ (التوبۃ ۹: ۳۴-۳۵)۔ اے مسلمانو! بلاشبہ مولویوں اور پیروں کی کثیر تعداد لوگوں کا مال غلط طریقوں سے کھاتی ہے اور اللہ کی راہ یعنی کفالتِ اجتماعیہ سے روکتی ہے؛ نیز جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں (یعنی سرمایہ داری کرتے ہیں) اور اللہ کی راہِ ربوبیت میں یا کفالتِ اجتماعیہ کے لیے خرچ نہیں کرتے، انھیں المناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ ایک دن آئے گا جب اسی زر و سیم کو جہنّم کی آگ میں

دہکایا جائے گا اور پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا؛ (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ مال و دولت جو نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھنے کے بجائے اپنے ذاتی مفاد کے لیے جمع کر رکھا تھا۔ لو اب اپنی جمع کی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

محوّلۂ بالا آیاتِ جلیلہ میں ایک از بس فکر انگیز نکتہ مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر دینی پیشوا لوگوں کا مال غلط طریقوں سے کھاتے ہیں: مثلاً ان سے نذرانوں، قبروں پر چڑھاوں اور نذر و نیاز کے ذریعے، نیز چندوں، آیاتِ قرآنی اور تعویذ گنڈوں وغیرہ کی فروخت سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر طاقی مثلاً فرعونی، ہامانی، قارونی اداروں کو خوش کرنے اور ان سے مالی اور دیگر مراعات حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انفاق بالعفو (یا ضرورت سے زیادہ مال و دولت کو کفالتِ اجتماعیہ کے لیے خرچ کرنے) کا امر اور بخل و اکتناز اور جمعِ مال کے نواہی جو ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیے تھے، حکمِ زکوٰۃ سے منسوخ ہو گئے، جو مکّہ مکرمہ میں دیا گیا تھا۔ زکوٰۃ کے احکام کے لیے دیکھیے المؤمنون ۲۳: ۴؛ النمل ۲۷: ۳؛ الروم ۳۰: ۳۹ وغیرہم۔ یہ ساری سورتیں مکّیہ ہیں۔ مدنی نصوصِ قرآنی کو مکّی نصِ قرآنی سے بلا سند منسوخ کرنا یا سمجھنا منطقی مغالطہ اور تلبیسِ ابلیس نہیں تو اور کیا ہے؟

قرآنِ عظیم کی رُو سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ ہی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ یا حسین و مثالی نمونہ ہے (الاحزاب ۳۳: ۲۱) اور آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہی ہمارے لیے حجتِ قطعیّہ ہے، اور جملہ کُتبِ سیرت و حدیث اس حقیقت پر مُتّفق ہیں کہ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عُمر بھر انفاق بالعفو پر عمل کیا۔ اس کے نتیجے میں آپؐ نے نہ تو اکتناز و احتکار کیا اور نہ مال و دولت ہی جمع کیا اور نہ صاحبِ نصاب ہی ہوئے۔ وہ علمائے سوء جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سود کاروں، وغیرہ وغیرہ کی خوشنودی اور جلبِ منفعت کے

لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم (خاکم بدہن) اللہ تعالیٰ کے متذکرۂ بالا اوامر و نواہی پر عمل نہیں کرتے تھے؛ یعنی وہ نہ تو انفاق بالعفو کے حکم پر اور نہ اکتناز، بخل اور جمع مال و دولت کے نواہی پر عمل کرتے تھے، ان کو اور ان کے متبعین کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تکذیبِ قرآن و دین ہے۔

ہمیں دین کا یہ اصل الاصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اہلِ ایمان احکامِ الٰہیہ اور اسوۂ رسولؐ کے مطابق زندگی کرنے کے مکلف ہیں، اور بس۔ احکامِ الٰہیہ کو غیر اللہ منسوخ نہیں کرسکتا؛ بندہ اپنے ربِّ علیم و حکیم کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا مجاز ہو ہی نہیں سکتا۔

بہر حال صلوٰۃ ہمیں حکم دیتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے مال و دولت کو نہ تو جمع کر کے رکھ ہی سکتے ہیں اور نہ اسے اپنی مرضی سے خرچ ہی کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم مال و دولت کے "امین" ہیں، مالک نہیں ہیں۔ اس کا مالکِ حقیقی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے۔ علاوہ بریں، صلوٰۃ ہمیں اسراف و تبذیر اور بخل و تکاثر سے بھی منع کرتی ہے۔ ان سب تقاضوں کو پورا کرنے ہی سے ہم سچے نمازی بن سکتے ہیں اور ہماری صلوٰۃ مؤثر و قرۃ العین اور ثمر بار ہو سکتی ہے۔

یہ واقعیت اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلم اقوام، جو قرآن مجید کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی آخری محفوظ اور احسن و اکمل وحی و تنزیل اور نور و ہدایت تسلیم کرتی ہیں، کیوں وہ صلوٰۃ کے معاشی اور دیگر تقاضے پورے نہیں کرتیں؟ مندرجۂ ذیل آیۂ جلیلہ اس سوال کے جواب کی آئینہ دار ہے؛ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان ۲۵ : ۳۰)؛ یعنی رسولؐ کہے گا کہ "اے میرے ربّ میری قوم نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک و استہزا بنا لیا تھا۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ "اے میرے ربّ میری قوم نے اس قرآن سے دوری و مہجوری اختیار کر لی تھی۔ اصل یہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے ربّ العزت کے حضور اس فریاد کی مصداق عصرِ حاضر کی مسلم اقوام ہیں، جو جانتی ہیں کہ

ان پر قرآنِ حکیم فرض ہے (القصص ۲۸: ۸۵) اور اس کے بغیر صلوٰۃ قائم نہیں ہو سکتی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسے زینتِ طاقِ نسیاں بنا رکھا ہے، بلکہ مسلم اقوام عملاً اس کی تضحیک کرتی ہیں۔ وہ زبان سے تو اس کی حاکمیتِ اعلیٰ تسلیم کرتی ہیں، لیکن عملاً اس کا انکار کرتی ہیں، اور اس کے احکام کو نہ تو آئین و قوانین کے طور پر نافذ کرتی اور نہ ان پر عملدرآمد ہی کرتی ہیں۔

قرآنِ مجید سے دُوری و مہجوری کے دُوررس نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان فرضیّتِ قرآن کے مفہوم سے کم آشنا ہیں، لہٰذا اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید کے فرض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا (۱) تعلّم (۲) ابلاغ اور (۳) جہاد بالقرآن ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ (۱) تعلّمِ قرآن کا مطلب اسے اس کے الفاظ اور معانی و مطالب کے ساتھ سیکھنا، اس کی تلاوت کرنا، اس کی قرأت سننا، اور اس میں تفکّر بالحق کرنا ہے (بالفاظِ دیگر، سچّا تلمیذ القرآن بننا ہے۔ (۲) ابلاغ سے مراد قرآنِ حکیم کی تعلیم و تبلیغ اور نشر و اشاعت کا معقول بندوبست کرنا ہے؛ یہ مسلم حکومتوں اور افراد و اقوام سب کی مشترکہ ذمّے داری ہے۔ یہاں اس بے حد اہم حقیقت کی طرف نشاندہی کر دی جاتی ہے کہ ربِّ علیم و حکیم نے قرآنِ مجید میں ہمیں نصابِ تعلیم دیا ہے، جو ہر لحاظ سے احسن و اکمل ہے (دیکھیے آل عمران ۳: ۱۶۴؛ الجمعۃ ۶۲: ۲)، لیکن ہمارے ظلم و جہل اور قرآنِ مجید سے دُوری و مہجوری کا یہ عالم ہے کہ دنیا بھر میں کسی بھی مسلم ملک کے نظامِ تعلیم میں اس کا نصابِ تعلیم رائج نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے برعکس نہ تو تلامیذ القرآن ہیں اور نہ اس کی تعلیمات و احکام سے کما حقّہٗ آگاہ ہی ہیں؛ نیز کسی مسلم ملک میں کلیتاً قرآنِ مجید کا آئین نافذ نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کو عملاً تسلیم ہی کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں کسی ملک میں صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم نہیں۔ اس ضمن میں یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ علم پیش شرط ہے عمل کی، لہٰذا صلوٰۃ سے مادّی و جمالیاتی یا

دُنیوی و اُخروی فوائد حاصل کرنے کے لیے اس کے فلسفے اور قرآنِ مجید کے معانی و مطالب کا سمجھنا لازمی ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زکوٰۃ کے بغیر صلوٰۃ، نہ صلوٰۃ کے بغیر زکوٰۃ ہی مؤثر و بار آور ہوتی ہے، اس لیے اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ اِیتائے زکوٰۃ ناگزیر ہے؛ نیز وہی نمازی صلوٰۃ کے ثمرات یا جالیاتی ثروت سے بہرہ مند ہوتے ہیں جو زکوٰۃ اور ضرورت سے زائد مال و دولت کو کفالتِ اجتماعیہ کے لیے اسلامی حکومت کو دیتے ہیں ریہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ربّ العالمین اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ عموماً اِیتائے زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اگرچہ وہ انفاق فی سبیل اللہ کی جا بجا تاکید کرتا اور اُسے مقامِ خیر و حسنہ تک پہنچنے کی پیش شرط قرار دیتا ہے (آلِ عمران ۳: ۹۲)؛ نیز وہ حُسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو خرچ کرنے (یعنی انفاق بالعفو) کا بھی حکم دیتا ہے (البقرہ ۲: ۲۱۹) علاوہ بریں وہ بخل و اکتناز اور تکاثر و سود سے منع کرتا اور ان نفسیاتی سرطانی بیماریوں کے مہلک اور بھیانک نتائج و عواقب سے متنبہ بھی کرتا ہے۔ اس میں یہ حکمت مضمر ہے کہ فرد و قوم کے مادّی و جالیاتی اِرتقاء کے لیے نظامِ زکوٰۃ کا قیام ناگزیر ہے۔

زکوٰۃ قرآنِ حکیم کی بنیادی مصطلحات میں سے ہے اور اپنے اندر متعدّد معانی رکھتی ہے۔ اس میں تزکیہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس سے مراد انفاق فی سبیل اللہ کی ہر وہ شکل ہے، جس کا حکم قرآنِ مجید میں دیا گیا ہے اور جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے؛ اگرچہ شریعت میں اس سے روایتی زکوٰۃ ہی مراد لی جاتی ہے، جو زرِ نصاب پر ڈھائی فیصد دی جاتی ہے یا حکومت وصول کرتی ہے۔ اِیتائے زکوٰۃ کا مطلب پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ حسنہ اور آپؐ کے تتبّع میں خلفائے راشدین کے اُسوۂ حسنہ کی رُو سے دو گونہ ہے: انفرادی لحاظ سے ہر صاحبِ نصاب مسلمان زکوٰۃ دینے کا شرعاً مکلّف ہے اور اجتماعی اعتبار سے زکوٰۃ کو منظم طریقے سے وصول کرنے اور اس سے بطریقِ احسن رعایا کی کفالت کرنے کی ذمّے داری حکومت کی ہے اور اس کی وہ شرعاً مکلّف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی حکومت سرکاری عُمّال کے ذریعے منظم طریقے سے زکوٰۃ وصول کرتی تھی اور یہی طریقہ قرآن و سُنّہ کی رُو سے درست ہے۔ اس عہد میں انفرادی طور پر اپنی مرضی سے زکوٰۃ کا حساب لگانے اور دینے کا کوئی مسلمان مجاز نہ تھا۔ دوسرے، سرکاری عُمّال اہلِ نصاب سے ان کی ضرورتِ زندگی کے اثاثے کو چھوڑ کر بقیہ کل اثاثے پر زکوٰۃ باقاعدہ حساب سے وصول کرتے تھے تیسرے زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور اسے بھیک کی طرح تقسیم نہیں کیا جاتا تھا کہ یہ غیر اسلامی تصور و طریقہ اور موجبِ تذلیل و تحقیرِ انسانی ہے؛ اسے سرکاری وظیفے یا کفالتی الاؤنس کے طور پر باوقار طریقے سے دیا جاتا تھا۔ یہ دراصل عصرِ حاضر کے نظامِ کفالتِ رعایا کی اوّلین شکل تھی؛ نیز اہلِ احتیاج اور محروم لوگ اس سرکاری وظیفے کو اپنا حق یا حصّے کی رقم سمجھتے تھے، جیسا کہ اشتراکی اور دیگر مغربی ممالک میں لوگ سمجھتے ہیں۔ چوتھے، پاکستان کی موجودہ حکومت کی طرح کُل نصابی اثاثے کے بجائے صرف بینکوں میں اور وہ بھی بچت کے کھاتے میں جمع شدہ سرمایہ جو العفو ہوتا ہے اور اس کے سود پر زکوٰۃ وصول کرنا بھی قرآن و سُنّہ کے منافی ہے اور اسے بھیک کی طرح تقسیم کرنا بھی۔ اس سے تحقیر و تذلیلِ انسانی ہوتی ہے، جو قرآنِ حکیم کی رُو سے گناہِ کبیرہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو مکرّم بنایا ہے (الاسراء ۱۷:۷۰)۔

کُتبِ سیرۃ النبیؐ و احادیثِ طیبہ سے ثابت ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال و دولت بھی آتا رہا، لیکن اس کے باوجود آپؐ کبھی صاحبِ نصاب نہیں ہوئے، لہٰذا آپؐ پر زکوٰۃ نہ تو فرض ہوئی اور نہ آپؐ نے کبھی دی۔ سوال یہ ہے کہ اس کی علّتِ غائی کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے عمر بھر اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو پر عمل کیا جس کے نتیجے میں آپؐ کے پاس نہ تو مال و دولت جمع ہوا اور نہ آپؐ پر زکوٰۃ فرض ہی ہوئی؛ اور نہ کبھی آپؐ نے زکوٰۃ ہی دی۔ آپؐ کی اس سُنّتِ حسنہ سے اس مذہب یا مکتبِ فکر کی نفی و تردید ہوجاتی ہے جس کے نزدیک ایتائے زکوٰۃ کے حکم سے انفاق بالعفو اور لاکتناز و جمعِ مال

دولت کے غیر مبدّل و ناقابلِ تنسیخ احکامِ الٰہیہ منسوخ ہو گئے تھے یا ہیں۔ تاریخ سے اس واقعیت کا سُراغ ملتا ہے کہ ان احکامِ الٰہیہ کی تنسیخ کا نظریہ عہدِ ملوکیت کی اختراع و یادگار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ ملوکیت میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کے قارونی نظام قائم ہو گئے تھے۔ ان قارونی سرطانی اداروں نے دیگر سرطانی خصوصاً آزری اداروں کی معاونت سے رعایا کا استحصال کرنے کی خاطر تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے آزری فنون کے ذریعے سود کاری کو مزارعت، مضاربت، کرایہ وغیرہ ناموں سے موسوم کر کے جائز قرار دے دیا۔ چنانچہ شیطان کی اس جمالیاتی فریب کاری یا تبییسِ ابلیس کی وجہ سے مسلم اقوام میں سود کی یہ تشکلیں صدیوں سے مروّج ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اکثریّت یہ حقیقت فراموش کر بیٹھی ہے کہ یہ سود کی شکلیں اور نام ہیں جو شرعاً حرام ہیں۔

مسلم اقوام کی ضلالت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ بجا طور سے اس تاریخی واقعیت پر یقین رکھتی ہیں کہ غیر مسلم اقوام میں اُن کے آزروں یا دینی پیشواؤں کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کی وجہ سے غلط نظریات اور باطل عقائد پھیل جانے کی وجہ سے وہ گمراہ ہوئی ہیں، لیکن خود ان میں اُن کے آزروں کے پھیلائے ہوئے غلط نظریات و باطل عقائد کا جائزہ لینے کا انھیں دماغ ہے نہ یارا۔ وہ اپنے عقائد و نظریات کو اغلاط و باطل کی آمیزش سے منزّہ اور تحقیق و تفتیش اور نقد و نظر سے ماورا سمجھتی ہیں۔

میرے نزدیک اقوامِ عالم میں دینی و مذہبی اختلاف و نزاع کی اصل وجہ ان کی یہ غلط فہمی و کج اندیشی ہے کہ ان کا دینی و مذہبی لٹریچر باطل عقائد و نظریات کی آمیزش سے پاک و صاف ہے۔ قبولیتِ حق کی راہ میں یہ عقیدہ سدِّ سکندری بنا ہوا ہے۔ جہاں تک اُمّتِ مسلمہ کا تعلق ہے اس کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اُن کی کتابُ اللہ، قرآنِ عظیم کی حفاظت کا ذمّہ خود ربّ العزّت نے لے رکھا ہے، لہٰذا وہ ہر قسم کی ملفوظی و موضعی تحریف سے محفوظ و مصئون ہے، لیکن جہاں اس کے غیر قرآنی دینی و مذہبی لٹریچر کا تعلق ہے، اس کو اغلاط، باطل یا جھوٹ سے منزّہ

ماننا اور اُسے صیرفیِ قرآن پر جانچنے کو غیر ضروری سمجھنا، غیر مسلم اقوام کی غلط روش پر چلنے اور ان کا باطل روّیہ اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

ہر فردِ قوم کے لیے اپنا محاسبہ کرنا اور کرتے رہنا ناگزیر ہے۔ اپنے محاسبۂ نفس ہی سے انسان اپنی کوتاہیوں، لغزشوں، محرومیوں اور گمراہیوں، نیز اپنے ظلم و جہل اور قساوت و شقاوت سے آگاہی حاصل کر کے ان کا مداوا اور اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

سیاسی تقاضے

سیاست کو دین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حکومت ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت کی ضمانت فراہم کر سکتی ہے اور قرآنِ مجید کی رُو سے یہ اس کا بنیادی فریضہ ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ و سیاست کے تعلق کی نوعیت چولی دامن کی سی ہے، اور اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو مُسلم اقوام عام طور سے سمجھتی ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں آج ایک مُسلم ملک میں بھی قرآن و سُنّۃ کے مطابق صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم نہیں، حالانکہ قرآنِ مجید کی رُو سے ایسے نظام قائم کرنا اسلامی حکومت کی اساسی ذمّے داری ہے۔ چنانچہ سورۂ حج میں مؤمنین حکّام کی یہ پہچان بتائی ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج ۲۲: ۴۱) یعنی اگر اللہ تعالیٰ اُنہیں دُنیا میں اقتدار و حاکمیت عطا کرے تو وہ صلوٰۃ (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ دیں گے (یعنی نظامِ زکوٰۃ قائم کریں گے)؛ نیز "معروف" یعنی حسنہ و خیر کا حکم دیں گے اور "منکر" یعنی سیّئہ و شر سے منع کریں گے، یعنی اس پر قدغن لگائیں گے۔ جملہ امورِ زندگی کا انجام کار اللہ کے اختیار میں ہے۔

اس آیۂ جلیلہ کے مضمرات سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جو نام نہاد مسلم حکام ایسا نہیں کرتے، یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم نہیں کرتے، وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں مؤمن نہیں ہیں؛ بلکہ وہ افرادِ معاشرہ بھی مؤمن نہیں ہیں جو نظام قائم کرنے یا کرانے میں حتی المقدور سعی و جہد نہیں کرتے۔ یہ کتنی عبرتناک حقیقت ہے کہ اس دور میں کسی مُسلم مملکت میں نہ تو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم ہیں اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کا یہ تغافل اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، ظلم و جہل بھی ہے اور تازیانۂ عبرت بھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کا کوئی طریقہ ہے یا نہیں؟

چونکہ یہ صورتِ حال صدیوں سے سرطانی اداروں کی پیدا کی ہوئی ہے، اور مزمنِ سرطانی مرض ہے، لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ حسنِ انقلاب کے ذریعے پہلے سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کا استیصالِ کُلّی کیا جائے اور پھر ساتھ ہی قرآن و اُسوۂ حسنہ کے مطابق اسلامی معاشرے کی تعمیر کی جائے۔ چونکہ بہت کم لوگ مُسلم اور اسلامی معاشرے میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دُنیا کا ہر مُسلم ملک اپنے آپ کو "اسلامی" کہتا ہے، لہٰذا اسلامی معاشرے کی چند ایک امتیازی خصوصیات کی نشاندہی کردی جاتی ہے: ایک یہ کہ اس کا آئین آئینِ قرآن ہوتا ہے اور اس کا سیاسی اصل الاصول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام رُوحِ قرآنی اور سُنّتِ حسنہ کے مطابق قائم ہوتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ نظامِ زکوٰۃ کی غایتِ حقیقی رعایا کی کفالت بطریقِ احسن کرنا ہے۔ تیسرے، اس کے نظامِ تعلیم کی اساس نصابِ قرآن پر استوار ہوتی ہے؛ اور چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں نصابِ قرآن مروّج ہوتا ہے۔ چوتھے، اس میں حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے، لہٰذا اس میں سرطانی اداروں کا فقدان ہوتا ہے۔ پانچویں، رعایا کو جملہ انسانی حقوق حاصل ہوتے ہیں؛ اور چھٹے اس میں جُملہ اہلِ ایمان بھائی بھائی، آزاد اور واجب التکریم ہوتے ہیں؛ نیز تواصی بالحق، تواصی بالصبر، تواصی بالرحمۃ؛ نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا

شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ لوگ عموماً یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ حقیقت تسلیم کہ مُسلم معاشروں کو سرطانی اداروں سے پاک وصاف کرنے کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہے، لیکن اس کے آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی؟ عام لوگوں کو تو واقعی حسنِ انقلاب کے آنے کی صورت دکھائی نہیں دیتی، لیکن اہلِ نظر حسنِ انقلاب کو خارج از امکان نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ پاکستان سمیت مُسلم دنیا میں اہلِ آرزو کی تعداد قلیل ہی سہی، لیکن وہ ہیں ضرور؛ لہٰذا یاسیت پسند ہونے کے بجائے ہمیں رجائیت پسند ہونا چاہیے؛ اس لیے بھی کہ اسلام میں یاس وناامیدی حرام بلکہ کفر ہے۔ علاوہ بریں، تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات قلت نے اکثریت کو شکست دی اور اس کا استیصال کیا ہے۔ اس بنا پر ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ اہلِ آرزو اگر حسنِ انقلاب لانے کے لیے متحد ہو کر سرطانی اداروں کے خلاف جہاد کریں اور ساتھ ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان میں بھی حسنِ انقلاب کی آرزو کے احیا کی مساعیِ جمیلہ کرتے رہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ تاریخی عمل شاہد ہے کہ ظلم کی حکومت ناپائیدار ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس کا مخالف ہوتا ہے۔

اگر ہم اس مسئلے کو صلوٰۃ کے حوالے سے دیکھیں اور غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ یقیناً اس ضمن میں مثبت کردار ادا کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صلوٰۃ، حسنِ انقلاب کی آرزو کے احیاء کا مجرّب وکارگر ذریعہ ہے۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ تزکیۂ قلب کا بہترین ذریعہ "صلوٰۃ" ہے؛ اور تزکیہ سے قلب میں حسن، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور حسنِ انقلاب کی آرزو کا نشوو ارتقاء ہوتا ہے، لیکن صلوٰۃ کا سچّا ہونا ضروری ہے، اور سچّی صلوٰۃ ان اہلِ ایمان و آرزو کی ہوتی ہے، جو اس کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ علاوہ بریں صلوٰۃ نمازیوں میں اس حقیقت کا یقینِ مُحکم پیدا کرتی ہے کہ جملہ بنی نوع انسان کا الٰہ و ربّ فقط اللہ تعالیٰ ہے اور تنہا وہی ان کا بادشاہ، حاکم اور خدا ہے، لہٰذا اس کے سوا کوئی شخص (فرد ہو یا جماعت) ان پر حُکم چلانے، ان کے انسانی حقوق غصب کرنے اور ان کو اپنے

پرستار و ثناخواں اور محکوم و غلام بنانے کا مجاز نہیں ۔ یہ سیاسی شعور انسان کو سرطانی اداروں کی محکومی و غلامی یا بندگی کے طوق و سلاسل سے گلو خلاصی پانے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ از بس اہم نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ صلوٰۃ ان اہلِ آرزو و باشعور مصلّین کے قلوب پر اپنے حسین و منیر اور انقلاب انگیز و حیات آفرین اثرات مرتّب کرتی ہے، جن کو اپنی صلوٰۃ کی سورتوں، دعاؤں اور اذکار کے معانی اور اس کی ہماری دُنیوی و اُخروی زندگی میں غیر معمولی اہمیت، نیز اس کی افادی و جمالیاتی اقدار کا علم و یقین ہو، نیز وہ صلوٰۃ کے تقاضے پورے کرنے والے ہوں ۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جب اس یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دست بستہ قیام و رکوع اور سجود و قعدہ کرتا اور اقرار کرتے ہیں کہ صرف اور صرف وہی ان کا ربّ، مالک، اِلٰہ اور احکم الحاکمین ہے تو اُن کو اس حقیقت کا بھی شعور و ایقان ہو جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی فرد یا افراد ان پر اپنا حکم نہیں چلا سکتے، چاہے وہ فرعون و ہامان ہوں یا قارون و آذر؛ نیز کوئی سرطانی ادارہ ان کو اپنا محکوم و غلام نہیں بنا سکتا اور نہ ان کی تحقیر و تذلیل ہی کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں، کوئی سرطانی بشر یا سرطانی ادارہ نہ تو ان کا استحصال اور نہ ان کے انسانی حقوق غصب ہی کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اس معاشی اصل الاصول کا بھی شعور ہو جاتا ہے کہ جب ربّ العالمین نے اپنی نعمتیں اپنے مُجلہ جمالیاتی۔ تخلیقی شہکاروں یعنی افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع کے لیے پیدا کی ہیں تو پھر کوئی معاشرتی سرطان یا سرطانی ادارہ قومی یا بین الاقوامی وسائلِ پیداوار پر قبضہ جما سکتا نہ ان کے انسانی حقوق سے انہیں محروم ہی رکھ سکتا ہے، بلکہ ان کی کفالت کا معقول بندوبست کرنا حکومت اور معاشرے کا بنیادی فریضہ ہے۔

یہ صورتِ حال واقعی تشویش ناک اور خطرناک ہے کہ مُسلم اقوام میں سیاسی شعور کی کمی کے نتیجے میں ان میں سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کی حکومت و عملداری، سیادت و اقتدار ہے، اور ان کے ظلم و استحصال کی وجہ سے عامّۃ النّاس اپنے بنیادی حقوق سے

محروم، نیز وہ مفلوک الحال، محکوم و ذلیل اور سرطان زدہ و سافلین ہیں ۔ اس کے کئی ایک عوامل و محرکات ہیں، لیکن مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب اگر ان میں نظام صلوٰۃ کا قیام، اور اس کی غایتِ حقیقی کا علم؛ نیز دُنیوی و اُخروی لحاظ سے انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت و افادیت کا شعور و یقین، نیز صلوٰۃ کے تقاضوں کو حسنِ نیت کے ساتھ حتیّ المقدور پورا کرنا تھا تو ان کے زوال کا سبب ان میں ان چیزوں کا فقدان ہے۔

ظاہر ہے علم و شعور کے بغیر صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا کر سکنے اور اس کے ثمرات سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صلوٰۃ کے شعورِ کلّی کے لیے علم القرآن اور نظام صلوٰۃ، نیز حکومت بالقرآن کا ہونا لازمی ہے حقیقت یہ ہے کہ حکومت بالقرآن کی پیش شرط حسنِ انقلاب ہے تو سرطانی اداروں کے استیصال کی پیش شرط حکومت بالقرآن کا قیام ہے۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ قدرت کا قانونِ احترام آرزو یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں حسنِ انقلاب کی آرزو زندہ و فعّال نہیں ہوتی اور اس میں باطنی حسنِ انقلاب نہیں آتا، معاشرتی حسنِ انقلاب بھی نہیں آتا۔ لہٰذا ہمیں پہلے محنت کش، مفلوک الحال اور اہلِ احتیاج طبقوں میں بالخصوص سرطانی اداروں اور سرطانی معاشروں کے استیصال اور حکومت بالقرآن کے قیام کے لیے حسنِ انقلاب کی آرزو کو زندہ و بیدار کرنا ہوگا۔

ثقافتی تقاضے

یہ موضوع اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ثقافت قوم کے دینی و مذہبی عقائد، اخلاقی و جمالیاتی اقدار اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر دین کی کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے اور اسلام کی امتیازی خصوصیت "حیا" ہے" (المشکوٰۃ، کتاب الاخلاق)۔ "حیا" کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسا حصنِ حصین ہے جو مردوں اور عورتوں کو فحشاء و منکرات سے محفوظ رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے اندر رہیں اور باہر نہ نکلیں۔ صنفِ جمیلہ مرد کی بہ نسبت طبعاً زیادہ حیا پسند ہوتی ہے، لہٰذا وہ اپنے حصارِ حیا سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی؛ لیکن یہ ابلیسی نفسی شیطان ہے جو اپنی جمالیاتی وسوسہ اندازی و فریب کاری سے ان دونوں کو ان کے حصارِ حیا سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے، خصوصاً جب وہ دونوں خلوت میں ہوں، یا ایک دوسرے سے ہمکلام و ہم نظر ہوں۔ بخلاف اس کے صلوٰۃ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ان کو حصارِ حیا سے باہر نکلنے سے منع کرتی ہے، نیز وہ خود بھی حیا کا حصنِ حصین ہے۔ چونکہ انسان کا موضوعی۔ معروضی شیطان جو اس کا کھلا دشمن ہے، ہر وقت اس کے اندر گھات میں لگا رہتا ہے اور مسلسل اور پے در پے خواہشات پیدا کرنا اور ہر معروضِ خواہش (OBJECT OF DESIRE) کو چاہے وہ کتنا ہی قبیح کیوں نہ ہو، مزین کر کے اسے دکھانا اس کا وظیفہ ہے، لہٰذا ربِ رحیم نے اپنے بندوں کو اس کی جمالیاتی وسوسہ اندازی و فریب کاری سے بچانے کی خاطر ان پر صلوٰۃِ پنجگانہ فرض کر دی ہے۔ بالفاظِ دیگر، فحشاء و منکر سے بچنے کے لیے ان کو "شیطان مار" ہتھیاروں سے لیس ایسا قلبی حصار فراہم کر دیا ہے، جس کے خوف سے شیطان ان سے دور رہتا ہے اور انسان کو سبز باغ دکھلانے اور ورغلانے کے بجائے

اس کا "مطیع و منقاد" بن جاتا ہے، جس کے لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بن جانے کی تعبیر اختیار کی ہے۔ صلوٰۃ کی اس صفت کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ایجاز بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹ : ۴۵) : یقیناً صلوٰۃ فحشآء و منکر سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑی چیز ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کارستانیاں کرتے ہو۔

فحشآء و منکر:

فحشآء اور منکر قرآنِ مجید کی جامع و مانع اصطلاحات ہیں۔ فحشآء کا مطلب ہے بےحیائی کے کام، مناظر، نظارے وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور سے ناجائز جنسی آزادی و اختلاط، جنس فروشی، جنسی بے راہروی، دعوتِ ہم آغوشی، بوس و کنار، صنفِ جمیلہ کے بالخصوص گلہائے شباب و عورات کے عریاں و نیم عریاں نظارے، نیز اس کے محرکاتِ جنسی، جیسے عشوہ و غمزہ اور رقص و ادا وغیرہ وغیرہ۔ فحشآء میں بخل و گدائی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ "منکر" ضد ہے معروف کی اور اس کے معانی ہیں: ہر وہ چیز، بات اور فعل جس کے کرنے اور جس کو اپنی ذات و نام کے ساتھ منسوب کرنے سے انسان کی فطرتِ صحیحہ ابا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے اس اصطلاح میں ظلم و جہل، جرم و گناہ، سیئہ و شر، سود و استحصال، شرک و بت پرستی، خیانت و رشوت، دروغ و بہتان، غیبت و دشنام، بدخلقی و بدکرداری، منشیات خوری و قماربازی، کسب و اکلِ حرام، سرقہ و رہزنی، سمگلنگ، چوربازاری وغیرہ وغیرہ کے معانی پائے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں، فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آذریت بھی منکر کے مفہوم میں داخل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے باوجود مسلم

معاشروں میں فحشاء و منکر سے فساد پھیلا ہوا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں نظامِ صلوٰۃ قائم نہیں ہے، دوسرے، نمازی صلوٰۃ کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ اب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے منع کرتی ہے، چند ایک مثالوں سے توضیح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اوّل، اللہ تعالیٰ نے متعدد بار انسان کو قرآنِ حکیم کی صفاتِ حسنہ سے آگاہ کیا ہے کہ وہ بلاشبہ نور و ہدایت اور رُشد و شفا ہے، لیکن ان سے استفادہ وہی کرتے ہیں جن میں ہدایت و شفا پانے اور اس کی دیگر صفاتِ حسنہ سے مستفیض ہونے کی سچی آرزو یا طلب و جستجو ہوتی ہے۔ دوم، سب جانتے ہیں کہ بارش رحمت ہے اور اس میں قوتِ احیا ہوتی ہے، لیکن اس سے وہی اراضی زندہ ہوتی اور نشو و نما پاتی ہے، جس میں زندگی کو قبول کرنے اور برگ و بار لانے کی "آرزو" ہوتی ہے، جسے قابلیت سے یا استعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوم، علم روشنی ہے، لیکن وہی لوگ علم کی روشنی حاصل کرتے ہیں، جن کو اس کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ چہارم، فطرت کے مناظر اور نظاروں میں جمال و جلال یا حُسن ہے جس سے وہی انسان جمالیاتی سوز و ساز اور جمالیاتی ثروت حاصل کرتے ہیں، جو اربابِ ذوق و شوق اور اہلِ آرزو و صاحبِ نظر ہوتے ہیں۔ صلوٰۃ میں نمازیوں کے دلوں میں تقویٰ و حیا کو زندہ و فعّال کرنے، رکھنے اور انھیں بے حیائی اور برائی کے کاموں سے باز رکھنے کی بلاشبہ صلاحیت پائی جاتی ہے، لیکن نمازیوں ہی میں صلوٰۃ کے خواص و فوائد سے مستفید ہونے کی آرزو ہو نہ دماغ تو اسے محروم خواص تو نہیں کہہ سکتے۔ آفتاب کی روشنی، دریا کے آبِ رواں اور کائنات و حیات کے حسین مناظر اور نظّاروں سے کوئی استفادہ کرے نہ جمالیاتی حظ اٹھائے اور نہ جمالیاتی ثروت ہی حاصل کرے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ قدرت کی ان حسین تخلیقات میں افادی و جمالیاتی اقدار نہیں۔ یہی مثال صلوٰۃ کی بھی ہے۔ چونکہ اس سے اہلِ آرزو ہی مستفیض ہو سکتے ہیں، اس لیے صلوٰۃ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مُصلّین کے دلوں میں اس کے فوائد و برکات سے بہرہ مند ہونے کی طلب و جستجو ہو۔

اس سلسلے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ایک اُصولِ دین سے بھی اِستشہاد کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے: "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" (البقرۃ ۲: ۲۵۶)، دین میں جبر نہیں، یعنی کسی کو زور اور تشدّد سے دین قبول کرنے پر مجبور کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ دین کا اطلاق کُل زندگی پر ہوتا ہے، لہٰذا اس اصول کا اطلاق صلوٰۃ سمیت عبادت کی ہر شکل پر ہوتا ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ کسی کو زبردستی اور اس کی مرضی کے خلاف اپنے حصارِ حیا میں نہیں رکھتی جب تک کہ انسان، صنفِ جمیلہ ہو یا صنفِ جلیلہ، اس میں رہنا نہ چاہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اس زمانے میں اقامتِ صلوٰۃ کے باوجود ان مُصلّین کی کمی نہیں جو فحشآء و منکرات کا اِرتکاب کرتے ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی زیرِ نظر آیۂ جمیلہ میں ایک اور بصیرت افروز حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر انسان کو فحشآء و منکر سے باز رکھنے میں نسبتاً بہت زیادہ کارگر ہے اور نہایت مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ شب و روز یا چوبیس گھنٹوں میں صرف پانچ وقت فرض ہے۔ اس میں شک نہیں اس کے اثرات بعد تک بھی رہتے ہیں لیکن دنیا کی رنگینیاں اور نظر افروزیاں اور زندگی کی دلکشیاں اور دلچسپیاں ایک تو بہت زیادہ ہیں اور ان کا ایک ایک کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا ست۔ دوسرے موضوعی یعنی شیطان ہر وقت خواہشات پیدا کرتا اور ان کو بنی آدم کا اِلٰہ بنانے کے لیے مزیّن کر کے انھیں دکھاتا رہتا ہے۔ اس ہمہ وقتی دشمنِ انسان کی، جو رہزنِ تمکین و ہوش اور غارتگرِ ایمان و آگہی ہے، نظر فریب و دلکش عیّارانہ چالوں سے اپنے بندوں کو تحفظ دینے کی خاطر ربّ العزّت نے صلوٰۃ کے ساتھ ذکر کو بھی فرض کر دیا اور اس کی افضلیت پر مُہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی۔ صلوٰۃ کی طرح ذکرِ الٰہی کے مقرّرہ اوقات نہیں ہیں، بلکہ یہ ہمہ وقتی عبادت ہے اور ہمہ وقتی حریفِ آدم کی جمالیاتی وسوسہ اندازی و فریب کاری کا انتہائی کارگر توڑ ہے۔ اس کی افضلیت کی وجہ حقیقی یہ ہے کہ یہ اہلِ آرزو مُصلّین کو نہ صرف فحشآء و منکرات سے بچاتا ہے، بلکہ ان کو ہر لحظہ جمالیاتی ثروت بھی بخشتا اور ان کا جمالیاتی ارتقاء بھی کرتا رہتا

ہے۔ جمالیاتی ارتقاء جہاں قلب کے منوّر و بینا اور حسین ہونے اور اسکے نور کی تدریجی ترقی مدام اور انسان کے ترفّع درجات پر دلالت کرتا ہے، وہاں وہ اس کے معروضِ حسن وعشق کے قرب وحضور اور دید و رضوان کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ "جو دم غافل سو دم کافر" اور یادِ الٰہی کی افضلیت پر دال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہی اہلِ آرزو نمازی ہی سدا یاد کرتے رہتے ہیں، جن کے قلب میں اس کے عشق کی شمع فروزاں ہوتی اور اسے تب وتابِ جاودانی دیتی ہے۔ ایسے ہی حسین و منیر قلبِ سلیم میں اس کا معروضِ حسن وعشق رہتا ہے، جس کی جلوہ سامانی سے وہ حیا کا ناقابلِ شکست قلعہ بن جاتا ہے جس میں شیطان نہ نقب لگا سکتا ہے اور نہ مرد وصنفِ جمیلہ کو ورغلا کر اس سے باہر ہی لا سکتا ہے۔ قلعے سے باہر نکلنے کا مطلب اپنی ہلاکت وبربادی کو دعوت دینا ہی تو ہے۔

اصل یہ ہے کہ صلوٰۃ کے خواص اور تقاضے ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ چنانچہ اگر وہ انسان سے فحشاء ومنکر سے بچنے کا تقاضا کرتی ہے تو اس میں خود بھی نمازیوں کو ان سے بچانے کے خواص پائے جاتے ہیں، جن سے مستفید ہونے کی پیش شرط آرزو مے استفادہ ہے۔ اس اعتبار سے صلوٰۃ کے تقاضے اس کے خواص پر دلالت کرتے ہیں۔ "حیا" فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے، اور غور کریں تو اس کا تقاضا بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ "صلوٰۃ انسان کو فحشاء ومنکر سے منع کرتی ہے" یہ مطلب ہے کہ انسان کو فحشاء ومنکر سے تحفظ دینا صلوٰۃ کا خاصہ تو ہے، لیکن انسان صاحبِ ارادہ واختیار ہے اور اُسے فکر وعمل کی آزادی ودیعت کی گئی ہے، لہٰذا وہ اس سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ فحشاء ومنکرات ایسے افعالِ قبیحہ سے مجتنب رہے اور اس سے باز ومجتنب رکھنے والی قوّت سے کام لے، جسے "حیا" سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمتِ غیر مترقبہ ہے؛ نیز صلوٰۃ ایسی نعمتِ حسنیٰ سے بھی کام لے اور اس کا پاس واحترام کرے جو حیا کو تقویت دینے، زندہ رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے والی ہے۔ انسان اگر صلوٰۃ وحیا ایسی عظیم نعمتوں کا شکر بجا لانے، یعنی

ان سے کام لینے اور مستفید ہونے کے بجائے ان کی تکفیر کرتا ہے، یعنی ان سے استفادہ و استفاضہ نہیں کرتا تو اس کے حریف ابلیسی۔ نفسی شیطان کو اُسے اس کے حصارِ حیا سے باہر نکالنے اور بے حیائی اور بدی کے کاموں کو مزیّن کر کے دکھانے اور اس دھوکے میں اسے ان کی طرف مائل کرنے کا موقع مل جاتا ہے، جسے وہ کبھی ضائع نہیں کرتا۔ حیا کا پردہ اُٹھ جائے تو انسان بے شرم و بیباک ہو جاتا ہے اور جو نفسِ امّارہ چاہتا اور کہتا ہے، وہ بغیر سوچے سمجھے کر گزرتا ہے، اس لیے کہ وہ اسے اپنا اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق بنا لیتا ہے۔ الغرض، بے حیا شخص کو نہ قدرت کے قانونِ مکافات، ملک یا شریعت کے قانونِ تعزیر کا اور معاشرے، اپنے ضمیر کی ملامت اور اپنی تذلیل و تحقیر کا خوف رہتا ہے اور نہ عزتِ نفس اور صلوٰۃ کے تقدّس و عظمت کا پاس و احترام ہی۔ اس کے نتیجے میں وہ انسانیّت و عبدیّت کے ارفع و اعلیٰ مقام سے پھسلتے پھسلتے قِردیّت و خنزیریّت کے تحت الثّریٰ میں گر جاتا ہے، جسے قرآنِ مجید "اسفل السّافلین" سے تعبیر کرتا ہے۔

تعلیمی و تربیتی تقاضے

مسجد اسلامی ثقافت کا سرچشمہ ہے، جہاں سے توحید و تقویٰ، علم و حکمت، حسن و نور، عدل و احسان، رحمت و مغفرت اور حسنہ و خیر کے چشمے بہتے اور مزرعِ حیات کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کی اوّلین حیثیت عبادت گاہ کی ہے اور دوسری حیثیت درسگاہ کی۔ درسگاہ کی اس لحاظ سے از بس اہم ہے کہ عبادت کی احسن و اکمل صورت صلوٰۃ ہے اور اس کو مؤثر بنانے اور اس کے ثمرات سے مستفید ہونے کے لیے علم و حکمت کا ہونا ناگزیر ہے۔ اگر نمازی قرآنِ حکیم کی قرأت و تلاوت کے معانی و مفہوم کو سمجھتا ہی نہیں کہ اس کے فرائض و حقوق اور تقاضے، نیز مقاصد و غایات کیا ہیں؟ تو وہ صلوٰۃ کے فیوض و برکات اور دُنیوی و اُخروی فوائد و حسنات، نیز فلاح و کامیابی کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اس سے مستنبط ہوا کہ صلوٰۃ کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نمازی علم و حکمت حاصل کریں اور اپنے خُلق کی تہذیب و تحسین یا تزکیۂ نفس کریں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں مُعلّم نوعِ انسانی اور رحمۃ للعالمین حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسجد تعمیر کرتے ہی اُسے درسگاہ بنا دیا، اور طلباء میں ذوقِ قرآن پیدا کرنے، قرآنِ مجید کے علوم و فنون، معانی و مطالب اور اسرار و رموز سمجھنے کی آرزو کا احیاء کرنے، ان کے قلوب کی تطہیر و تنویر اور ان میں مضمر قوتوں کی نشوونما کرنے اور علم و حکمت سکھانے کی خاطر نصابِ قرآن کے مطابق تعلیم و تربیت کا نظام قائم کیا۔ یہ نصابِ قرآن کا اعجاز تھا کہ دیکھتے دیکھتے سارے جزیرۃ العرب میں علم کا چرچا اور اُن کی تہذیب کا شہرہ اقصائے عالم میں ہو گیا؛ نیز اسلامی معاشرے میں صدّیقین و شہداء اور صالحین و مجاہدین کی کثرت ہو گئی، اور انھوں نے حیرت انگیز مادّی اور جمالیاتی ترقی کر کے دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اسلام کی

تحریک رحمۃ للعالمینی کے ذریعے افرادِ نسلِ انسانی کو تزکیہ اور علم و حکمت کی غیر معمولی اہمیت سے آگاہ کیا؛ انہیں خود آگاہ و خدا آگاہ بنانے اور سرطانی اداروں کے چنگل سے چھڑانے اور ان کو ان کے انسانی حقوق دلانے کے لیے جہاد کیا اور وعظ و نصیحت سے کام لیا۔ قدرت نے اس کے صلے میں اقوامِ عالم کی قیادت اُمّتِ مسلمہ کو تفویض کر دی۔

صلوٰۃ ان نمازیوں کے دلوں میں اپنے حسین و انقلاب انگیز اثرات مرتب کرتی ہے جو اُسے سمجھتے، اس کا علم رکھتے اور اس کے تقاضے پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے تعلیم و تربیت اذبس اہم تقاضا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے صلوٰۃ ان نمازیوں کے لیے ذریعۂ فلاح ہے، جو خاشعین ہوتے ہیں (المؤمنون ۲۳ : ۲)؛ اور خاشعین اہلِ علم ہوتے ہیں (فاطر ۳۵ : ۲۸)۔ علم کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام میں "علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد و عورت پر فرض ہے" (ارشادِ نبویؐ)؛ نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ (حدیث)؛ "یعنی پنگوڑے سے قبر تک علم حاصل کرتے رہو۔" اگر یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ عظیم علم و حکمت کا سرچشمہ ہے تو پھر بچپن سے دمِ واپسیں تک تلمیذ القرآن بنے رہنا ہم پر فرض ہے اور اسی صورت میں ہم صلوٰۃ کے تقاضے پورے اور اس کے مادّی و جمالیاتی فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

عسکری تقاضے: جہاد

نظامِ صلوٰۃ کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ نمازیوں کے قلوب کو زندہ و بیدار کرتا، ان میں ربِّ جلیل و قدیر کی صفاتِ حسنہ کے شعور کا اِحیاء کرتا؛ نیز ان میں خشیتِ الٰہی پیدا کر کے غیر اللہ مثلاً قوم و ملک کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کا چاہے وہ کتنے طاقتور کیوں نہ ہوں، ان کا خوف نکال دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سچے نمازی صدّیق و شہید، صالح و متقی اور مجاہد دار اربابِ عشق و وفا بن جاتے ہیں۔

جہاد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے دین، اس کے بندوں کی آزادیٔ انسانی یا بنیادی حقوق، عزّت و آبرو، جان و مال اور ملک و خلافت کے تحفّظ یا ان کے خلاف جارحیّت کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جانا اور سیف و قلم، جان و مال اور ہر طرح سے جنگ و قتال کرنا۔ اسے عسکری جہاد کہتے ہیں۔ صلوٰۃ بالحق نفسِ امّارہ کے خلاف جہاد کرنے کی تربیّت دیتی ہے۔ سردی ہو یا گرمی، بہار ہو یا برسات، خوابِ سحر کی لذّت کو خیر باد کہہ کر ربِّ ذوالجلالِ والاکرام اور معروضِ حسن و عشق کے حضور اس کی کبریائی و عظمتِ بے قیاس اور توحیدِ اُلوہیّت و ربوبیّت کا اور اپنی عبودیّت اور فقر و عجز کا اظہار و اعتراف کرنے کے لیے اُٹھنا، غسل یا وضو کرنا اور مسجد میں بروقت پہنچنا اور باجماعت صلوٰۃ قائم کرنا، "جہادِ اکبر" نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح ہر روز، ہر موسم میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کے لیے اوقاتِ مقرّرہ پر آرام و راحت، کاروبار اور دیگر محبوب مشاغل کو چھوڑ کر مسجد میں حاضر ہونا، نمازیوں میں جذبۂ جہاد ہی پیدا نہیں کرتا، بلکہ اُن کو تربیّت یافتہ مجاہد بنا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، صلوٰۃ نمازیوں میں حق الیقین پیدا کر دیتی ہے کہ موت و حیات اور نفع و نقصان، عزّت و ذلّت اور فتح و شکست کا مالک

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے۔ یہ یقین انسان کو ناقابلِ شکست مجاہد بنا دیتا ہے۔

یہ تربیتِ جہاد دینے کے بعد صلوٰۃ نمازیوں سے امید رکھتی اور مطالبہ کرتی ہے کہ اگر قوم اُمّتِ مسلمہ کو دشمنوں کے خلاف جہاد کرنا پڑے تو وہ مخلص و بہادر مجاہدوں کی طرح جہاد میں حصہ لیں اور جان و مال وغیرہ کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ مجاہد کو یقین ہوتا ہے کہ جہاد بالحق میں حصہ لینا اور شہادت پانا، ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے کہ جس کا صلہ جنّت کی حیاتِ ابدی ہے، اور جنّت ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے، جس کا کوئی متنفس تصوّر تک نہیں کر سکتا (السّجدۃ ۳۲ : ۱۷؛ نیز احادیثِ طیبہ) اس کا نقیض یہ ہوا کہ عسکری جہاد بالحق اہلِ ایمان کو جہنّم کے عذابُ النّار کے کربِ تشکیب رُبا سے بچا لیتا ہے۔ جنّت اگر اہلِ حسن و سُرور کا ابدی حسنُ المآب ہے تو جہنّم اہلِ نار و اشرار کا شرّ المآب ہے، جس کے عذاب کی شدّت کا یہ عالم ہے کہ وہاں وہ لذّتِ موت و حیات سے ناآشنا، عالمِ نزع میں رہیں گے (طٰہٰ ۲۰ : ۷۴؛ الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳)۔ علاوہ بریں، سچے نمازی اس حقیقت سے آگہی رکھتے ہیں کہ جہاد بالحق اہلِ ایمان پر فرض ہے اور اس کے لیے ضروری سامانِ حرب کے ساتھ تیار رہنا چاہیے، کُتبِ سماوی اور خاص طور سے ہر تحریف سے محفوظ آخری کتاب اللہ قرآنِ مجید شاہد ہے کہ جو قوم مجاہد نہیں رہتی اور عصری تقاضوں کے مطابق جہاد کے لیے جدید ترین ہتھیار ایجاد و اختراع نہیں کرتی اور ان سے لیس نہیں ہوتی، حریف قوتیں اسے ہلاک و برباد کر دیتی ہیں یا محکوم و غلام بنا لیتی ہیں۔ محکوم و غلام قوم کا دین نہ تو خالص اور نہ حیات ہی طیبہ ہی رہتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ذلّت و مسکنت میں نفسِ مطمئنہ نہیں رہتا اور ان میں حُسن و حسنہ، حسنِ انقلاب و حُسنِ مآب کی آرزو نحیف و نزار بلکہ مردہ ہو جاتی ہے۔

مسجدِ نبوی عسکری تربیت گاہ بھی تھی اور عسکری صدر مقام بھی۔ مجاہدِ اعظم، معلّمِ اعظم اور پیغمبرِ آخر و اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نمازیوں کو جہاد کی تربیت دیتے اور انہیں رمیؓ یعنی

دوُر مار ہتھیار کے استعمال میں مہارتِ تامّہ حاصل کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دوُر مار ہتھیار صرف تیر ہی تھا؛ لہٰذا تیر سازی و تیر افگنی کو بھی اہم ترین جنگی ہتھیار سمجھتے تھے؛ اور مجاہدوں کو اس کی تیاّری و استعمال کی مزاولت پر بہت زور دیتے تھے۔ آپؐ نے دوُر مار ہتھیار یا ہتھیاروں کی غیر معمولی اہمیت کو چودہ سو برس پہلے محسوس کیا تھا اور اہلِ ایمان کو ان کی ایجاد و اختراع کی تاکید فرمائی تھی، چنانچہ مسلمانوں نے جب تک آپؐ کی اس جنگی حکمتِ عملی پر خصوصاً عمل کیا، فتح و نصرت ان کے قدم چومتی رہی۔ لیکن ملوکیّت کے دور میں اسلام کی حریف قوّتوں، خصوصاً یہود نے مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ اور مہارتِ جنگی ختم کرنے کی خاطر اُمّتِ مُسلمہ کے نظامِ تعلیم سے نصابِ قرآن کو ایسی چابکدستی سے خارج کر دیا کہ اسے ان کی اس سازش کی خبر تک نہیں ہونے پائی؛ بلکہ اس ناقابلِ تلافی زیاں اور جرم و گناہِ کبیرہ کا اب بھی مسلمانوں میں شعور ہے نہ احساس۔ اس دعوے کا زندہ ثبوت مساجد اور نام نہاد "دینی" مدارس ہیں، جن میں نصابِ قرآن، خصوصاً قلم، سائنس اور ٹیکنالوجی شجرِ ممنوعہ ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مُسلم اقوام ایٹمی اسلحہ، میزائیل اور دیگر دوُر مار ہتھیار بنانے کی مہارت نہیں رکھتیں، اس لیے ترقّی یافتہ اقوام کی محتاج و دست نگر اور ان کی محکوم و غلام ہیں؛ بلکہ اپنی بقا و سلامتی کے لیے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔

میرے نزدیک مسلمانوں کی نشاۃ الثّانیہ کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے حسِین انقلاب کے ذریعے مُسلم ممالک میں سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کی بیخ کنی اور ان میں اسلامی حکومت کا قیام، جس کا آئین، آئینِ قُرآن ہو اور معاشرے میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم ہوں۔ مسجد کو اسلامی ثقافت کا مرکز بنایا جائے، وہ درسگاہ بھی ہو، جس کا نظامِ تعلیم نصابِ قُرآن کی بنیاد پر استوار ہو، اور نمازی قرآنِ مجید اور صلوٰۃ کے وظائف و حقوق اور تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور انھیں احسن طریق سے پورا کرتے ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صدّیقین و شہداء اور صالحین و مجاہدین ہوں اور جدید عسکری تقاضوں کو

پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ الغرض، قرآنِ مجید کی رُو سے سچّے مؤمن اور نمازی وہ ہوتے ہیں جو اپنے ملک میں متذکرۂ بالا اسلام کے چار بنیادی نظام، نظامِ صلوٰۃ، نظامِ زکوٰۃ، نظامِ امر بالمعروف اور نظامِ نہی عن المنکر قائم کرتے ہیں (الحج ۲۲: ۴۱)؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صلوٰۃ قائم بھی کرتے اور اس کے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں۔

احسان: شاہدیّت و مشہودیّت کا حُسنُ المقام

احسان کو جبرائیلیؑ۔ محمدیؐ اصطلاح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لفظ کا مادّہ ح س ن ہے، اور اسلام آرزوئے حُسن ہے۔ کتابِ کائنات، کتابِ فطرتِ انسانی اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کی آخری زندہ حسین کتاب "قرآنِ مجید" پر جمالیاتی نقطۂ نظر سے غور کریں تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے جس پر صاحبِ جمال وجلال، حاملِ خُلقِ عظیم اور رحمۃٌ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم چودہ صدیاں پہلے پہنچے تھے کہ اللہ جمیلٌ یحبُّ الجمالَ" (= اللہ حسین ہے، حسن سے محبت رکھتا ہے)، یہ بات بڑی اہم ہونے کے باعث یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ربِّ کریم کا تخلیقی عمل جمالیاتی۔ تزویجی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے جو چیز بھی تخلیق کی اُسے ایک تو حسین بنایا اور دوسرے اس کا زوج یا جوڑا بنایا ہے۔ ربُّ العالمین نے آسمانوں اور زمین میں جو نعمتیں بھی بنائی ہیں، اپنے جمالیاتی۔ تخلیقی شہکار 'انسان' کے لیے بنائی ہیں، جسے اس نے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام ودیعت کیا اور حُسن و قبح میں امتیاز کرنے اور حُسن سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنے کے لیے اُسے جمالیاتی حِس (AESTHETIC SENSE) سے نوازا۔

اس نے سب کچھ اس لیے حسین بنایا کہ وہ بنی نوعِ انسان کا امتحان لے اور دیکھے کہ ان میں سے کون حسین عمل کرتے ہیں اور کون قبیح (ھود ۱۱: ۷)۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے دین کو آرزوئے حُسن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ انسان فطرۃً حسن کی طلب و جستجو رکھتا ہے، کیونکہ اسے جمالیاتی حس ودیعت کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت، دین کی غایت اور انسان کی فطری آرزو یہ ہے کہ وہ خَلق و خُلق دونوں اعتبار سے حسین ہو؛ اس کے افکار و اعتقادات اور عواطف و امیال حسین ہوں؛ اس کا قول و عمل حسین ہو؛ وہ خوف و حزن کے کرب سے محفوظ، حسین و مطمئن زندگی کرے؛ نیز اپنے حقیقی معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہ) کی حمد و ثنا اور پرستش کرے؛ اور اس کی یاد کو حرزِ جان بنائے؛ اس سے عشق اور اس کی مخلوقات سے محبت کرے؛ اور اس کے قُرب و رضوان اور دید و حضوری کی آرزو میں سب سے پہلے صلوٰۃ قائم کرے۔ صلوٰۃ کو اس طرح قائم کرنا کہ نمازی کو "شاہدیت" و "مشہودیت" کے دو جمالی مقامات میں سے کوئی ایک حاصل ہو جائے، احسان کہلاتا ہے۔

احسان عبدیت کا عظیم جمالیاتی مقام ہے۔ اس کی صراحت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلیغ انداز میں فرمائی ہے کہ دریائے معانی کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیثِ طیبہ میں جو حدیثِ جبریلؑ کے نام سے مشہور ہے، حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ ایک روز مسجدِ نبویؐ میں حضرت جبریلؑ نے بشر کی صورت میں صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم کی موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام اور ایمان کی اہمیت سے متعلق سوال کیے۔ آپؐ ہر سوال کا جواب دیتے تو حضرت جبریلؑ اس پر صاد فرماتے (یہ اندازِ گفتگو صحابۂ کرامؓ کے لیے تعجب خیز تھا لیکن وہ آدابِ مجلسِ نبویؐ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے خاموش رہے)۔ آخر میں روح الامین علیہ السلام نے پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ۔ یعنی تو اس طرح عبادت کرے جیسے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو (یعنی یہ مقام شاہدیت نصیب نہ ہو) تو تجھے اس حقیقت کا یقین ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (المشکوٰۃ، کتاب الایمان۔ ج ۱) اسے مقامِ مشہودیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس حدیثِ طیبہ سے معلوم ہوا کہ قیامِ صلوٰۃ سے

احسان یا اس کے مقاماتِ شاہدیت و مشہودیت حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ استنباط بھی کر سکتے ہیں کہ صلوٰۃ کا یہ بنیادی تقاضا ہے۔ نمازیوں کے لیے احسان کے ان دو جمالیاتی مقامات میں سے کسی ایک پر فائز ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ اس کے بغیر صلوٰۃ قُرَّۃُ العین نہیں بن سکتی۔

قُرَّۃُ العین قرآنِ حکیم کی فکر انگیز اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں: آنکھوں کی ٹھنڈک؛ اور اسے اس نے جنّت کے لیے استعمال کیا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ٥

(السجدۃ ۳۲ : ۱۷) : یعنی کوئی متنفس یہ (حقیقت) نہیں جانتا کہ اس کے لیے کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی ہوئی ہے جو ان کے اعمال (صالحہ) کا صلہ ہے۔

جنّت کی حقیقت سے بلا شبہ کوئی متنفس آگاہ نہیں، لیکن قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبہ میں اس کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بہشت نہ صرف حسین و نظر افروز، دلکش و لذّت آفرین، طمانیت انگیز و سرور آگیں، روح افزا و وجد آفرین، مسرّت انگیز و کیف پرور اور حیرت انگیز و مسحور کُن، نعمتوں اور نظاروں کی تفرّج گاہ؛ اہلِ آرزو کے معروضِ حُسن و عشق کی لِقا و حضوری، ہم نظری و ہمکلامی اور قربِ رضوان کا حُسنُ المقام ہوگا۔

علاوہ بریں، جنّت میں ایک طرف الحُسن ہر آن اپنی نئی و مسحور کُن جمالیاتی تخلیقی شان میں سدا جلوہ پیدا کرتا رہے گا تو دوسری جانب اس جلوۂ نو بنو کے مشاہدۂ جاوداں کے لیے اہلِ جنّت کا شعور بھی اِرتقائے مدام کی شان میں رہے گا۔ ان ناقابلِ ادراک جمالیاتی کیفیات سے انسان کے مرگ نا آشنا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کو جو وجد آفرین و مسحور کُن ٹھنڈک ملے گی، اس کے لیے قرآنِ مجید نے "قُرَّۃُ العین" (یا آنکھوں کی ٹھنڈک) کی تعبیر اختیار کی ہے۔

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی قریب قریب اسی مفہوم میں صلوٰۃ کو قُرَّۃُ العین سے تعبیر کیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: فِيْ صَلَاتِيْ قُرَّةُ عَيْنِيْ : یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اس حدیثِ طیبہ کی معنویّت کی طرف چند مختصر اشارے کیے جاتے ہیں: اوّلاً، نمازی اگر

اہلِ آرزو میں سے ہو اور احسان کے مقامِ شاہدیّت پر متمکّن بھی ہو تو اس کا الٰہِ حقیقی یا معروضِ حسن و عشق اسے اپنے انوار و تجلّیات سے نوازتا ہے اور جب چاہے اس کے قلب پر اپنا جلوۂ صُوری بھی پیدا کرتا ہے۔ ان جمالیاتی ۔ اُلوہی مشاہدات سے اور خاص کر دیدِ "دوست" سے اہلِ آرزو کو ایسی سرور انگیز کیف پرور اور تعجّب خیز و مسحور کُن ٹھنڈک ملتی ہے، جس سے اُن کا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام بے مثال و شدید لذّت و مسرّت حاصل کرتا ہے۔ یہ بے نظیر ٹھنڈک نہ صرف آتشِ خوف و حزن کو ٹھنڈا کرتی، بلکہ قلب کو گلہائے طمانیّت و مسرّت کا بہشت بنا دیتی ہے۔

ثانیاً، دیدِ "دوست" اس کے قُرب و حضوری اور رضا و لقاء پر دلالت کرتی ہے چنانچہ اس سے اہلِ جذب و شوق کی آرزوئے وصال پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کو ایسی جمالیاتی لذّت و مسرّت اور تسکین و طمانیت ملتی ہے، جس میں مسحور کُن و کیف پرور اور رُوح افزا و وجد آفرین ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہم نے "جمالیاتی ٹھنڈک" کی تعبیر اختیار کی ہے جمالیاتی ٹھنڈک یا قُرّۃُ العین ہی اصل میں جمالیاتی ثروت ہے۔ یہ بہائے جنّت بھی ہے، اور صیرفیِ جنّت بھی۔

ثالثاً، جلوۂ صُوری سے شمعِ محبّتِ الٰہی کی تب و تاب میں افزونی پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں حسّی۔ قلبی۔ نفسی نُور بھی تیز تر ہوتا اور اپنا اِتمام پے در پے کرتا رہتا ہے، جسے جمالیاتی ارتقاء سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس جمالیاتی اِرتقاء سے نفس کو جمالیاتی ٹھنڈک یا قُرّۃُ العین ملتی ہے جو ربِّ جمیل و کریم کی نعمتِ عظمیٰ و غایتِ دین بھی ہے اور حاصلِ زندگانی و تمنّائے آخر بھی۔

رابعاً، اپنے معروضِ حسن و عشق کی دید سے اہلِ آرزو کی آتشِ شوق تیز تر ہو جاتی ہے اور اس آتشِ شوق میں برقِ جمال و سُرور مضمر ہوتی ہے، جو قلب و جاں کو شدید جمالیاتی ٹھنڈک دیتی ہے۔ اس کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ جس قدر شدید سے شدید تر

ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کی جمالیاتی ثروت میں اضافہ ہوتا ہے۔

خامساً، صلوٰۃ قُرّۃُ العین بنے تو محرومِ حسن و عشق بھی خوش ہوتا ہے اور اہلِ آرزو کو اپنی رضا کی رحیقِ مختوم بھی پلاتا ہے، جو نفسِ روحی کی غذا ہے اور جس کے نشۂ بے خُمار میں کیف و سُرور کی ایسی بے مثال و لذّت انگیز ٹھنڈک ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ وہ شدید تر ہوتی جائے۔ "ہم رضائی" کی یہ کیفیتِ مدام انسان کے نفسِ مطمئنّہ اور جنّتی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس کیفیّت کے دوام کے لیے صلوٰۃِ پنجگانہ کا قیام اہلِ ایمان پر فرض ہوا۔ ہمیں یہ اصلِ عظیم یاد رکھنی چاہیے کہ صلوٰۃ کو اپنی قُرّۃُ العین بنانے کے لیے اس کے حقوق اور تقاضوں کو پورا کرنا ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ ہو، مثلاً عبادت و ریاضت ہو یا ایمان و عمل، تحقیق و تفتیش ہو یا جمالیاتی تخلیقی فعلیت، حکمتِ علمی ہو یا منصوبہ بندی، ایجاد و اختراع ہو یا اجتہاد و جہاد، اکتسابِ علم و ہنر ہو یا سعی و کاوشِ دیگر، احکام و قوانین ہوں یا ان پر عملدرآمد، ناتمامی یا ادھوراپن ہر حال میں عبث و بے سود، بلکہ بعض احوال و ظروف میں سخت مضرّت رساں و تباہ کُن، موجبِ حسرت و پشیمانی، باعثِ خوف و حزن اور وجہِ ناکامی و شکست بن جاتا ہے۔

کیا یہ حقیقت ہمیں غور و فکر کی دعوت نہیں دیتی کہ قدرت کی ہر تخلیق عیب و نقص سے مبرّا، موزوں اور احسن و اکمل ہوتی ہے، ناتمام یا ادھوری نہیں ہوتی؛ ان کی علّتِ غائی یہ ہے کہ احسن الخالقین کی حکمتِ علمی اور تخلیقی فعلیّت ہر لحاظ سے احسن و اکمل ہوتی ہے، ناتمام نہیں ہوتی۔ یہ سُنّتِ الٰہیہ قدرت کا ایسا قانونِ حیات ہے، جس پر عمل کرنا خود انسان کے اپنے بہترین مفاد میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس پر عمل کیے بغیر ہم اپنے کسی منصوبے، حکمتِ علمی اور عمل سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے، حتّیٰ کہ ہم اپنی ذات کی تکمیل اور اپنے حسّی، قلبی، نفسی نور کا اِتمام بھی نہیں کر سکتے۔ بالفاظِ دیگر، ہم جمالیاتی ثروت یا جمالیاتی ٹھنڈک حاصل کر سکتے ہیں، نہ کامیاب و عظیم انسان ہی بن سکتے ہیں۔

عظیم انسانوں کے سوانح حیات ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتے ہیں کہ انسان کی کامیابی و عظمت کا راز "اِتمام" یا سعی و کاوشِ کامل میں ہے۔ افراد و اقوام کی ناکامی و محرومی، شکست و ہزیمت اور ہلاکت و بربادی کا ایک بنیادی سبب ان کی حکمتِ عملی، منصوبہ بندی، سعی و کاوش کی "ناتمامی" یا ادھورا پن تھا۔ یہ سرِ زندگی مردانِ کامل یا اہلِ جنّت کی اِس دُعا میں مضمر ہے: رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (التحریم ۶۶ : ۸) یعنی اے ہمارے نشوونما دینے والے آقا! ہمارے نُور کا ہمارے لیے اِتمام کردے اور ہماری ناتمامی سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ تو بلاشبہ ہر شے پر مکمل قدرت رکھنے والا ہے۔

قدرت کے "قانونِ اِتمام" کے حوالے سے اقوامِ عالم کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستانی قوم سمیت دیگر مُسلم اقوام کی پسماندگی و ضعیفی، تشتت و افتراق، محتاجی و دست نگری اور ذلت و مسکنت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ قدرت کے قانونِ اِتمام پر عمل نہیں کرتیں جس طرح عمل کرنے کا حق ہے۔

عدل و احسان

صلوٰۃ بالحق یا حُسنِ صلوٰۃ کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ (یعنی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ پیدا کرو)۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اپنی شخصیت کو "صبغۃ اللہ" (یا رنگِ الٰہی) سے مزیّن کرو۔ ربِّ کریم کی ایک صفتِ حسنہ ہے کہ وہ عادل و محسن ہے اور عدل و احسان کو بہت زیادہ عزیز رکھتا ہے، لہٰذا اس کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآئِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ٥ (النّحل ۱۶:۹۰) : اللہ تعالیٰ عدل و انصاف اور حُسنِ سلوک کرنے اور اعزّہ و اقارب کو (اپنے مال و دولت میں سے ان کا "حق") دینے کا حکم دیتا ہے؛ اور بے حیائی کی باتوں (= فحاشی، بُخل، عریانی، بے حجابی، صنفِ جمیلہ کی جمال فروشی، اداکاری، رقص و سرود وغیرہ وغیرہ) اور عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ اور شریعت کے خلاف اعمال اور باتوں اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے؛ وہ تمھیں وعظ و نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔

اگرچہ عدل کی اہمیّت ہر شعبۂ حیات میں غیر معمولی ہے، لیکن ربِّ کریم احسان کو عدل پر ترجیح دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ احسان میں عدل و انصاف کے علاوہ ایثار و قربانی، ہمدردی و غمگساری اور اخوّت و موَدّت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے فلسفۂ احسان کو اپنے ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اسے اعجازِ قرآن کہنا بے جا نہ ہوگا؛ ارشادِ ربّانی ہوتا ہے:

وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (القصص ۲۸:۷۷) : احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔ ربِّ کریم نے انسان کے ساتھ اتنے احسان کیے ہیں کہ

کوئی گنوائے تو گنوا نہ سکے۔ احسان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ دوسروں کو حقِ محنت سے زیادہ دینا، مصیبت میں کام آنا، ہمدردی و غمگساری اور ایثار و قربانی کرنا، لوگوں کو سرطانی اداروں کے ظلم و استحصال سے نجات دلانے اور ان کے انسانی حقوق دلانے، ان کے جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کرنے کے لیے سعی و جہد کرنا، ان کے لیے معاشرے اور حکومت کو کفالتِ اجتماعیہ کا نظام قائم کرنے پر مجبور کرنا، ان کو لذتِ ایمان و تقویٰ سے آشنا کرنے اور خوف و حزن سے محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں و آرزومند رہنا۔

صلوٰۃ نہ صرف اپنوں، بلکہ غیروں اور غیر قوم سے بھی عدل کرنے کا حکم دیتی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ٥ (المائدۃ ۵: ۸) : اے لوگو جو ایمان لائے ہو یعنی مسلمانو! اللہ کی خاطر راستی پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی قوم یا گروہ کی دشمنی تمھیں اتنا مشتعل کر دے کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) عدل کرو کہ یہی تقوے سے لگتی ہوئی بات ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (یعنی اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرتے رہو، دُنیوی و اُخروی خیر و حسنہ کی طلب و جستجو میں رہو)۔ بلاشبہ اللہ اس سے اچھی طرح آگاہ ہے جو تم کرتے ہو۔

قرآنِ حکیم نے عدل و انصاف کا جو معیار قائم کیا ہے، اس کی نظیر کسی اور دین و مذہب میں نہیں ملتی۔ اس کے فلسفۂ عدل کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین یا کُل عالموں کا نظام عدل پر قائم کیا ہے، جسے وہ "المیزان" سے تعبیر کرتا ہے؛ لہٰذا انسان، جو خلیفۃ الارض ہے، اُسے بھی سُنّتِ اِلٰہی کے تتبّع میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر نظام کو عدل سے قائم رکھنا اور چلانا چاہیے، ورنہ اس میں خرابی و برہمی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس فلسفۂ عدل کی وسعتوں کو اللہ تعالیٰ نے تین مختصر آیاتِ جمیلہ میں سمیٹ لیا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ (الرحمٰن ۵۵: ۷تا۹): اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی (یعنی عدل قائم کر دیا تاکہ کائنات قائم رہے) خبردار المیزان یا نظامِ عدل میں زیادتی کرنا نہ خلل ڈالنا۔ اور انصاف کے ساتھ نظامِ عدل کو قائم رکھنا اور میزان یا عدل میں کمی نہ کرنا۔

اہلِ ایمان جو شب و روز میں کم سے کم پانچ وقت اپنے الٰہ و رب کے حضور اپنی عبودیّت و فرماں برداری کا اظہار و عہد کرنے حاضر ہوتے ہیں، ان سے صلوٰۃ تقاضا کرتی ہے کہ بحیثیتِ خلیفۂ ارضی ان کا بنیادی وظیفہ عدل و احسان کو اپنا شعارِ زندگی بنانا ہے۔ جو نمازی صلوٰۃ کا یہ تقاضا پورا نہیں کرتے ان کو حتمی طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی ہر صلوٰۃ مردہ و غیر مؤثر ہوتی ہے۔

کسبِ حلال

قیامِ صلوٰۃ کے لیے مُطہّر ہونا لازمی ہے۔ جسم و قلب، لباس و جگہ اور نیّت پاک و صاف ہو تو صلوٰۃ ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔ ہمیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ عبادت کی روح صلوٰۃ اور صلوٰۃ کی روح قُرآن مجید ہے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ (الواقعہ ۵۶: ۷۷۔ ۷۸) یہ بلاشبہ بلند مرتبت قُرآن ہے، ایک محفوظ کتاب میں؛ جسے مُطہّر لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا۔ آخری آیۂ جمیلہ کا مطلب یہ ہے کہ قُرآنِ مجید، جو جمیل و پاک کتاب ہے، اس کی روح یا معنویّت تک وہی لوگ رسائی حاصل کرتے ہیں، جن کا جسم اور باطنی نظام (یعنی قلبی۔ نفسی نظام) پاک ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حرام خور شخص کا باطنی نظام قبیح، ناپاک اور بے نور ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس کی جمالیاتی حِس، سمع و بصر، عقل و فکر اور ضمیر و نفسِ لوّامہ بے نور یا قُرآنِ مجید کی اصطلاح میں اس کا قلب اندھا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا

شخص جو حقیقت میں اندھا اور نجس ہو، وہ روحِ قرآن یا روحِ حسن کا کیسے مشاہدہ و ادراک کر سکتا ہے؟ وہ تو اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ قرآنِ کریم کے قریب بھی آئے۔ چونکہ صلوٰۃ میں قرآنِ کریم کی قرأت و تلاوت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاک گھر میں مطہّر لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس لیے ہر نمازی کا مطہّر ہونا، لابدی ہوا۔ چنانچہ مطہّر بننے کے لیے کسبِ حلال کرنا اور رزقِ حلال کھانا ناگزیر ہے۔

اس سے مستنبط ہوا کہ جو لوگ سودکاری وسود خوری کرتے ہیں، بے محنت کیے سرمائے کے بل پر بٹائی، نفع، کرایہ، پگڑی وغیرہ وغیرہ کے نام سے سود لیتے ہیں؛ قمار بازی، سٹہ بازی، حصص کاری، منشیات فروشی، جنس فروشی، ضمیر و قلم فروشی؛ چور بازاری، سمگلنگ، نوسر بازی، اقتصادی بددیانتی و بدکرداری، رشوت ستانی، رہزنی، چوری، ڈاکہ زنی، جبر و استحصال اور دیگر ناجائز طریقوں سے مال و دولت حاصل کرتے ہیں، وہ سب حرام خور ہوتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ان کا باطنی نور بجھ جاتا ہے اور ان کا قلب اندھا ہو جاتا ہے اور وہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے قابل نہیں رہتے۔ علاوہ بریں، رزقِ حرام سے ان کا باطنی نظام یا ہندی میں "من" گندہ و ناپاک ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور صلوٰۃ ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ ایسے لوگ اگر اپنے ظلم و جہل کے سبب صلوٰۃ قائم کرتے بھی ہیں تو بیہودہ۔ وجہ یہ ہے کہ ناپاک و گندے یا حرام خور لوگوں کی صلوٰۃ۔ بے نور و بے جان ہوتی ہے۔ ایسی صلوٰۃ سے متعلق محاورۃً کہتے ہیں کہ "صلوٰۃ نہیں ہوئی"۔

ہر عمل اور ہر شے اپنی تاثیر رکھتی ہے۔ کسبِ حلال دراصل حسنِ عمل ہے اور اس کی تاثیر یہ ہے کہ اس سے قلب زندہ و فعّال، حسین و مطہّر اور صحت مند و منیر بنتا ہے۔ حسنِ عمل قلب کی غذا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ رزقِ حلال کے حسنِ اثر سے انسان کا باطنی یعنی حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام اپنے وظائف احسن و اکمل طریق سے سرانجام دینے کے قابل بنتا ہے۔ بخلاف اس کے، رزقِ حرام سے باطنی نظام ناکارہ دغلط کار بلکہ بے جان ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے

میں عقل عیار و بے نور، ضمیر و نفسِ لوّامہ مضمحل و نحیف، الغرض حسی، قلبی، نفسی نظام جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اکلِ حلال پر بجا طور سے بہت زیادہ زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیاتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں:

(۱) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (البقرہ ۲: ۱۶۸): اے افرادِ نسلِ انسانی! زمین میں جو حلال اور طیب (پاکیزہ و نشو و نما دینے والی) چیزیں ہیں، ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۲) شیطان کا کہا نہ ماننے کی وجہِ جواز یہ ہے کہ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲: ۱۶۹): وہ یعنی شیطان تمہیں بدی، فحاشی یا بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا بھی کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے (کہ وہ اللہ نے کہی ہیں)۔

(۳) وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ (المائدۃ ۵: ۸۸): اور کھاؤ ان حلال و طیب چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں، اور اس کا تقویٰ اختیار کرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

ربِ قدوس نے جہاں رزقِ حلال و طیب کھانے کا حکم دیا ہے اور اس کا حکم حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں اُس نے رزقِ حرام کھانے کی ممانعت کر دی ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲: ۱۸۸): اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال و دولت غلط و ناجائز طریقے سے ہضم نہ کرو اور نہ انھیں حاکموں کے سامنے اس غرض سے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال و دولت کا کچھ حصہ ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

اگرچہ ہر قسم کے معاشرے میں معاشرتی سرطان لوگوں کا مال ناحق کھانے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، لیکن ایسے معاشرے میں جہاں سرطانی اداروں کی حکومت و عملداری ہو، رشوت چلتی ہو اور عدل مفت اور بلا تاخیر نہ ملتا ہو، اس قسم کے واقعات کثرت سے ہوتے رہتے ہیں، مثال کے طور پر، پاکستانی معاشرے میں، جو ہمارے ظلم و جہل اور قرآن مجید سے دوری و مہجوری کے سبب "استحصالی و سرطانی ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے باطل طریقے سے یتیم و بکیس اور ضعیف و لاوارث لوگوں کا مال کھانے کی سختی سے ممانعت کی ہے اور مثال بھی دی ہے: ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (النساء ۴: ۲): بیکس ولاوارث لوگوں کو اُن کا مال واپس کردو اور نفع بخش اچھے مال کو ناقص و نقصان دہ مال سے نہ بدل لو، نیز ان کے مال اپنے مال کے ساتھ خلط ملط کر کے نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

یہ سرطانی چالیں اسلام میں حق تلفی، ظلم، استحصال، بددیانتی، خیانت اور کاروباری بدکرداری کی گھناؤنی مثالیں ہیں۔ یہ کبیرہ گناہ ہیں، جو انسان کو اہلِ نار بنا دیتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ ان سے بچنے کی بار بار تاکید کرتا ہے، خصوصاً اس کی عبادت کرنے والوں یا نمازیوں کو اکلِ حرام سے سختی سے منع کرتا ہے: چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ ...... فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ٥ (البقرہ ۲: ۱۷۲ تا ۱۷۵): مسلمانو! اگر تم فی الواقعہ صرف اللہ ہی کی عبادت (یا بندگی و پرستش و اطاعت) کرتے ہو تو پھر پاکیزہ و نشوونما دینے والی چیزیں بے کھٹکے کھاؤ جو اللہ نے تمھاری غذا کے لیے مہیا کر دی ہیں اور اس کا شکر ادا کرو۔ اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کر دی ہیں وہ یہ ہیں: مردار، خون، سؤر کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ جو شخص باامرِ مجبوری (جان بچانے کی خاطر) ان میں سے کوئی چیز کھالے اور اس کا ارادہ شریعت کی حد سے تجاوز کرنے یا ضرورت سے زیادہ کھانے کا نہ ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں؛

بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جو لوگ اللہ کے احکام کو جو اُس نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں، چھپاتے ہیں، اور اس (کتمانِ حق) کے بدلے دُنیا کے حقیر فائدے خریدتے ہیں، وہ دراصل آگ سے اپنے پیٹ بھر رہے ہیں (کیونکہ یہ اکلِ حرام ان کے لیے آتشِ عذاب بننے والا ہے)، قیامت کے دن اللہ اُن سے قطعاً بات نہیں کرے گا (اور وہ اپنے معروضِ حُسن وعشق کی لذتِ کلام سے محروم رہیں گے اور یہ محرومی اتنی بڑی ہے کہ انسان اس کا اس دُنیا میں تصوّر تک نہیں کر سکتا)، اور نہ ان کا تزکیہ کرکے ان کے جرم وگناہ کے اثرات کو دُور ہی کرے گا۔ ان کے لیے کرب انگیز عذاب میں رہنا ہوگا۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے عوض عذاب کا سودا کیا۔ کیا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنّم کا عذاب برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

حرام خوری درحقیقت انسان کو سمندر سرشت واہلِ نار بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت سے بار بار انسان کو متنبہ کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ○ (النّسآء ۴ : ۱۰) : جو لوگ یتیموں یعنی لاوارث وبیکس لوگوں کا مال ظُلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں، وہ ضرور جہنّم کی شعلہ زن آگ میں جھونکے جائیں گے۔

کسبِ حرام کے بیشمار طریقے ہیں۔ ظُلم ورشوت، لوٹ مار بازی، خیانت وبددیانتی، ضمیر فروشی، قلم فروشی، نطق فروشی، آیات فروشی، جسم فروشی وجمال فروشی، جنس فروشی ومنشّیات فروشی، سمگلنگ، رہزنی، غدّاری، چوری، جیب تراشی، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، اِستحصال، نذرانہ گری، سُود خوری، شرعاً حرام چیزوں کا کھانا، وغیرہ وغیرہ۔ مندرجہ ذیل آیاتِ جلیلہ میں حرام خوری کے ایسے طریقوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو مسلمانوں سمیت ہر قوم میں، جو دینداری کی مدّعی ہے، استعمال ہوتے

ہیں اور اکثر لوگ انہیں جائز و حلال سمجھتے ہیں: اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو ان انسانیت سوز طریقوں اور ان کو استعمال کرنے والے سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں سے مجتنب و محترز رکھنے کی خاطر ارشاد فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ...... مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۝ (التوبۃ ۹: ۳۴-۳۵):

مسلمانو! اکثر علماء و مشائخ (یہود و نصاریٰ کے ہوں یا مسلمانوں سمیت دیگر اہلِ کتاب کے) لوگوں کا مال ناجائز و ناروا طریقوں سے کھاتے ہیں (مثلاً چندوں، نذرانوں، چڑھاووں کی صورت میں، تعویذوں، گنڈوں، اور جھاڑ پھونک کے معاوضے اور زیارت و قدم بوسی کی رسم کے طور پر، جلسوں، جلوسوں، عرسوں، کانفرنسوں میں تقریر کرنے اور ختمِ قرآن، نعت خوانی اور غمی خوشی کی مجلسوں میں رسوم ادا کرنے کے معاوضے کے طور پر مال ہتھیاتے ہیں)؛ اور انھیں اللہ کی راہ (یعنی توحید و انفاق بالعفو اور عدل و احسان کی راہِ راست) سے روکتے ہیں (وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کا مشرکانہ کاروبار چل نہیں سکتا)؛ اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرکے رکھتے ہیں (اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو پر عمل نہیں کرتے) اور نہ اللہ کی راہ میں خرچ ہی کرتے ہیں، ان کو کربناک اذیتوں کی خوشخبری سنادو۔ عذاب کا دن آئے گا تو اسی سونے چاندی کا ڈھیر جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور (اس پگھلے ہوئے مواد سے) ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اس وقت ان سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اکتناز یا دولت جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں نکات بے حد اہم، قابلِ غور اور دُوررس نتائج کے حامل ہیں:

اوّلاً، علماء و مشائخ سوء (جعلی پیر، درویش، فقیر، مجاور، قلندر وغیرہ وغیرہ) معاشرتی سرطان اور آزر ہیں، اور ان کا پیشہ لوگوں کو مشرک و اکابر پرست، ناخواندہ و توہم پرست بنانا، سرطانی اداروں کی حمایت و معاونت کرنا اور لوگوں کو توحیدِ حق، علم و حکمت، عدل و احسان،

زکوٰۃ والعفو کی راہِ راست سے روکنا ہے، اور اس کے نتیجے میں ناجائز و ناروا طریقوں سے ان کا استحصال کرنا اور ان کا مال کھانا ہے۔ اسے آزری ادارے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ ادارہ فرعونی، ہامانی اور قارونی اداروں کا معاون و طرفدار ہوتا ہے، اور اس کے عوض اسے ان کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ آزروں کا انجام جہنم کا عذابِ الناک ہے۔

ثانیاً، اکتناز یا دولت کو جمع کرنے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو کی بالخصوص اور حکمِ زکوٰۃ کی بالعموم خلاف ورزی ہے۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں یہ "قارونی" ہے۔ اس سے ایک تو دولت کی گردش کا دائرہ سکڑ جاتا ہے اور وہ جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں یا قارونوں کے درمیان ہی گردش کرتی رہتی ہے۔ دوسرے اس کے نتیجے میں قارونوں کے علاوہ باقی لوگ خصوصاً محنت کش (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اپنے بنیادی حقوق سے محروم اور مفلوک الحال و محتاج ہوتے جاتے ہیں؛ نیز معاشرے میں سرطانی برائیاں پھیل جاتی ہیں۔ لوگوں کا اخلاقی، تعلیمی، معاشی معیار پست ہو جاتا ہے اور قوم پسماندہ، کمزور و نحیف ہو جاتی ہے اور بقول علامہ اقبالؒ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مختصر یہ کہ آزر اور قارون، اللہ تعالیٰ کے نافرمان و سرکش اور اس کے بندوں کے خون آشام دشمن اور ان کی دنیا و عاقبت برباد کرنے والے، رہزنِ ایمان و تقویٰ اور غارت گرِ توحید و آگہی ہوتے ہیں۔ ان کے مریدوں اور ماننے والوں اور خود ان کا حشر عبرتناک ہوگا اور جہنم میں عالمِ سکرات کی حالت میں زندگی کرنا، ان کا مقدر ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے قدرت کے قانونِ اکتساب کو بڑے ہی بلیغ اور جامع انداز میں بیان کر دیا ہے: ارشاد ہوتا ہے:

(۱) كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (المدثر ۷۴: ۳۸)؛ ہر شخص اپنے اکتساب کے

عوض رہن ہے۔

(ب) كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ (الطور ۵۲ : ۲۱) : ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔

اس اصولِ اکتساب کی صراحت خود ہی قرآنِ حکیم نے کر دی ہے :

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲ : ۸۱، ۸۲) : (قدرت کا قانونِ کسب یہ ہے کہ) جس شخص نے بھی اپنے کاموں سے بدی کمائی اور اس کی خطاؤں نے اُسے گھیرے میں لے لیا تو وہ اہلِ نار میں سے ہے اور اس میں یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔ (بخلاف اس کے) جو شخص ایمان لایا اور اس نے صالح عمل کیے تو وہ اہلِ جنّت میں سے ہے اور اس میں ہمیشہ رہنے والا۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ فحشاء و منکر، سیّئہ و شر، جُرم و گناہ، ظلم و استحصال اور سود و اقتصادی بددیانتی و بدکرداری وغیرہ وغیرہ سب حرام کاری میں داخل ہیں۔ کسبِ حرام کی ایک انتہائی خطرناک و انسانیت سوز شکل ربوٰا یا سود ہے۔ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے اور سچ فرمایا ہے کہ

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

وجہ یہ ہے کہ سود عبارت ہے ظلم و استحصال، بخل و شقاوتِ قلبی اور حرام خوری سے؛ نیز یہ بنیاد ہے سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری اور ساہو کاری یا بینکاری نظاموں کی۔ یہ سب سرطانی ادارے ہیں، جو افرادِ نسلِ انسانی کا خون چوستے، ان کے حقوق غصب کرتے، ان کو بھوکوں مارتے، ناخواندہ و جاہل اور محتاج و دست نگر اور محکوم و غلام رکھتے ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ سود و حرام خوری و حرام کاری کا کرشمہ ہے کہ سود خور سرمایہ دار اقوام دھڑا دھڑ اسلحہ تیار کر رہی ہیں اور ان کو بیچنے کی خاطر پس ماندہ خصوصاً مسلم اقوام کو آپس میں لڑا رہی ہیں

یا ان پر جارحانہ حملے کر رہی ہیں یا ان کو حریف قوموں کی جارحیت کا ہدف بنایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رب العالمین نے سود کو حرام قرار دیا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرۃ ۲: ۲۷۵): اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

ساتھ ہی سود خوروں کو متنبہ کر دیا کہ وہ اگر سود کھاتے رہے، جو حقیقت میں آگ کھانے کے مترادف ہے اور اس سے وہ اہلِ نار بنتے ہیں تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ انھیں دوزخ میں ہمیشہ جلنا ہوگا (۲: ۲۷۵) ۔ حرام کار خصوصاً سود خور چونکہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے بندوں کے سرطانی دشمن ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ان کو الٹی میٹم دیتا ہے کہ "اگر تم اس کسبِ حرام سے باز نہیں آئے تو اللہ اور اس کے رسول ؐ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ"۔ (البقرۃ ۲: ۲۷۸-۲۷۹)۔

ان آیاتِ جلیلہ سے معلوم ہوا کہ سود خوری ایسا سرطانی مرض اور ظلم و استحصال ہے کہ قرآنِ حکیم کی نظر میں وہ اللہ جلَّ شانُہٗ اور اس کے رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف جنگ ہے، لہٰذا جملہ سود خور، چاہے وہ سود کے روپے سے صدقہ و خیرات کرتے، زکوٰۃ دیتے، ہسپتال، مدارس وغیرہ وغیرہ بناتے، روزہ رکھتے، حج و عمرہ کرتے اور صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، نہ صرف مؤمنوں بلکہ کُل نوعِ انسانی اور سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول ؐ کے دشمن اور ان کے خلاف برسرِ جنگ ہیں۔

سود خوری کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی اور چیزوں کو بھی حرام کیا ہے، جو قبیح اور ظلمِ عظیم ہیں، مثال کے طور پر یہ آیۂ جلیلہ پیش کی جاتی ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف ۷: ۳۳): [اے پیغمبرؐ] ان سے کہہ دیجیے کہ میرے پروردگار

مالک نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں: بے حیائی کے کام (مثلاً جنسی بے شرمی، بے غیرتی، بخل، کنجوسی، قومی بے حمیتی، جسم و ضمیر اور نطق و قلم کا سودا کرنا وغیرہ وغیرہ)، خواہ کھلے بندوں کیے جائیں یا چوری چھپے؛ خطا و گناہ اور حدود اللہ سے تجاوز؛ نیز یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو کہ اُس نے واقعی وہ فرمائی ہے)۔

معلوم ہوا کہ مندرجۂ بالا تمام چیزیں اور اعمال حرام ہیں اور جو ایسا کرتے ہیں، وہ حرام کار ہیں اور کسبِ حرام انسان کو دُنیا میں لذّتِ زندگی، طمانیتِ قلب، حلاوتِ ایمان و تقویٰ جایاتی ثروت سے محروم اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے دُور و مہجور کر دیتا، نیز اس کے قلب کو اندھا اور اسے رہینِ خوف و حزن کر دیتا ہے؛ اور وہ آخرت میں اندھا اُٹھے گا، جہنّم میں جائے گا، جہاں اسے موت آئے گی اور نہ وہ لذّتِ حیات سے آشنا ہی ہو گا (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴؛ الاعلیٰ ۸۷: ۱۳)؛ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے حقیقی معروفِ حسن و عشق کی دید و کلام ایسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے گا:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ؕ (الْمُطَفِّفِيْن ۸۳: ۱۵) (یقیناً، اس روز (قیامت) وہ اپنے ربّ کی دید سے پردے میں رکھے جائیں گے (تاکہ اس کی دید سے محروم رہیں، جو بہت بڑی محرومی ہے)۔

اس گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ حُسنِ عبادت جو کلیدِ جنّت ہے، اس کی احسن و اکمل شکل حُسنِ صلوٰۃ ہے، اور اس کا تقاضا ہے کہ نمازی کسبِ حلال کریں تاکہ حیاتِ طیبہ بسر کریں اور اس کے فیوض و برکات، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور افادی و جایاتی اقدار سے استفادہ کریں اور نفوسِ مطمئنہ بن جائیں، جن کے لیے ربِّ کریم نے اپنی جنّت تیار کی ہے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک جنّت میں جانا فوزِ عظیم یا عظیم کامیابی ہے (النّسآء ۴: ۱۳)۔

صداقت و امانت

صلوٰۃ کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا ناگزیر ہے۔ اور الفاتحہ میں ہم ربِّ رحمٰن و رحیم سے یہ استدعا و آرزو کرتے ہیں:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ (۱: ۶-۷): ہمیں راہِ راست پر چلا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ تو مغضوب اور نہ گمراہ ہی ہوئے۔

یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے کہ وہ نبیینؑ، صدّیقین، شہداء اور صالحین ہیں (النسآء ۴: ۶۹)۔

نبوّت کا وہبی ہونا اور سلسلۂ نبوّت کا بعثتِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جانا، اسلام کے بنیادی عقائدِ جلیلہ و محرّکہ میں سے ہے، لہٰذا صلوٰۃ اہلِ ایمان و اہلِ آرزو نمازیوں سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ صدّیقین و شہید اور صالح بنیں۔ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ مؤمن سے جرم و گناہ تو سرزد ہو سکتے ہیں، لیکن وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس سے استنباط کر سکتے ہیں کہ جھوٹا شخص مؤمن نہیں ہو سکتا، یا بالفاظِ دیگر، صداقت ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ صداقت امانت کو چاہتی ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

صلوٰۃ بالحق اگر نمازیوں کو صدّیقین و شہید اور صالح و امین بنانے کی تاثیر رکھتی ہے تو ان سے ایسا بننے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ آج کل جھوٹ بولنا اور امانت میں خیانت کرنا اکثر مسلمانوں اور نمازیوں کا شعارِ زندگی بن چکا ہے۔ کاروبارِ لین دین اور دیگر معاملاتِ زندگی میں جھوٹ بولنے اور بددیانتی و خیانت کرنے کو وہ کاروباری ضرورت سمجھتے ہیں اور اس جرم و ظلم

اور گناہِ کبیرہ کے جواز میں ان کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہے کہ "صلوٰۃ و روزہ اور حج و عمرہ وغیرہ اپنی جگہ اور پیشہ ورانہ و کاروباری جھوٹ، بددیانتی و خیانت اپنی جگہ"۔ ان کا یہ مقولہ، نظریہ اور شعار گمراہ کن و تکذیبِ دین ہے ۔ اصل یہ ہے کہ صلوٰۃ و عبادت اور ایمان ان کا معتبر و زندہ اور اثر انگیز ہے، جو صدیقین و امین ہوتے ہیں۔ جس شخص کے دل میں صداقت و امانت نہیں، وہ سچا مؤمن ہے نہ سچا نمازی۔

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ سچا مؤمن و نمازی کے لیے صادق و امین ہونا ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صلوٰۃ کے تقاضے پورے کیے بغیر اہلِ ایمان کی صلوٰۃ حسن و زندگی اور تاثیر سے محروم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشروں میں نمازیوں کی کثرت کے باوجود صدیقین، شہدا، صالحین اور امین و دیانتدار مسلمانوں کی عبرتناک حد تک کمی ہے۔

خشوع و خضوع: حضوریِ قلب

صلوٰۃ کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان چونکہ ربّ العالمین کا بندہ و پروردہ اور سائل و گدا ہے، لہٰذا اُسے متواضع و منکسر المزاج ہونا چاہیے، نہ کہ مغرور و متکبّر۔ وجہ یہ ہے کہ بندے کو تکبّر زیب نہیں دیتا۔ کبریائی کا سزاوار صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا متکبّر صرف اور تنہا اللہ جلّ شانہٗ ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، تکبّر دو قسم کا ہے: ایک اپنے ہم جنس بنی آدم کے ساتھ اور دوسرا اپنے الٰہ و ربّ کے ساتھ تکبّر کرنا۔ انسانوں کے ساتھ تکبّر کرنے کا مطلب اپنے آپ کو بڑا اور ان کو چھوٹا یا حقیر سمجھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تکبّر کرنا یہ ہے کہ اس کے حضور دست بستہ قیام و رکوع و سجود کرنے میں عار محسوس کی جائے یا اجتناب محسوس کیا جائے؛ نیز اس کے احکام کی اطاعت نہ کی جائے؛ اس کے کلامِ پاک کو نہ سُنا نہ پڑھا جائے اور نہ اسے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی کی جائے؛

نخوت و غرور کی وجہ سے اس کی عبادت نہ کی جائے؛ نیز اس کی ذات، صفات یا کاروبارِ خدائی میں غیراللہ کو شریک مانا جائے، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اس کے احکام کے بجائے اپنا حکم چلایا جائے اور انہیں اس کے بجائے اپنی حمد و ثنا اور بندگی کرنے پر مجبور کیا جائے؛ نیز اپنے آپ کو ان کا رازق و حاکم اور مطاع و مالک سمجھا جائے۔ اس بنا پر تکبّر، عوائے کبریائی و خدائی ہے اور متکبّر اللہ تعالیٰ کا باغی، اس کے بندوں کا دشمن اور ظالم و جاہل ہے۔ لیکن اپنے ظلم و جہل کے باعث

جانتا ہے پر مانتا نہیں

اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کیوں قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کو "متکبّر" کہتا اور اہلِ ایمان اسے اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے سمجھتے ہیں؟ اس کی توجیہہ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اہلِ ایمان کے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کبریائی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عینِ ذات ہے۔ لہٰذا وہ اصلاً "متکبّر" اور اسم بامسمّٰی ہے۔ بخلاف اس کے جملہ افرادِ نسلِ انسانی ربّ العالمین کے بندے، فقیر اور پروردہ ہیں، نیز وہ اصلاً ایک ہیں اور عبدیّت ان کی فطرت ہے؛ لہٰذا کبریائی نہ کسی فردِ بشر کی صفت ہے نہ ہو ہی سکتی ہے۔ اس بنا پر ہر متکبّر انسان اسم بے مسمّٰی ہوا، اس لیے کاذب و منافق اور ظالم و جاہل ہوتا ہے۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں "عزازیل" کو تکبّر نے ملائکہ کے زمرے سے نکال کر ابلیس و شیطان، ملعون و مردود اور جہنّمی بنا دیا؛ نیز کیوں قرآنِ مجید انسان کو غرور و تکبّر سے منع کرتا اور اس کے نتائج و عواقب سے متنبّہ کرتا اور صلوٰۃ اسے متواضع بننے کی تربیّت یا انگریزی میں ٹریننگ دیتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان کو فطری طور پر اس حقیقت کا اذعان و ایقان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ و پروردہ اور محتاج و سائل ہے، کیونکہ روزِ الست اللہ تعالیٰ نے جملہ افرادِ نسلِ انسانی کو اپنے حضور اکٹھا کر کے ان کو اس حقیقتِ عظمیٰ کا شعور و ایقان

ودلیعت کیا تھا اور اعتراف کرایا تھا کہ وہ ان سب کا ربّ ہے؛ نیز انسان کو اس حقیقت کا بھی یقین ہے کہ موت اٹل اور یقینی ہے۔ اس کے باوجود وہ کون سے عوامل و محرّکات ہیں جو اُسے "متکبّر" بنا دیتے ہیں؟

یہ نہایت اہم سوال ہے۔ میرے نزدیک اس کے دو بنیادی اور چار فروعی عوامل و محرکات ہیں، جو بالترتیب یہ ہیں: ظُلم و جہل، نیز فرعونیّت و ہامانیّت اور قارونیّت و آزریّت۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ظُلم و جہل انسان کی حیوانی صفاتِ قبیحہ ہیں، جو اس کے حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام کے جمود و تعطّل پر دلالت کرتی ہیں۔ غور کریں تو اس نظام کے جمود و تعطّل کا باعث بھی ظُلم و جہل ہیں، کیونکہ ان کے سبب انسان اپنی حسی۔ قلبی اور نفسی قوّتوں سے وہ کام نہیں لیتا جو لینا چاہیے اور اتنا نہیں لیتا جتنا لینا چاہیے۔ اس کفرانِ نعمت کے منفی و قبیح اثرات قلب پر مرتّب ہوتے ہیں، جو حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں مرکزی حیثیّت رکھتا ہے، اور وہ طرح طرح کے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان قلبی امراض سے میں نے اپنی تصنیف "جمالیات (قرآنِ حکیم کی روشنی میں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۸۴ء) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ مثال کے طور پر، امراضِ قلب کے سبب انسان کی سامعہ و باصرہ اس قدر متاثّر ہو جاتی ہیں کہ قرآنِ مجید کے محاورے میں وہ بہرا، گونگا اور اندھا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حُسن و حق کی باتیں سننے، آیاتِ الٰہیہ کو دیکھنے اور ان سے استفادہ و استفاضہ کرنے کی صلاحیّت سے محروم ہو جاتا ہے؛ نیز حُسن و حق کی باتیں کہنے، ان کی تصدیق و تائید کرنے اور سچی شہادت دینے کو وہ نہ تو اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے اور نہ شہری ذمّے داری۔ نفسی نظام بگڑ جانے سے نفسِ لوّامہ ضعیف و ناتواں اور اس کی نصیحت و سرزنش غیر مؤثّر ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں نفسِ امّارہ بیباک و بے لگام ہو جاتا ہے۔ قلب کا نظام بگڑ جائے تو انسان کی عقل و فکر سلیم رہتی ہے نہ اس کی جہت ہی صالحہ رہتی ہے اور اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے؛ نیز اس کا فطری نُور بُجھ جاتا ہے اور قلب اندھا ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ توحید و شرک،

حسن و قبح، حق و باطل، سود و زیاں، حسنہ و سیئہ، خیر و شر اور امن و فساد میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

تکبّر کے دیگر عواملِ اربعہ میں سے جو ظلم و جہل کا نتیجہ ہیں، ایک "فرعونیّت" ہے۔ فرعونیّت کسی صاحبِ قوّت و اقتدار معاشرتی سرطان کے خُدائی و معبودیّت اور حاکمیتِ اعلیٰ کے دعوے، اس کے داعیۂ عُلُوّ و فساد اور طُغیان و عدوان پر دلالت کرتی ہے، اور اس کا نشۂ پندار اس کو متکبّر بنا دیتا ہے، جس کے لئے "فرعون" کی تلمیح مُستعمل ہے؛ نیز فرعون معاشرتی سرطان کی علامت بھی ہے اور سرطانی ادارے کی بھی۔ فرعونی حکومت سے ایسی سرطانی حکومت مراد ہے جس میں احکامِ الٰہیہ کے بجائے معاشرتی سرطان یا سرطانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام نافذ ہوں اور رعایا اپنے انسانی و شہری حقوق سے کُلّیتاً یا جزوی طور سے محروم ہو۔

تکبّر کی دوسری عاملہ "ہامانیّت" ہے، جو فرعون کے نام پر فرعونی کرتی ہے۔ ہامانیّت ایسے سیاسی سرطانی ادارے کی علامت ہے، جو فرعونی حکومت کے وزراء، عمائدین و ارکان، نیز مصاحبوں اور اعلیٰ افسروں پر مشتمل اور اس کا معاون و پشتیبان ہوتا ہے۔ اس ادارے کا کام فرعون اور اس کی حکومت کی حکمت عملیوں کی حمایت کرنا، اس کے گُن گانا، اس کی خوشامد و کاسہ لیسی کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ مفادات و مراعات حاصل کریں۔ یہ ادارہ علامت ہے خود غرضی و منافقت، ہوسِ اقتدار و ترقّی، جلبِ منفعت، چمچہ گیری و رعایا دشمنی کی۔

تیسری عاملہ "قارونیّت" ہے۔ یہ معاشی سرطانی ادارے سے عبارت ہے، جو جاگیرداروں، زمینداروں، سرداروں، خوانین و شیوخ، صنعت کاروں، سرمایہ داروں، سودی سرمایہ کاروں، بینکاروں اور سود خوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قارونیّت علامت ہے اکتناز و احتکار، ظُلم و استحصال، ہوسِ عُلُوّ و فساد، بخل و سود خوری، قساوت و شقاوت، تکاثر و خود نمائی اور جذبۂ خدائی و سطوت کی۔ قارون بھی اپنی جاگیروں اور علاقوں میں فرعونی و ہامانی کرتے ہیں، یعنی ایک طرف حکومت کی حمایت و معاونت کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی رُعایا کو اپنے محکوم و مملوک اور خادم و پروردہ

سمجھتے، ان کا استحصال کرتے، ان سے بیگار لیتے، انہیں انسانی حقوق سے محروم رکھتے، ان کی تذلیل و تحقیر کرتے اور ان پر ہر طرح کے مظالم روا رکھتے ہیں۔ یہ قارونی ادارے ہیں، جو قومی و بین الاقوامی وسائلِ پیداوار پر قبضہ جما کر گردشِ دولت کے دائرے کو اپنے تک محدود کرتے اور دوسروں کو ان سے محروم کرتے رہتے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ انسان کی تحقیر و تذلیل، محرومی و ناداری، محتاجی و مفلوک الحالی، محکومی و غلامی، نیز ظلم و استحصال، ناانصافی و خیانت، فحشاء و منکر، تکاثر و تفاخر، اسراف و تبذیر، طبقاتی منافقت اور جنگ و جدال کے خونچکاں و انسانیت سوز ہنگاموں کے ذمے دار یہ قارونی ادارے ہیں؛ نیز انہیں پر افرادِ نسلِ انسانی کی لذتِ حسنِ زندگی، جالیاتی ثروت، روشنیِ علم و حکمت، محبت و رحمت اور حسن و حسنہ سے محرومی، نیز ان میں حسنِ انقلاب کی مرگِ آرزو کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اس بنا پر قارونی ادارے بنی نوعِ انسان کے لیے سرطان اور اللہ تعالیٰ کے باغی و دشمن، اس کے مقہور و مغضوب اور گمراہ و اہلِ نار ہیں۔ بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ آدمی کسی پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے اور اس "خود ظلمی" کے نتائج و عواقب (REPERCUSSIONS) سعادتِ دل اور جالیاتی ثروت سے محرومی کی صورت میں نکلتے ہیں، جو بہائے جنت اور انسان کے الٰہ و ربّ کے قرب و رضوان کا ذریعہ ہے۔

تثلیث کی چوتھی عاملہ آزریت ہے۔ اس سے مراد علمائے سوء اور مشائخ کاذب کی مذہبی پیشوائیت کا سرطانی ادارہ ہے۔ ہامانی و قارونی اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی فرعونی حکومت کی تخلیق ہے۔ یہ مذہبی متکبرین کا طبقہ ہے۔ ایک تو یہ فرعونی، ہامانی اور قارونی اداروں کی حمایت کرتے ہیں، جن سے یہ مالی مفادات اور دیگر مراعات حاصل کرتے ہیں؛ دوسرے، یہ مسندِ ارشاد پر بیٹھ کر لوگوں پر اپنا حکم چلاتے، فتوے دیتے اور ان میں بدعات و مشرکانہ رسوم کی ترویج کرتے ہیں۔ یہ کام وہ تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے کرتے ہیں؛ تیسرے، وہ لوگوں کا استحصال کرتے، ان سے بیگار، نذرانے، چندے اور چڑھاوے وغیرہ وغیرہ وصول کرنے کی خاطر

ان کو مشرک، اوہام پرست اور بت پرست بناتے ہیں۔ یہ سرطانی ادارہ شرک و بت پرستی (= اکابر و شبیہہ پرستی، قبر و آستانہ پرستی وغیرہ وغیرہ)، بدعت و غلوّ فی الدّین اور مشرکانہ و بیجا رسوم اور تحقیر و تذلیلِ انسانی کی علامت ہے۔ الغرض تکبّر ایک انسانیت سوز جرم اور سرطانی مرض ہے جو مستکبرین اور مستضعفین دونوں کے لیے مہلک ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام نے اس کی سخت مذمت اور اس سے بچنے کی از حد تاکید کی ہے، نیز اس کی سزائے عذابُ النّار سے بار بار متنبہ کیا ہے۔

صلوٰۃ کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ وہ نمازیوں کو تکبّر سے باز رکھنے کی خاطر ان میں خشوع و خضوع اور تواضع پیدا کرتی اور ان کو نظری و عملی تربیّت بھی دیتی ہے۔ چنانچہ نظری تربیّت وہ اذان اور آیاتِ قرآنی کے ذریعے دیتی ہے، جو اس پر پڑھی جاتی ہیں اور عملی تربیّت وہ اپنے ایک ایک رکن کے ذریعے کرتی ہے۔ چنانچہ نمازیوں کو اقامتِ صلوٰۃ کے وقت سے آگاہ کرنے اور مسجد میں آنے کی دعوت دینے کی خاطر موذّن اذان دیتا ہے تو تربیّت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اذان کے بول اس قدر ایمان افروز اور اثر انگیز ہیں کہ انسان ظالم و جاہل نہ ہو، بلکہ اہلِ آرزو یا متقی ہو تو اس کے قلب کا غرور و تکبّر سے منزّہ ہو کر متواضع ہو جانا یقینی ہے۔ اس کا پہلا ہی کلمہ اللہُ اکبر قاطعِ تکبر ہے، کیونکہ وہ انسان میں اس حقیقت کا شعور بیدار کرتا ہے کہ "بڑا" صرف اللہ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اللہُ اکبر کے بول موذّن چھ بار دہراتا ہے تاکہ انسان کا شعور اگر خفتہ ہو تو بیدار ہو جائے اور وہ خود مغرور و متکبّر ہو تو متواضع ہو جائے۔ اذان کے سارے کلمات خصوصاً کلماتِ توحید متکبّرین کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں۔ دل زندہ اور اس میں تقویٰ و ایمان ہو تو انسان اذان سن کر متکبّر نہیں رہ سکتا؛ یعنی وہ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر اور چھوٹا نہیں سمجھ سکتا؛ وہ نہ تو اپنے آپ کو سردار، وڈیرا، ان داتا، مخدوم، نواب، شہنشاہ، بادشاہ، وغیرہ وغیرہ متکبّرانہ القابات سے ملقب کر سکتا اور نہ محنت کشوں (= مزدوروں، کسانوں، ملازموں، پیشہ وروں وغیرہ

وغیرہ) کو "کمّی" یا حقیر اور اپنے محکوم و مملوک ہی سمجھ سکتا ہے۔

معاشرتی سرطانوں کو بالخصوص اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، خصوصاً علمائے سوء اور مشائخِ کاذب کو جو نشۂ علم و مشیخت میں دوسروں کو، خصوصاً اپنے مریدوں، خادموں، طلبا اور عقیدت مندوں کو حقیر اور اپنے آپ کو بڑا خیال کرتے ہیں اور اس عجب و تکبّر کے باوجود اپنے آپ کو روحانی پیشوا، دین کے اجارہ دار اور برگزیدہ انسان تصوّر کرتے ہیں یا کم از کم ایسا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے مدارس و مجالس ہوں یا حویلیاں اور حجرے، ان میں اخوت و مساوات اور حلم و تواضع کا کوئی مظہر دکھائی نہیں دیتا۔

علم و مشیخت کا یہ غرور و تکبّر انتہائی خطرناک و مہلک سرطانی مرض ہے، جو مسلم معاشرے میں وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہمارے ظلم و جہل کی حد یہ ہے کہ ہمیں اس کا شعور ہے نہ احساس۔ یہ واقعیت اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ ہم متقی و اہلِ آرزو ہیں نہ سچے مؤمنین و مُصلّین؛ اِلّا ماشاءاللہ۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ اذان سن کر مؤمن اپنے آپ کو اقامتِ صلوٰۃ کے لیے آمادہ پاتا، وضو کرتا اور کلماتِ توحید پڑھتا ہے تو ان کی برکت سے پانی میں حسی قلبی نفسی نظام کو زندہ و فعّال کرنے کی جانفزا تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس میں اپنی عبدیت و فقیری (= محتاجی) کا شعور بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اس زندہ شعور کے ساتھ وہ مسجد کو چلتا ہے تو اس سے شیطان دُور بھاگتا اور اس کے دل میں عجب و غرور اور ریا و کبر کے اثرات مٹتے جاتے ہیں۔ ربِّ اکبر و اعظم کے خانۂ مقدّس میں جہاں صرف اور صرف ذکرِ الٰہی کی اجازت ہے اور غیر اللہ کا ذکر ممنوع ہے، پہنچ کر اس کے دل میں بیک وقت اس کی عظمت و کبریائی، عزّت و قدرت اور سبحانیّت و صمدیّت کا اور اپنی عبدیت و محتاجی اور عجز و ضعیفی کا احساس و شعور شدید تر ہو جاتا ہے۔ پھر وہ تکبیر سن کر اقامت کے لیے دیگر نمازیوں کے ساتھ پیش امام کے پیچھے ایک ہی صف میں دوش بدوش ہاتھ باندھ کر اپنے ربِ اعلیٰ کے حضور قیام کرتا اور سورۂ فاتحہ اور دیگر آیاتِ قرآنی

سنتا ہے تو اس سے اس کے اندر لرزشِ خفی پیدا ہو جاتی ہے جو رکوع و سجود سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اس کا شعورِ دو گونہ اس وقت اپنی معراج کو اور اس کا نورِ باطنی اِتمام کو پہنچتا ہے، جب وہ پہلے اپنا سرِ نیاز اپنے ربّ سبحانہ، وتعالیٰ کے حضور جھکاتا اور پھر اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے اور خشوع و خضوع سے اپنی پیشانی اور ناک رگڑتا اور اقرار کرتا ہے کہ اللہ سبحان و عظیم اور اعلیٰ و اکبر ہے۔ اس عالمِ خشوع و خضوع میں اس پر جلالِ الٰہی کی کیفیت سے رقّت طاری ہو جاتی ہے اور چشم، نمناک و قلب خونناب فشاں ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں استکبار و غرور کے سب داغ دھل جاتے ہیں اور وہ متواضع و حلیم بن کر مسجد سے نکلتا ہے بشرطیکہ ہے کہ نمازی بھی سچا اور اس کی صلوٰۃ بھی سچی ہو یا اور یہی صلوٰۃ کا بنیادی تقاضا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ نمازی سچے ہوتے ہیں نہ اُن کی صلوٰۃ جنہیں صلوٰۃ کی مادّی و جمالیاتی افادیت و اہمیت اور اس کے تقاضوں کا شعور و یقین نہیں ہوتا، اور وہ اسے دکھاوے کے لیے یا اسے بیگار سمجھ کر حضوریِ قلب کے بغیر بیدلی و بیزاری سے پڑھتے ہیں۔ بخلاف اس کے، سچے نمازی ہماری اصطلاح میں اہلِ آرزو ہوتے ہیں۔ اہلِ آرزو سے مراد وہ اہلِ حسن و سرور ہیں، جنہیں اپنے حقیقی معروضِ حسن و عشق کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کی، نیز دُنیوی و اُخروی حسنہ، طمانیّتِ نفس و جمالیاتی ثروت کی سچی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ جمالیاتی ثروت، بہائے جنّت اور جمالیاتی اِرتقاء کی عاملۂ حقیقی ہے، اور صلوٰۃ میں تواضع و انکساری قائم رکھتے ہیں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

نظامِ صلوٰۃ کا قیام حقوق اللہ کو ادا کرنے کا احسن و اکمل ذریعہ ہے۔ نظامِ صلوٰۃ کا قیام، جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، اسلامی حکومت و معاشرے کی مشترکہ ذمے داری ہے (الحج ۲۲: ۴۱)۔ اس حقیقت سے ہم آگاہ ہو چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا رب بھی ہے اور الٰہ بھی۔ اس نے دُنیا اور اس کی ہر چیز حسین بنائی ہے اور آسمانوں اور زمین میں انسان کے لیے بالخصوص بے قیاس و لامتناہی نعمتیں ودیعت کر دی ہیں۔ علاوہ ازیں، انسان کو صُوری و معنوی لحاظ سے حسین بلکہ احسن و اکمل بنایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین ۹۵: ۴)؛ ہم نے انسان کا خَلق و خُلق احسن بنایا ہے۔

اس نے انسان کو حِسی، قلبی، نفسی نظام ودیعت کیا ہے اور آزادیِ ارادہ و اختیار بھی عطا کی ہے؛ علم بالقلم بھی سکھایا ہے۔ اسے سماوی کتابیں بھی دی ہیں، خاص کر محفوظ و مصئون قرآنِ مجید، جو نور و ہدایت اور رُشد و شفا ہے۔ یہ سب کچھ اس پر اس لیے ارزانی کیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کر سکے۔ قیامِ صلوٰۃ ایک تو خود اللہ تعالیٰ کے حقِ اُلوہیت و ربوبیت کی ادائگی کا ایک حسین طریقہ ہے، اور وہ بیک وقت نمازیوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو باحسن وجوہ ادا کرنے کا داعیہ پیدا کرتا اور ان سے ایسا کرنے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ یہ تقاضا انھیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اگر اسے پورا نہ کیا گیا تو صلوٰۃ اپنے حسنِ اثر سے محروم ہو کر مُردہ و قبیح اور بے فائدہ ولایعنی ہو جاتی ہے۔

اللہ جلّ شانہٗ کا بنیادی حق یہ ہے کہ "یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (النور ۲۴: ۵۵)؛ یعنی اہلِ ایمان

میری عبادت (اطاعت و بندگی) کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

جیسا کہ متعدد بار توحید کے اس اصل الاصول پر زور دیا گیا ہے، شرک ظُلمِ عظیم ہے، جسے اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کبھی معاف نہ کرے گا اور مُشرکوں کو ہمیشہ آتشِ نار میں جلنا، مرنا اور مر مر کے جینا ہوگا۔ ایک تو اللہ تعالیٰ الحُسن ہے، کیونکہ اس کی ذاتِ اقدس جمیع صفاتِ حسنہ کا سرچشمہ ہے : وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷: ۱۸۰) : جُملہ حسین نام یا صفات اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسے حسین ناموں ہی سے پکارو، دوسرے، وہ انسان سمیت جُملہ مخلوقات کا اِلٰہ (= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور رب (= خالق و رازق اور پروردگار و آقا اور مالک و حاکم) ہے، لہٰذا اسی کا حق ہے کہ ہم اس کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کریں اور اسی سے اس کی فتح و نصرت، ہدایت و رحمت اور مغفرت و رضوان کی اِستدعا کریں۔ اس کے سوا کسی اور ہستی کو اس کی ذات و صفات میں شریک سمجھیں نہ کریں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ اور سُبحان و صمد اور وہّاب و غنی ہے اور جُملہ افرادِ نسلِ انسانی بھی اس کے بندے، فقیر یعنی محتاج و سائل ہیں؛ لہٰذا انھیں صفاتِ اِلٰہیہ سے متصف سمجھنا، مثلاً رازق یا داتا، سمیع و بصیر، مجیب الدعوات، کارساز و مُشکل کُشا، حاجت روا و عالم الغیب وغیرہ وغیرہ سمجھنا، ان کو حاجت روائی کے لیے پکارنا اور ان سے رزق، مدد، اولاد وغیرہ وغیرہ طلب کرنا، اللہ تعالیٰ کی خدائی، صفاتِ اُلوہیّت و ربوبیّت کے انکار کے مترادف ہے؛ نیز ایسا سمجھنا اور کرنا انسانیّت کی توہین اور اپنی ذات کی نفی و تذلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں ظُلمِ عظیم، جہل اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و رب سمجھنا اور اس کی صفاتِ حسنہ پر ایمان لانا اور اس ایمان کے مطابق زندگی کرنا اور شرک ایسے ظُلمِ عظیم اور جہلِ مرکب سے گریزاں و ترساں رہنا اللہ تعالیٰ کے حق کو تسلیم کرنا ہے، عبادت کی پیش شرط ایمان ہے۔ ایمان کے اجزائے لاینفک ہیں :

(۱) توحید: اس کی مجملاً تشریح کر دی گئی ہے۔ یہاں مزید اختصار سے صراحت کر دی جاتی ہے: اس حقیقت کو قولاً و فعلاً تسلیم کرنا کہ (۱) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور (۲) اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۱۲: ۴۰) پہلے کلمۂ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود و خدا نہیں؛ لہٰذا ہر موحد پر لازم ہے کہ وہ عملاً خدائی و معبودیت کا دعویٰ کرنے والے سرطانی اداروں مثلاً فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری اداروں کی تکذیب و ابطال کیا جائے اور اسے تسلیم نہ کیا جائے۔ ان معاشرتی سرطانوں کی حمد و ثنا کی جائے اور نہ ان سے اُمیدیں وابستہ کی جائیں، کیونکہ یہ شرک و کفر ہے۔ اسی حقیقتِ کبریٰ کو علامہ اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

دوسرا کلمۂ توحید اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی آئین یا احکام دینے کا مستحق و سزاوار ہے، لہٰذا اس کے سوا کوئی فرد یا جماعت اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اپنا حکم چلانے اور اپنا آئین نافذ کرنے کی مجاز نہیں۔ حکمران کا فریضہ صرف احکامِ الٰہیہ کو نافذ کرنا، خود بھی ان پر عمل کرنا اور رعایا کو بھی ان پر عمل کرنے کا پابند بنانا ہے۔

(۲، ۳) ایمان بالرسالت والکتب: توحید کو "رسالت" مستلزم اور اس کی مُصدِّق ہے۔ اپنے بندوں کو رشد و ہدایت دینے، ان کا تزکیہ کرنے، ان کو علم و حکمت سکھانے، ان کو سرطانی اداروں اور معاشرتی سرطانوں کی محکومی و غلامی سے نجات دلانے، ان کے دلوں میں اپنی محبت کی شمعِ خاموش کو فروزاں کرنے، اپنی کتابوں کا تلامیذ بنانے، الغرض ان کو صالح، شہید، صدیق بنانے کی خاطر ربِ ذوالجلال والاکرام نے ہر زمان و مکان میں اپنے نبیؑ اور رسولؑ مبعوث فرمائے، لہٰذا بندوں پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان لائیں اور ان کے احکام و تعلیمات کے مطابق زندگی کریں۔ ایمان بالرسالت، اللہ تعالیٰ کا حق اور انسان

کا فریضہ ہے۔

(۴) ایمان بالملائکہ : اللہ تعالیٰ کا نبیؑ یا رسولؑ اس کے اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، اسی طرح ملائکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے انبیاء و رسل علیہم السلام کے درمیان وسائط ہوتے ہیں، اور انہیں کلامِ الٰہی وحی کرتے ہیں؛ لہٰذا توحید و رسالت مقتضی ہیں کہ ان پر ایمان لایا جائے۔

(۵) ایمان بالآخرت : آخرت کا عقیدہ دین کی اساس ہے اور ہماری زندگی میں غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ انسان ربِّ کریم کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا شہکار ہے اور اس نے اسے عبث پیدا نہیں کیا۔ یہ کائنات، جو جمال و جلال کا طلسم کدہ، ان گنت نعمتوں کا مخزن اور انسان کے معروضِ حسن وعشق کے حسن و نور اور رنگ و بو کی جنتِ ارضی ہے، ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے اس احسن و اکمل تخلیقی شہکار کے لیے پیدا کی ہے۔ اس نے اسے خلیفۂ ارضی بنانا تھا لہٰذا اُسے خلافت کی بھاری ذمّے داریوں سے عہدہ برآ کرنے کی خاطر حِسّی، قلبی، نفسی نظام عطا کیا اور اس کے تزکیہ، تعلیم و تربیت اور حکمت و ہنر سکھانے کی غرض سے نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ شروع کیا، جسے انسان کی ذہنی بلوغت اور اس کے باطنی نور کے اِتمام اور دین کی تکمیل ہو جانے کے بعد رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین کی بعثت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا۔

انسان کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی خواہش کے ساتھ ربِّ رحمٰن نے اُسے ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی اس شرط پر ودیعت کی ہے کہ وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہوگا؛ اور اسے قیامت کے دن اپنے اعمال کا حساب دینا اور ان کے حسن و قبح کی کیفیت و کمیت کے مطابق جنّت یا جہنّم میں جانا ہوگا۔ جنّت، اگر قرآنِ مجید کی اصطلاح میں "قُرّۃُ العین" یا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو اس کا زوج جہنّم ہے، جس کا عذاب ناقابلِ برداشت و شکیب رُبا ہے۔ اس کے عذاب النّار کی شدّت کا یہ عالم ہے کہ وہاں

اہلِ نار زندوں میں ہوں گے نہ مُردوں میں (الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳)۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دار الآخرت الحیوان ہے (العنکبوت ۲۹ : ۶۴)؛ یعنی جنّت و دوزخ دونوں میں موت نہیں ہوگی لہٰذا وہاں ہمیشہ زندہ رہنا ہوگا۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اُخروی زندگی کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی کو رقصِ شرر کہتے ہیں۔

انسان حقیقت میں وہ ہے جو دُنیوی حسنہ کے ساتھ اُخروی حسنہ کی بھی آرزو رکھتا ہے بلکہ اس کی فکر و نظر اور ایمان و عمل کا محور بہشت ہوتا ہے، جو اس کے اِلٰہ و ربّ کی جائے لقا ہے اور جہاں اُسے اس کی ہم نظری و ہمکلامی اور قرب و رضوان کی رحیقِ مختوم بھی ملے گی اور شرابِ طہور بھی، شرابِ کافور بھی ملے گی اور شرابِ زنجبیل بھی۔ اس کے علاوہ اُسے ہر وہ نعمت ملے گی جس کی بھی وہ خواہش کرے گا۔

صلوٰۃ اپنے نمازیوں میں آخرت کا عقیدہ زندہ و مستحکم کرتی ہے اور انہیں دوراندیش و عاقبت اندیش بناتی ہے۔ انسان کی نفسیات پر تفکّر بالحق کرنے سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ وہ اپنی عاقبت نااندیشی ہی کی وجہ سے جرُم و گناہ اور ظلم و عدوان، شرک و کفر اور اکابر پرستی و بُت پرستی کرتا ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حقوق اللہ کو ادا کرنا خود انسان کے بہترین مفاد میں ہے، دُنیا اور آخرت ہر لحاظ سے۔ وجہ یہ ہے کہ ان حقوق کی ادائی سے اسے دُنیوی و اُخروی حسنہ اور جالیاتی ثروت ملتی ہے؛ اور اس کا مادّی و جالیاتی ارتقا ہوتا ہے، نیز وہ خوف و حزن کی آتشِ قلب کی اذیتوں سے محفوظ و مصؤن رہتا ہے۔ علاوہ ازیں، جو اہلِ ایمان حقوق اللہ کا پاس و احترام کرتے اور ان کو ادا کرتے ہیں، ان کے دلوں میں حقوق العباد کا بھی پاس و احترام ہوتا ہے اور انھیں حتّی المقدور ادا کرنے کی سعی و جہد کرتے رہتے ہیں۔

متذکرۂ بالا حقوق اللہ نظری نوعیّت کے تھے، اب عملی نوعیّت کے حقوق کی نشاندہی کر دی جاتی ہے، اور وہ یہ ہیں: صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظاموں کو

قائم کرنا اور انہیں قرآنِ حکیم کے احکام اور نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق احسن طریق سے چلانا (الحج ۲۲: ۴۱)۔ ان نظاموں سے بالتفصیل بحث گزر چکی ہے، لہٰذا نشاندہی پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے:

(۲) حقوق العباد کی فہرست بہت طولانی ہے اور یہ موقع ایجاز و اختصار کا ہے، لہٰذا ان کی طرف مختصر اشارے کیے جاتے ہیں:

(۱) کفالتِ اجتماعیہ کا نظام:

کُل افرادِ نسلِ انسانی کا خالق و رازق اور پروردگار و مالک (= ربّ) تنہا اللہ تعالیٰ ہے جو وحدہٗ لاشریک، رحمٰن و رحیم، سُبحان و صمد، غنی و وہّاب اور ودود و کریم ہے، اور اس کے جُملہ عیال اس کے پرورده و محتاج ہیں، لہٰذا ربّ العالمین نے اس کائنات میں جو نعمتیں پیدا کی ہیں، وہ اس کی کُل مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان کے لیے ہیں، اور ان میں سب کا حصّہ یا حق ہے۔ اس حق کو باحسن وجوہ دینے کا انتظام کرنا، حکومت و معاشرے کی مشترکہ ذمّہ داری ہے۔ اِس انتظام کرنے والے ادارہ کو کفالتِ اجتماعیہ کے نظام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا بنیادی وظیفہ لوگوں کے نان نفقہ، گھر بار، کپڑے لتّے، آب رسانی و نکاسیِ آب، صحت و صفائی، تعلیم و تربیت، علاج معالجے، کھیل کود، نیز روزگار کا معقول انتظام کرنا ہے۔

(۲) عدل و احسان:

عدل سب کو مفت اور بلاتاخیر ملنا چاہیے؛ نیز ماں باپ، اعزّہ و اقارب، قریب و دُور کے ہمسایوں، نیز محنت کشوں، ملازموں، مسافروں اور اہلِ احتیاج وغیرہ وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا فرض ہے۔

(۳) احترامِ انسانی:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرّم بنایا ہے (الاسرا ۱۷: ۷۰)، لہٰذا ہر انسان کو، چاہے وہ مالدار ہو یا غریب، محنت کش ہو یا اعلیٰ منصب پر فائز ہو، خادم ہو یا حکمران، مکرّم سمجھنا اور

اس کی تکریم کرنا لازم ہے۔

(۴) ہر شخص کی عزتِ نفس، نام و ناموس، جان و مال، آزادی کا احترام و پاس اور تحفظ کرنا فرد و معاشرے اور حکومت کی مشترکہ ذمّے داری ہے۔

(۵) اِیتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے فرمانِ الٰہی پر عمل کرنا؛ اور اکتناز و احتکار اور بخل و استحصال، جلبِ منفعت، گراں فروشی اور اقتصادی بد دیانتی، نوسر بازی، بدعہدی، چوری، سرقہ بالجبر، اِغوا بالجبر، جنسی کاروبار، فحشاء و منکر وغیرہ وغیرہ سے پرہیز و اجتناب کرنا۔

(۶) فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری کرنے سے باز رہنا۔

(۷) معاشرے میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم کرنا۔

نظامِ صلوٰۃ کا بنیادی مقصد ہی اہلِ ایمان کا تزکیہء قلب کر کے ان میں ان کے اِلٰہ و ربّ کی محبت کی شمع فروزاں کرنا ہے؛ اور ان کو صالح و شہید اور صدیق بنانا ہے تاکہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو احسن طریقے سے ادا کر سکیں، اور اس کے نتیجے میں اپنے رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اِتّباع میں افرادِ نسلِ انسانی کے لیے رحمت بن جائیں۔ ہمیں اس اصلِ عظیم کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اہلِ آرزو بندے ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس عظیم کارنامے کو سرانجام دینے کے لیے اہلِ ایمان کے لیے نظامِ صلوٰۃ اور اس کے دیگر ذیلی اور لاینفک ادارے یعنی زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم کرنا ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حقوق کو ادا کرنا صلوٰۃ کا بنیادی تقاضا ہے اور اسے پورا کیے بغیر مسلمان سچے نمازی نہیں بن سکتے، کیونکہ ان کی صلوٰۃ مؤثر نہیں ہو سکتی۔

ممانعتِ تساہل و ریاکاری

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۶)؛ اور عبادت کی اکمل و احسن شکل صلوٰۃ ہے۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اہلِ حُسن و سُرور اور اہلِ آرزو کے سوا اکثر مسلمان صلوٰۃ کو بارِ گراں اور بیگار سمجھتے ہیں؛ اس لیے اگر وہ صلوٰۃ ادا بھی کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ اور تساہل و کسلمندی کے ساتھ یا پھر دکھاوے کے لیے۔ قرآنِ مجید اس طرح صلوٰۃ ادا کرنے کو نفاق کہتا اور اس کی ممانعت کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ قُرّۃُ العین اور نعمتِ عُظمیٰ ہے۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ یہ تقربِ الٰہی کا وسیلہ اور کلیدِ جنّت ہے۔ اس سے تزکیہ ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی تحسین و تنویر ہوتی ہے؛ اس کی خفیہ قوّتیں بیدار و فعّال بنتی ہیں؛ قلب میں محبّتِ الٰہی کی شمع روشن ہو جاتی ہے، جس کی تب و تاب سے نُور کا اتمام ہوتا ہے اور انسان جمالیاتی ارتقا کرتا ہے، جس کا مطلب ترفعِ درجات ہے۔ علاوہ بریں، صلوٰۃ ذکرِ الٰہی ہے اور ذکرِ الٰہی ہی سے انسان کو طمانیّت ملتی ہے، جو بہارِ جنّت بھی ہے اور سیر فی جنّت بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ مُطمئنّہ ہی وارثِ جنّت ہے۔

صلوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے سچّے اور پکّے نمازی کو نفسِ مطمئنّہ بناتی ہے، جس کے لیے میں نے صاحبِ حُسن و سُرور کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ایسی نعمتِ عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے تو اہلِ ایمان کو ذوق و شوق سے لپک کر اس کی طرف جانا چاہیے۔ اس پر تو جان و دل، مال و دولت اور آل و اولاد اور کاروبار وغیرہ سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔ صلوٰۃ کے قیام کا وقت آئے تو سب سے صرفِ نظر کرکے جنّت کے اس وسیلے کی طرف دوڑ کر آنا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (المنٰفقون ۶۳ : ۹) : اے مسلمانو! نہ تو تمھارے مال اور نہ تمھاری اولادیں ہی تمھیں اللہ کے ذکر (= صلوٰۃ) سے غافل کردیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے (یعنی صلوٰۃ قائم نہیں کریں گے) وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

دُنیوی و اُخروی حسنہ حاصل کرنے، جنّت میں جانے کے لیے اور عذاب النار اور مستقل خسارے سے محفوظ رہنے کے لیے اگر انسان ذکرِ الٰہی کے بہترین وسیلے یعنی صلوٰۃ کو ذوق و شوق سے قائم نہ کرے تو اس سے زیادہ ظالم و جاہل اور زیاں کار و غافل اور کون ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں، وہ لوگ بھی اس زمرے میں آتے ہیں، جو صلوٰۃ کو ادا تو کرتے ہیں، مگر تساہل و ریاکاری سے۔ ایسے نام نہاد نمازیوں سے متعلق ربّ العزّت کا فتویٰ ہے کہ وہ منافق ہیں: چنانچہ وہ فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ○ (النسآء ۴ : ۱۴۲-۱۴۳) : منافق اللہ سے دھوکا کر رہے ہیں، حالانکہ اللہ ہی نے انھیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ (ان کا حال یہ ہے) جب وہ صلوٰۃ کے لیے اُٹھتے ہیں تو تساہل و کسلمندی کے ساتھ محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں، اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے۔ جسے اللہ (کا قانونِ مجازات) گمراہ کردے، اس کے لیے تم کوئی (ہدایت کا) راستہ نہیں پا سکتے۔

صلوٰۃ میں بیدلی، تساہل اور ریاکاری منافقت کی علامتیں ہیں اور منافقت دلیلِ ضلالت ہے، اور ضلالت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے دوری و مہجوری، جنّت سے محرومی اور جہنّم کا عذابِ جاودان۔ سورۂ توبہ میں تساہل و کسلمندی سے صلوٰۃ ادا کرنے والوں کو "فاسق" کہا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فسق و نفاق ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں ؛ چنانچہ فاسقوں سے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ

لَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ه (التوبۃ ۹ : ۵۴) : وہ صلوٰۃ کے لیے آتے ہیں تو بددلی و کسلمندی کے ساتھ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت و بربادی ہے جو اپنی صلوٰۃ اور اس کے تقاضوں سے غافل و لاپروا ہیں اور ریاکار بھی ہیں :

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ه الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ه الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ه (الماعون ۱۰۷ : ۴تا۷) : ہلاکت و بربادی ہے ان نمازیوں کیلیے جو اپنی صلوٰۃ اور اس کے تقاضوں سے غافل ہیں ؛ جو ریاکاری کرتے ہیں ۔ اور وسائلِ پیداواری یا اشیائے ضروریات کا استعمال کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ صلوٰۃ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ ہے اور اس نے ہمیں اس لیے عطا کی ہے تاکہ ہم اس کے دُنیوی و اُخروی اور طبّی و جمالیاتی فوائد ؛ نیز اپنے معروضِ حُسن و عشق ، معبود و مقصود ، اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کے قُرب و حضوری اور دید و رضوان کی جمالیاتی قدروں حاصل کریں ؛ لہٰذا ہمیں ذوق و شوق ، رضا و رغبت اور مستعدی و خلوص کے ساتھ صلوٰۃ قائم کرنی چاہیے ۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بددلی ، کسلمندی سے اور دکھاوے کے لیے صلوٰۃ قائم کرنا نفاق و فسق ہے اور ایسی صلوٰۃ موجبِ فلاح و کامیابی ہونے کے بجائے باعثِ ہلاکت و بربادی بن جاتی ہے ۔

امامت

صلوٰۃ بلاشبہ انفرادی۔ اجتماعی حُسنِ عبادت ہے، لیکن اس کا نظام اجتماعی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام ایک منظّم ضابطۂ حیات اور تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی ہے، اور اپنے پیروکاروں کو زندگی کے ہر شعبے میں نظم و ضبط کے ساتھ حیاتِ طیّبہ بسر کرتے دیکھنے کا آرزومند ہے۔ مسجد کا مثالی نمونہ مسجدِ نبویؐ ہے، جو پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدہؓ کے عہد میں تھی۔ اس دورِ زرّیں میں مسجد مسلمانوں کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ مثلاً عبادت گاہ، اقامتی درسگاہ، عسکری تربیت گاہ، مرکزِ مناکحت، عدلیہ، انتظامیہ، سفارتی اور معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اس اعتبار سے مسجد مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں نظم و ضبط، اتحاد و اتّفاق قائم اور ان کے فکر و عمل کی جہت کو صالح رکھنے میں ازبس کردار ادا کرتی تھی۔ لہٰذا اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ تھی، جواب سمجھی جاتی ہے۔

اس عہد میں قرآنِ مجید کی رُو سے اسلامی حکومت اپنے معاشرے میں اسلام کے چار اساسی نظام ــ صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام ــ قائم کرتی تھی، اور یہی اسلامی معاشرے کی شناخت اور اس کی امتیازی خصوصیت تھی۔ جہاں تک نظامِ صلوٰۃ کا تعلق ہے، اپنے تینوں ذیلی نظاموں کی طرح اسلامی حکومت کے زیرِ انتظام ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر شہر اور بستی کی جامع مسجد میں والی یا سب سے بڑا سرکاری عہدے دار امامت کے فرائض ادا کرتا تھا۔ دوسری مساجد میں جہاں کوئی سرکاری پیشِ امام نہیں ہوتا تھا، اہلِ محلّہ خود منتخب کر لیتے تھے۔

یہاں اس امر کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہؓ کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت تھی نہ اس کا تصوّر ہی تھا۔ مذہبی پیشوائیت اور فرقہ بندی کا ظہور اس وقت ہوا جب ملوکیت کا دور آیا۔ ملوکیت آئی تو اس نے اپنی بقا و معاونت اور مطلق العنان حکومت

کرنے کی خاطر ہامانی، قارونی اور آزری اداروں کو قائم کیا۔ مذہبی پیشوائیت معرضِ ظہور میں آئی تو اسلام میں فرقہ بندی اور تشتّت وافتراق کا آغاز ہوگیا۔ یہ سب کچھ ملوکیت کے ایما پر ہوا، اس لیے کہ ملوکیت کا سیاسی اصل الاصول یہ ہے کہ "رعایا کو فرقوں میں تقسیم کرو، لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ انگریزی زبان کا یہ مقولہ مشہور ہے: DIVIDE AND RULE۔ یہ فرعونی سیاست کا اصل الاصول ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ میں تشتّت وافتراق کی صورتِ حال بے حد تشویش ناک وعبرتناک ہے اور ستر سے زائد فرقوں میں منقسم ہے اور ہر فرقہ صرف اپنے آپ کو ہی راہِ راست پر اور ناجی سمجھتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مُسلم اقوام میں اخوّت ومحبّت، ہم آہنگی ویگانگت، صُلح وآشتی اور اتّفاق واتّحاد کا قریب قریب فُقدان ہے؛ اور ہر فرقہ اپنے نظریات ومعتقدات کی اساس پر مساجد کی تعمیر کرتا اور اپنے فرقے کا پیش امام رکھتا ہے؛ حالانکہ قرآنِ مجید کی رُو سے مسجد کی اساس تقوٰی پر ہونی چاہیے (التوبۃ ۹: ۱۰۹)۔

قُرآنِ عظیم، احادیثِ طیبہ اور آثار میں تقریباً نصف صدی کے تفکّر بالحق کے بعد تلمیذ القرآن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ

(۱) اسلام میں فرقہ بندی شرک ہے اور یہ مذہبی پیشوائیت کا نتیجہ ہے اور مذہبی پیشوائیت کا ادارہ فرعونی طرزِ حکومت کا پیدا کردہ ہے۔

(۲) مسجد کی بنیاد فرقہ بندی کے بجائے تقوٰی پر اُستوار ہونی چاہیے؛ اور اس میں فقط ذکرِ الٰہی ہونا چاہیے، غیر اللہ کے قصیدے وغیرہ پڑھنا ناجائز ہے۔

(۳) مسجد میں جو اقامتی مدرسہ ہو، اس کا نظامِ تعلیم وتربیت قُرآنِ حکیم کے نصاب کے مطابق ہونا چاہیے اور

(۴) امام قُرآنِ حکیم کا سچّا تلمیذ ہو اور اس نے نصابِ قُرآن کے مطابق تعلیم پائی ہو۔

(۵) متّقی یعنی اہلِ آرزو ہو؛ نیز نفسِ مطمئنّہ یا صاحبِ حُسن وسرور ہو۔

(۶) خوش الحان قاری ہو۔

(۷) صاحبِ جمال و جلال، خوش خلق، صاحبدل، عادل و محسن، حلال خور اور انسان بہمیت مخلوقات کے لیے باعثِ رحمت ہو۔

(۸) ثقافتی و معاشرتی امور کو سمجھنے اور انتظام کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(۹) اجتہاد کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(۱۰) مُطہّر یعنی پاکباز اور صفائی پسند ہو۔

(۱۱) رحمۃ للعالمین و حاملِ خُلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں سادہ و طیب زندگی بسر کرنے والا ہو۔

(۱۲) معلم و خطیب ہو۔

(۱۳) تدبر فی القرآن اور تفکر فی الانفس و آفاق کرنا اس کا شعارِ زندگی ہو۔

(۱۴) صادق و امین ہو۔

(۱۵) اس کا اِلٰہ (= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا مرکزِ حسن و عشق) اور رب (= رازق و پروردگار، کارساز و مشکل کشا، حاجت روا و مددگار، حافظ و ناصر اور آقا و مولیٰ) صرف ایک اور تنہا اللہ وحدہٗ لاشریک ہو۔ بالفاظِ دیگر، سچا موحد ہو اور مشرک و منافق اور فاسق و فاجر نہ ہو۔

(۱۶) صلوٰۃ کو بیگار نہ سمجھتا ہو، بلکہ قُرۃُ العین، وجہِ طمانیتِ قلب و جاں، وسیلۂ قربِ الٰہی اور کلیدِ جنت سمجھتا ہو۔

اسلام میں مذہبی پیشوائیت و فرقہ بندی شرک ایسا ناقابلِ معافی گناہ ہے، اور یہ فرعونی ملوکیت کی تخلیق ہے، لہٰذا اس کا استیصال ناگزیر ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلم دنیا میں حسنِ انقلاب کے ذریعے اسلامی حکومت قائم اور اسلامی معاشرے کی قرآنِ حکیم اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق تعمیرِ نو کی جائے۔ قرآنِ مجید کے نصابِ تعلیم و تربیت کے مطابق نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو کی جائے اور تعلیم ہر مسلم مرد اور عورت کیلیے لازمی قرار دی جائے اور ناخواندگی کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس قرار دیا جائے۔

مفت تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا اسلامی حکومت کی بنیادی ذمے داری ہے اس کے نتیجے میں ہر مسلمان تمیذ القرآن اور امامت کرنے کے قابل ہو گا۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور ۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی

شہرۂ آفاق تصانیف

بر اعظم و آخر

امی ثقافت

ب زندگی

سفۂ توحید

سفۂ صلوٰۃ

رُوداد سفرِ حجاز

حُسنِ انقلاب

طرب و کرب

فلسفۂ رسالت

فلسفۂ زکوٰۃ

آرزوئے حُسن

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

969 0 00701 7

Rs. 75.00